غبارِ خاطر

از

ابوالکلام آزاد

مرتبہ

مالک رام

ساہتیہ اکادیمی

Ghubar-i Khatir (letters in Urdu) by Maulana Abul Kalam Azad, edited, with notes and introduction, by Malik Ram. This is the second book of the series published by the Sahitya Akademi as part of a commemorative edition of Maulana Abul Kalam Azad's collected works in Urdu. (Sahitya Akademi, New Delhi.)

First edition 1967
Second edition 1983
Third edition 1991

SAHITYA AKADEMI
REVISED PRICE Rs. 85-00

غبارِ خاطر۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے ان خطوط اور تحریروں کا مجموعہ جو انھوں نے قلعۂ احمد نگر میں قید کے زمانے میں قلمبند کیں۔ یہ چوتھا ایڈیشن ہے اور مولانا آزاد کی جملہ اردو تصانیف کا دوسرا حصّہ، جسے ساہتیہ اکادیمی بیادگارِ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم شائع کر رہی ہے (ساہتیہ اکادیمی، نئی دلّی)

ساہتیہ اکادیمی

پہلی بار: ۱۹۶۷ء
دوسری بار: ۱۹۸۳ء
تیسری بار: ۱۹۹۱ء

روپے

SAHITYA AKADEMI
REVISED PRICE Rs. 85-00

طبع۔ کمار آفسٹ پرنٹرس۔ دہلی ۱۱۰۰۳۱

مقدمہ

طبع جدید

غبارِ خاطر کے میرے اس مرتبہ نسخے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا : یہ
جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اسے جوں کا توں دو مرتبہ چھاپا گیا۔ بعض ذاتی مجبوریوں
کے باعث مجھے موقع نہ ملا کہ اس کے حواشی پر نظرِ ثانی کرتا، حال آں کہ اس کی ا
ضرورت تھی، اور مزید معلومات مہیا بھی ہو گئی تھیں۔ بعض حواشی میں تبدیل شدہ
حالات کے تحت ترمیم یا اضافہ کرنا تھا۔ بہر حال چند مہینے اُدھر مجھے معلوم ہوا کہ
کتاب پھر سے شائع ہونے والی ہے، تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب کے اسے آخری
شکل دے دی جائے۔

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ مرتب کیا ہے، تو متعدد اشعار کی تخریج نہیں ہو سکی
تھی۔ اس دوران میں یہ کام بھی ہوتا رہا۔ اس میں مجھے سب سے زیادہ تعاون محبِ مکرم
نواب رحمت اللہ خان شیروانی، علی گڑھ کا حاصل رہا۔ بفضلہٖ تعالیٰ وہ ادب کا بہت
اچھا ذوق رکھتے ہیں، اور ان کے پاس بہت قیمتی اور وسیع کتاب خانہ ہے؛ وہ مولانا
آزاد مرحوم کے مکتوب الیہ نواب صدر یار جنگ مرحوم کے قریبی عزیز بھی ہوتے
ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے اشعار کی تخریج
کا کام اپنے ذمے لیا۔ یوں گویا وہ اس کام میں میرے شریکِ غالب ہو گئے ہیں۔ —

دنیا میں کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔ اب بھی کئی جگہ پر کمی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن موجودہ حالات میں اپنے میں اس سے زیادہ کی ہمت نہیں پاتا۔ البتہ ایک بات کا اطمینان ہے کہ جتنا کام ہو گیا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں۔ جو جتنے کے لائق ہوتا ہے، وہ اس کے مطابق اس سے کام لے لیتا ہے فالحمد للہ

نئی دلّی
یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء

مالک رام

مقدمہ

اس ملک پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف ہماری پچاس سالہ جدوجہد کا نقطۂ عروج وہ تھا، جسے 'ہندستان چھوڑ دو' تحریک کہا گیا ہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جہاں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریز اس ملک کے نظم و نسق سے فوراً دست بردار ہو کر یہاں سے سدھاریں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ اسی لیے اس کے بعد جو تحریک شروع ہوئی اس کا نام 'ہندستان چھوڑ دو' تحریک پڑ گیا۔

اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ انگریز بھلا ایسی قرارداد اور ایسی تحریک سے کیونکر صرف نظر کر سکتا تھا! اخباروں میں اس طرح کی افواہیں پہلے سے چھپ رہی تھیں کہ کانگریس اس مفاد کی قرارداد منظور کرنے والی ہے۔ اس لیے حکومت نے حفظ ماتقدم کے طور پر سب انتظام کر رکھے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ ۸ اگست کی شب کو دیر تک یہ جلسہ ہوتا رہا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اسی رات کے آخری حصے میں یعنی ۹ اگست کو علی الصباح حکومت وقت نے تمام سرکردہ رہنماؤں کو سوتے میں بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا اور ملک کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ مولانا آزاد اور ان کے بعض دوسرے رفقا احمد نگر کے قلعے میں رکھے گئے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید و بند کوئی تین برس تک رہا۔

اولاً اپریل ۱۹۴۵ء میں وہ احمد نگر سے بانکوڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے، اور یہیں سے بالآخر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ اسی نظر بندی کے زمانے کا ثمرہ یہ کتاب "غبارِ خاطر" ہے۔
غبارِ خاطر مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو یہ خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا۔
عین ممکن ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال ان کے دل میں شہرہ آفاق فرانسیسی مصنف اور فلسفی چارلس لوئی مونٹسکیو کی مشہور کتاب "فارسی خطوط" (۱۷۲۱ء) سے آیا ہو۔ اس کتاب میں دو فرضی ایرانی سیاح ـــ اوزبک اور رجا ـــ فرانس پر عموماً اور پیرس کی تہذیب و تمدن پر خصوصاً بے لاگ اور طنزیہ تنقید کرتے ہیں، اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرتے اور عیسائیت پر آزادانہ اظہارِ خیال کرتے ہیں، جو اس عہد کی خصوصیت تھی۔ اس میں اور متعدد سیاسی اور مذہبی مسائل پر بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اس کتاب کا دوسری زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔
لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلمبند نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اس صورت میں، باہمی تعلق کے فقدان کے باعث بعد کو انھیں ایک شیرازے میں یکجا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ انھیں کسی شخصِ واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ ان کے حلقۂ احباب میں صرف ایک ہستی ایسی تھی جو علم کی مختلف اصناف میں یکساں طور پر دلچسپی لے سکتی تھی۔ یہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم کی ذات تھی۔ انھوں نے عالمِ خیال میں انھیں کو مخاطب تصوّر کر لیا، اور پھر جب کبھی، جو کچھ بھی، ان کے خیال میں آ گیا، اسے بے تکلف حوالۂ قلم کرتے گئے۔

انھیں مضامین یا خطوط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔
شروانی خاندان بہت مشہور ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم۔ ہندستان کے اسلامی عہد میں اس خاندان کے متعدد افراد بڑے صاحبِ اثر و نفوذ گزرے ہیں، یہاں تک کہ کئی مرتبہ حکومتِ وقت کے ردّ و بدل میں ان کی حیثیت بادشاہ گر کی ہوگئی۔ اُن کے اس عہد کے کارنامے ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔
لیکن ان کا یہ دور دورہ یہاں سلطنتِ مغلیہ کے قیام سے پہلے ہی تک رہا۔ چونکہ ہمایوں کے مقابلے میں شروانیوں نے شیر شاہ سُوری کا ساتھ دیا تھا، اس لیے جب ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے دوبارہ اس ملک پر اپنا تسلط جما لیا، تو اب قدرتی طور پر، شروانیوں کا ستارہ زوال میں آگیا۔ ان کی جمعیت شمالی ہند میں منتشر ہوگئی؛ ان میں سے بیشتر نے کمریں کھول دیں اور سپاہ گری کی جگہ کشاورزی کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ ان کے زیادہ تر افراد پنجاب کے اطراف اور علی گڑھ اور ایٹہ کے اضلاع میں بس گئے؛ یہاں انھوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں پیدا کرلیں۔
پہلے ان کے ہاتھ میں تلوار تھی تو اب ہل تھا؛ اس لیے مدتوں ان لوگوں نے قلم سے بہت کم سروکار رکھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے ہمت کی، تو دینی پہلو سے اتنی استعداد پیدا کرلی کہ روزمرہ کے مسائل میں شُدبُد ہوجائے۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ سیاسی انقلاب کی جو آندھی مغرب سے اٹھی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاسی استحکام و اقتدار حاصل ہوجانے کے بعد انگریزوں نے یہاں نئے طور طریقے، نئے انتظام، نئی زبان، نئی تعلیم جاری کردی۔ قدرتی طور پر اس کا بہت وسیع اثر ہوا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ آبادی کا کوئی طبقہ اس سے مستغنی رہ سکے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شروانیوں کا رجحان بھی پڑھنے لکھنے کی طرف ہوا، اور انگریزی عہد میں انھوں نے جدید تعلیم سے متمتع ہوکر ملکی معاملات میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش

کام کرنا شروع کیا۔ انگریزی استیلا و اقتدار کے خلاف ہماری جنگِ آزادی میں بھی اس خاندان کے بعض افراد کی خدمات بہت نمایاں اور قابلِ قدر رہی ہیں۔

اسی شروانی خاندان کے گل سر سبد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم تھے۔ وہ ۵ جنوری ۱۸۶۷ء (۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ) کو بھیکم پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان یہاں انیسویں صدی کے اوائل میں آکر آباد ہوا تھا، اور ان کے آبا و اجداد یہاں کے رئیس تھے۔ ان کے والد محمد تقی خان صاحب (ف ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ) نے اپنے بڑے بھائی عبدالشکور خان کی حینِ حیات خاندانی جاداد اور زمینداری کے نظم و نسق میں کوئی حصّہ نہیں لیا؛ بلکہ خود مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت بھی اپنے تایا صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کی علوم عربیہ و فارسیہ کی متعدد شاخوں میں تعلیم خاص اہتمام سے مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مکمّل ہوئی اس کے بعد انھوں نے انگریزی کی طرف توجہ کی، اور اس میں بھی بقدرِ ضرورت خاصی استعداد پیدا کر لی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، شروع ہی سے ان کی ذہانت و فطانت اتنی نمایاں تھی کہ ان کے والد نے موروثی صدر مقام بھیکم پور سے متصل ایک نئی گڑھی تعمیر کی، اس کے اندر دلکش باغات اور عالیشان مکان بنوائے، اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ عبدالشکور خان صاحب کا سفرِ حج سے واپس آتے ہوئے ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں جدہ میں انتقال ہو گیا۔ چونکہ چھوٹے بھائی محمد تقی خان صاحب اُن سے دو برس پہلے رحلت کر چکے تھے، اب ریاست کے انتظام کی ذمّہ داری مولانا حبیب الرحمٰن خان کے کندھوں پر آپڑی۔ اسے انھوں نے اپنی خداداد فراست اور دُور اندیشی سے ایسی عمدگی سے انجام دیا کہ نہ صرف پانچ لاکھ کی مقروض ریاست اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو گئی بلکہ اس میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی؛ اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ موقع و محل ہے، نہ اس کی ضرورت۔ لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف صاحبِ علم اور علم دوست ہی نہیں تھے بلکہ ان میں انتظامی

مقدمہ

قابلیت اور دنیوی سُوجھ بُوجھ بھی بلا کی تھی، دو چیزیں جو بہت کم کسی ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت جس نہج اور معیار پر ہوئی تھی، اس نے بہت جلد انھیں ملک کے علمی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔ اُن کا مزاج خالص علمی تھا۔ انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے زرِ کثیر خرچ کر کے حبیب گنج میں ایسا نادر اور قیمتی کتاب خانہ جمع کیا کہ اس کی شہرت ملک سے باہر پہنچی۔ ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے اصحابِ مجاز نے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کا صدر مقرر کر دیا۔ یہیں سے ان کی شہرت دکن پہنچی، جس پر آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خان بہادر نظامِ دکن نے انھیں اپنی ریاست کے اُمورِ مذہبی کا صدر الصدور بنا کر جون ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد بلوا لیا۔ دکن میں اُن کی علمی اور تعلیمی اور دینی خدمات ایسی وسیع اور گوناگوں ہیں کہ ان کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، حیدر آباد میں دار الترجمہ اگست ۱۹۱۷ء میں قائم ہوا تاکہ کتابوں وغیرہ کے ترجمے اور اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام کیا جا سکے؛ لیکن عثمانیہ یونیورسٹی اس سے دو سال بعد ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو قائم ہوئی۔ اپنی عمارت نہ ہونے کے باعث اس کی افتتاحی تقریب آغا منزل میں ہوئی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اس کے پہلے "شیخ" (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔ اسی سال اپنے عہدے کی مناسبت سے انھیں اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے 'صدر یار جنگ' خطاب عطا ہوا۔ حیدر آباد میں ان کا قیام اپریل ۱۹۳۰ء تک رہا۔

ملک جس سیاسی بحران اور کشمکش سے گزر رہا تھا، اس کے پیشِ نظر کسی شخص کا سیاسیات سے بالکل بے تعلق رہنا ناممکن تھا؛ تاہم نواب صدر یار جنگ نے اس میں کوئی عملی حصّہ نہیں لیا۔ حیدر آباد سے واپسی پر انھوں نے اپنی تمام توجہ ملک کے متعدد تعلیمی اور علمی

اداروں کے فروغ و ترقی پر مبذول کردی۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی قابلِ ذکر علمی انجمن ہوگی، جس سے ان کا تعلق نہ رہا ہو۔

مرحوم شاعر اور مصنّف بھی تھے۔ حسرتؔ تخلص تھا۔ اُردو میں منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ فارسی کلام آغا سنجر ایرانی کو دکھاتے تھے؛ کچھ مشورہ خواجہ عزیز لکھنوی اور مولانا شبلی سے بھی رہا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان مطبوعہ موجود ہیں ـــــ اُردو میں کاروانِ حسرت اور فارسی میں بوستانِ حسرت۔ اور بھی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں؛ سیرۃ الصدّیق، تذکرۂ بابر، حالاتِ حزیں، علمائے سلف، نابینا علماء ان میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ بھی "مقالاتِ شروانی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

ان کا بروز جمعہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء (۱۸ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ) کو علی گڑھ میں انتقال ہوا؛ علی گڑھ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر بھموری میں اپنے موروثی قبرستان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں؛ یہ جگہ حبیب گنج سے کوئی میل بھر دور ہوگی۔

نواب صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کے تعلقات ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا شبلی مرحوم واسطۃ العقد ثابت ہوئے، جن سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب یہ مولانا شبلی سے ملے ہیں، تو وہ ان کی وسعتِ مطالعہ، ذہن کی برّاقی اور حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ خود ان دنوں حیدرآباد میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی کہ یہاں آجاؤ اور الندوہ کی ترتیب و تدوین اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن مولانا آزاد کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہ کرسکے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا شبلی کی عمر اس وقت ۴۸ سال کی تھی اور مولانا آزاد کی ۱۷ کے لگ بھگ۔ اس وقت ملک کے علمی حلقوں میں شبلی عالم اور ادیب اور مصنّف کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے؛ اور الندوہ بھی یکسر علمی پرچہ تھا۔ ایسی صورت میں ان کا اس نوجوان کو

اپنا ہمکار بننے اور اس علمی رسالے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دینا، جہاں ایک طرف ان کی اپنی وسعتِ قلب اور علم دوستی، قدر شناسی اور خُرد نوازی کا بیّن ثبوت ہے، وہیں مولانا آزاد کے غیر معمولی علم و فضل اور صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا اعتراف ہے۔
اس کے تھوڑے دن بعد مولانا شبلی حیدر آباد سے مستعفی ہو کر اگست ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں دار العلوم ندوۃ العلماء کے معاملات کے گویا کرتا دھرتا بن گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے تجدیدِ دعوت کی۔ اب کی مولانا آزاد نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک سات مہینے الندوہ (لکھنؤ) کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے ملاقات اسی ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی میں ہوئی تھی۔ مولانا شبلی اور نواب صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد بھی لکھنؤ کے دورانِ قیام میں دار العلوم میں مولانا شبلی ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ اسی لیے میرا گمان ہے کہ جب نواب صاحب اس زمانے میں لکھنؤ گئے، تو مولانا شبلی کے مکان پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہو گی۔
جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان تعلقات میں خلوص اور پختگی اور ایک دوسرے کی مقام شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ انھی تعلقات کا ایک باب یہ کتاب ہے۔

(۲)

غبارِ خاطر کئی لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے:
مولانا مرحوم کے حالات، بالخصوص ابتدائی زمانے کے، اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے جتنے اس کتاب میں۔ ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، عادات، نفسیات، کردار، میال و عواطف، ان کے کردار کی تشکیل کے محرکات —— ان سب باتوں پر جتنی تفصیل سے انھوں نے ان خطوں میں لکھا ہے اور کہیں نہیں لکھا؛ اور ان کے سوانح نگار کے لیے اس سے بہتر اور موثق تر اور کوئی ماخذ نہیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اُسلوبِ تحریر ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، وہ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے تھے اور اسی زمانے میں ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تحریروں میں وہ پختگی نہیں تھی، ہو بھی نہیں سکتی تھی، جو مشق اور مرورِ زمانہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ زبان و بیان کے لحاظ سے اُن کے اسلوبِ نگارش کا نقطۂ عروج غبارِ خاطر ہے۔ اس کی نثر ایسی نپی تلی ہے، اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بَری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ اُن کی ابتدائی تحریروں میں ناہمواری تھی۔ مثلاً الہلال اور البلاغ کے دَور میں اُن کے ہاں عربی اور فارسی کے ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کی بھرمار ہے۔ بیشک، ان پرچوں کا خاص مقصد تھا اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ بلکہ بہت حد تک طبقۂ علما کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکینگے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہونگے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ بس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار، متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس غبارِ خاطر کو دیکھیے، تو یہاں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں عربی فارسی کی مشکل ترکیبیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دل نشین ہے کہ یہ نہ صرف ہر کسی کے لیے قریب الفہم ہے، بلکہ اس سے لطف لیا جا سکتا ہے۔ آپ کہینگے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں موضوع سہل ہے، بیشک، یہ توجیہ ایک حد تک درست ہے؛ لیکن بس ایک حد ہی تک۔ اسی مجموعے میں انھوں نے دو خطوں میں خدا کی ہستی سے تفصیلی گفتگو کی ہے (خط ۱۲ اور ۱۳) یہ موضوع آسان نہیں، بلکہ واقع یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اہم اور مشکل اور پیچیدہ موضوع یہی ہے۔ ابتدا سے دنیا بھر کے فلسفی اور عالم اور عاقل اس

سے متعلق لکھتے آئے ہیں؛ اور تمام مذاہب کی علّت غائی اور بنیاد ہی یہ مسئلہ ہے۔ اگر اسی مسئلے پر انھوں نے اس سے تیس برس پہلے لکھا ہوتا تو اس زمانے میں ان کی جو افتاد تھی، اُسے مدِّ نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز اور اُسلوب کیا ہوتا لیکن یہاں انھوں نے جس طرح سے اس سے متعلق بحث کی ہے اِس سے جہاں اُن کے طرزِ استدلال کی دل نشینی نمایاں ہے، وہیں اُسلوبِ تحریر کی دلکشی بھی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ایک ایک لفظ احتیاط سے کانٹے کی تول لکھا ہے — کہیں تکرار نہیں ہے، کہیں الجھاؤ نہیں ہے، نگاہ اور زبان کسی جگہ نہیں اٹکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے خط (نمبر ۱۷) میں 'انانیت' کا مسئلہ زیرِ بحث آگیا ہے۔ یہ موضوع بھی آسان نہیں، اور ذرا سی بے احتیاطی سے یہ نفسیات کی بھول بھلیوں اور علمی اصطلاحات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے؛ بحث کو عام سطح پر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھے اور لطف اندوز ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اِسی اب نہایت مشکل مسئلوں اور موضوعوں سے متعلق بھی وہ ایسے انداز میں گفتگو کر سکتے تھے کہ یہ نہ صرف علمی پہلو سے وقیع ہو، بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کا حامل ہو کہ ہماری تاریخِ ادب کا حصّہ بن سکے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں، مثلاً حکایت زاغ و بلبل (خط ۱۸) یا چڑا چڑے کی کہانی (خط 19، ۲۰)۔ بظاہر یہ ایسے عنوان ہیں، جن سے متعلق خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی جولانیِ قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۴۵ صفحے قلم بند کر دیے ہیں۔ ان کی دقتِ نگاہ، جزئیات کا احاطہ، غیر عادی اور غیر معمولی چیزوں سے دلچسپی اور ان کی تفصیلات کا علم — غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے، اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہلِ ممتنع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ یا مثلاً خط (۱۵) لیجیے، جس میں اپنے چائے کے شوق کا ذکر کیا

ہے۔ یہاں پھر ان کی باریک بینی اور مسئلے کے مالہٗ وماعلیہ کا تفصیلی ذکر نمایاں ہے۔
چائے کی پتی، اس کی کاشت کی تاریخ، اس کے دوسرے لوازمات —— ان سب باتوں
کا ذکر ایسے چٹخارے لے کر کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے، یہ چائے نہیں، بلکہ شرابِ طہور
یا آبِ کوثر و تسنیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ پینے کو چائے سب ہی پیتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا یہ
خط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آج تک چائے کبھی پی ہی نہیں، بلکہ کوئی نقلی
چیز ہمیں دے دی گئی تھی، جسے ہم لاعلمی میں اصلی سمجھتے رہے۔ یہ اُن کے حسنِ انشا
اور قوتِ بیان کا معجزہ ہے۔

پھر ان خطوں کا ایک اور مابہ الامتیاز ان کا ہلکا سا فکاہی رنگ ہے جو جا بجا الفاظ کا پردہ
چاک کر کے جھانکنے لگتا ہے۔ انھوں نے الہلال میں بھی بعض مقالے ایسے لکھے تھے،
جن میں مزاح کا رنگ چوکھا تھا۔ وہاں موضوع سیاسی تھا، یہاں موضوعِ سخن سیاسی
چھوڑ، ادبی بھی نہیں، لیکن اس میں بھی وہ گل افشانیاں کی ہیں کہ صفحۂ کاغذ کو کشتِ زعفران
بنا کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً احمد نگر کے قلعے میں باورچی رکھنے کا قصہ پڑھیے (خط ۸) یا ڈاکٹر
سید محمود کا گورنباؤں کی ضیافت کا سامان کرنا (خط ۱۸)، یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۲۰)
میں قلندر اور مُلّا کا حال —— ان سب مقامات پر بین السطور مزاح کی کارفرمائیوں
نے پوری تحریر کو اتنا شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے: وہ کہیں اور
سنا کرے کوئی۔

اسی سے ایک اور بات کا خیال کیجیے۔ یہ ان کی مختلف جانوروں کی شکل و صورت
اور عادات و اطوار کی جزئیات کی تصویر کشی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے
حلقۂ احباب میں سے کم و بیش روز کے ملنے والوں سے متعلق بھی اتنی تفصیل سے جانتے اور
اپنی معلومات اور تاثرات کو قلم بند کر سکتے ہیں؟ یہ مولانا آزاد کا کمال ہے کہ انھوں نے ان
پرندوں کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔ موتی اور قلندر اور مُلّا جیتے جاگتے کردار

ہیں، اور ان کی شخصیت عام گوریاؤں اور چڑیوں کی بھیڑ سے کئی گنا نمایاں ہوگئی ہے۔
اور یہ بات صرف پرندوں سے متعلق ہی نہیں ہے، یہ تصویرکشی اور مواقع پر بھی ملتی ہے؛
مثلاً باغ میں پھول لگائے ہیں۔ ان زندانیوں نے دن رات کی محنت سے چمن تیار کیا؛
کچھ دن بعد اس میں رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھانے لگے۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا
روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیز ہے۔ وہ
ان پھولوں کی ابتدا اور نشوونما، ان کی خاصیتوں، ان کی شکل وصورت، حسن وجمال،
دلفریبی اور دلکشی وغیرہ سے متعلق ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ چشمِ تصوّر کے سامنے
ایک ہرا بھرا باغ لہلہانے لگتا ہے۔

اور پھر ان سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا،
کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علم موسیقی کا، وہ اسے پند وموعظت اور دائمی صداقتوں اور ابدی
اقدار سے الگ کرکے دیکھ نہیں سکتے؛ وہ اسے فوراً کسی کلیے کی شکل دے دیتے اور فطرت
کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب ان لوگوں کو بمبئی سے گرفتار کرکے
احمدنگر لے گئے ہیں تو یہ وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے قلعے تک موٹر کاروں میں گئے تھے۔
لکھتے ہیں: "اسٹیشن سے قلعے تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے، راہ میں کوئی موڑ نہیں۔ میں
سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے؛ جب قدم اٹھا دیا، تو پھر کوئی موڑ
نہیں۔" (ص ۲۷۔ ۲۸) اسی سفر کا بیان ہو رہا ہے۔ سڑک پر موٹر کار پوری تیزی کے
ساتھ مسافت طے کر رہی ہے۔ قلعہ جو پہلے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا۔ اب قریب نظر
آنے لگا۔ چشم زدن میں یہ چند قدم کا فاصلہ بھی پورا ہوگیا اور موٹر کاریں صدر پھاٹک
کے اندر داخل ہوگئیں۔ فرماتے ہیں: "غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود
زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔" (ص ۲۸) بالآخر
زندانیوں کا یہ قافلہ قلعے کے اندر داخل ہوگیا اور پھاٹک بند کر دیا گیا۔ یہ روزمرّہ کا معمولی

وقوعہ ہے، اور کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا۔ لیکن پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی ان کا ذہن کہیں اور پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگے: "اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں، تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں، تاکہ کھلیں۔"

(ص ۱۹)

جب پچھلی صدی کے شروع میں روسیوں نے بخارا پر حملہ کیا، تو امیر بخارا نے حکم دیا تھا کہ مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگاں کا وِرد کیا جائے۔ اُدھر روسیوں نے قلعہ شکن توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے اور آخر کار بخارا فتح ہو گیا لکھتے ہیں: "بالآخر وہی نتیجہ نکلا، جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انھیں کو فائدہ پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمّت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (ص ۱۴۹)

چڑیا کا بچہ جو ابھی ابھی گھونسلے سے نکلا ہے ہنوز اُڑنا نہیں جانتا اور ڈرتا ہے، ماں کی متواتر اُکساہٹ کے باوجود اسے اڑنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس میں خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دن اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اُڑتا اور فضائے ناپیدا کنار میں غائب ہو جاتا ہے پہلی ہچکچاہٹ اور بے بسی کے مقابلے میں اس کی یہ چستی اور آسمان پیمائی حیرتناک ہے۔ اسی طرح کا ایک منظر دیکھ کر لکھتے ہیں: "جونہی اس کی سوئی ہوئی خودشناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرند ہوں، اچانک قالبِ بیجان کی ہر چیز ازسرِ نو جاندار بن گئی۔" پھر اسی سے یہ حکیمانہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: "بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے۔" (ص ۲۳۲)

غرض پوری کتاب میں اس طرح کے جواہر ریزے منتشر پڑے ہیں، اور یہ اُن کی عام روش

ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر مفکّر ہیں جیسا کہ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے، جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، وہ انھوں نے ورثے میں پایا اور اس کے حصول اور محفوظ رکھنے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی، اور جدید کی تلاش اور جستجو کے لیے انھوں نے اپنی راہ خود بنائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات علوم قدیمہ و جدیدہ کا سنگم بن گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ان پر غور و فکر کے دروازے کھل جاتے اور وہ ان راہوں سے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے؛ اور یہی ہوا۔ یہ اقوال جو گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے اور انسانی تاریخ اور تجربے کا نچوڑ ہیں، اسی قران السعدین کا نتیجہ ہیں۔

(۳)

مولانا آزاد مکّہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی۔ جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا، وہاں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتّہ گھر میں والد سے گفتگو اردو میں ہوتی تھی اور جو ہندستانی استاد ان کے پڑھانے کو مقرر کیے گئے تھے، ان سے بھی۔ لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندستان آئے، تو اس وقت مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی، اردو کی بہت کم واقفیت تھی؛ مزید برآں "اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج، جو مکّہ میں عرب بولتے ہیں"، ان کی زبان پر بھی رائج تھے، جنھیں انھوں نے بتدریج کوشش کر کے دور کیا۔ چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں رہا، جو اردو کا علاقہ نہیں اور اردو مراکز سے بھی دور ہے، اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی، اس لیے اس دوران میں بھی اردو میں ترقی کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق اور مزاولت اور محنت سے انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل

ہوگئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے۔ مثلاً وہ سوچنا کی جگہ سونچنا (باضافۂ نون غنہ) لکھتے ہیں (بولتے بھی اسی طرح تھے)؛ تمام مشتقات میں بھی وہ اس نون کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً سونچنا (ص ۲۰، ۳۴، ۴۸، ۴۸، ۸۲، ۸۲، ۲۳۶)، سونچنے (۲۷، ۲۴۴، ۲۴۴)، سونچتا ہوں (ص ۲۴۵)، سونچا (ص ۱۰۶، ۱۶۵)؛ سونچیں (ص ۱۱۴)، سونچ (ص ۱۰۹، ۱۸۶)۔ اسی طرح ایک اور مصدر ڈھونڈنا ہے۔ اس کی قدیم شکل ایک ہائے ہوز کے اضافے کے ساتھ ڈھونڈھنا تھی۔ مرحوم اسی طرح لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ کو قدم قدم پر اس کی مثالیں ملینگی: ڈھونڈھنا (ص ۹۳، ۱۱۱، ۱۲۸)، ڈھونڈھنے (ص ۸۷)، ڈھونڈھا (ص ۸۳)، ڈھونڈھی (۹۸، ۲۶۶)، ڈھونڈھیں (ص ۶۹)، ڈھونڈھتے (۶۸، ۶۹، ۸۲، ۲۷۰)، ڈھونڈھتی (ص ۸۱)، ڈھونڈھوایا (ص ۸۷)، ڈھونڈھ (ص ۶۹، ۷۷، ۸۳، ۹۲، ۱۷۷، ۱۸۷)؛ یہ سب شکلیں ملتی ہیں۔ گھاس کو بھی پہلے گھانس بولتے اور لکھتے تھے۔ اب گھانس متروک ہے اور گھاس ہی فصیح ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک جگہ گھانس بھی آیا ہے (ص ۲۴۶)۔ بعض لفظوں کے دو دو املا بھی ملتے ہیں مثلاً پاؤں اور پانوٗں (ص ۸۲، ۹۶) اگرچہ میرا گمان ہے کہ انھوں نے پانوٗں ہی لکھا ہوگا، پاؤں کاتب کا تصرف ہے۔

ابتدا میں اعراب بالحروف کا رواج عام تھا؛ الفاظ میں پیش کی جگہ واؤ، زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یائے لکھتے تھے۔ یہ دراصل ترکی زبان کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۲ء تک، جب آتاترک نے ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا، یہ زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس میں اعراب کی جگہ حروف ہی استعمال ہوتے تھے۔ بتدریج یہ رواج کم ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ترک ہوگیا۔ مولانا نے ان خطوں میں کم از کم تین لفظوں میں پرانے رواج کا تتبع کیا ہے۔ انڈیل کی جگہ اونڈیل (۶۷، ۱۰۷)، اونڈیلی (ص ۱۰۶) اور پرانی کی جگہ پورانی (ص ۲۴۱)، اگرچہ ایک جگہ پرانی بھی لکھا ہے (ص ۳۰)؛ اور الجھن (ص ۲۵۳

زندہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف خود اس میں تخلیق و تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ طوعاً بھی دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنا خزانہ معمور کرتی رہتی ہے؛ اسے ضرورت کے مطابق غیر زبانوں سے الفاظ لینے میں عار نہیں ہوتی۔ اُردو تو اس معاملے میں ہے بھی معذور اور حق بجانب کیونکہ اس کا خمیر ہی متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے اٹھا تھا ہم نے بیرونی زبانوں میں فارسی اور فارسی ہی کے واسطے سے عربی اور ترکی اور سب سے آخر انگریزی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ انگریزی الفاظ اُس دور کی یادگار ہیں، جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مستقل ہو گیا۔ اِکّا دُکّا لفظ تو ہمیشہ آتا ہی رہتا ہے اور اسے آنا بھی چاہیے۔ لیکن چونکہ انگریزی کے ساتھ غیر ملکی اقتدار بھی وابستہ تھا، اس لیے غیر شعوری طور پر انگریزی لفظوں کے ساتھ کچھ ناپسندیدگی اور کراہت کا احساس ضرور رہا۔ اس کے باوجود ان لفظوں کا آنا ناگزیر تھا۔ یہ الفاظ دو حصّوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اول ان چیزوں کے نام جو انگریزوں کے ساتھ آئیں اور پہلے سے ہمارے ہاں موجود نہیں تھیں، یا ان نئے علوم کی اصطلاحات جو مغرب میں وجود میں آئے اور یہاں ان کی تعلیم انگریزی زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم علمی اصطلاحات کو جوں کا توں لینے پر کسی حد تک مجبور تھے لیکن یہ بات پہلی قسم سے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔ ان سے ملتی جلتی چیزیں ہمارے یہاں موجود تھیں؛ ان کا آسانی سے عام فہم ترجمہ کیا جا سکتا تھا ستم یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اندھا دھند انگریزی کے لفظ استعمال کرنا شروع کر دیے حالانکہ اس کی کسی عنوان ضرورت نہیں تھی؛ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا سر سیّد اور ان کے دوستوں سے ہوئی جو یا تو انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، یا بہت تھوڑی جانتے تھے۔ سر سیّد کی اپنی تحریروں میں انگریزی کے بہت لفظ ہیں؛ رہی سہی کمی ان کے مقلدین میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی اور شبلی نے پوری کر دی۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی کے ایسے لفظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں، جن کے لیے ان کے پاس

ہوگئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے مثلاً وہ سوچنا کی جگہ سونچنا (یا اضافۂ نون غنہ) لکھتے ہیں (بولتے بھی اسی طرح تھے)؛ تمام مشتقات میں بھی وہ اس نون کا اضافہ کرتے ہیں مثلاً سونچتا (ص ۲۰، ۳۴، ۴۸، ۸۲، ۸۲، ۲۳۲)، سونچنے (۲۷، ۲۴۴، ۲۴۴)، سونچتا ہوں (ص ۲۴۵)، سونچا (ص ۱۰۷، ۱۶۵)، سونچیں (ص ۱۴۱)، سونچ (ص ۱۰۹، ۱۸۶)۔ اسی طرح ایک اور مصدر ڈھونڈنا ہے۔ اس کی قدیم شکل ایک ہائے ہوز کے اضافے کے ساتھ ڈھونڈھنا تھی۔ مرحوم اسی طرح لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ کو قدم قدم پر اس کی مثالیں ملینگی: ڈھونڈھنا (ص ۹۳، ۱۱۱، ۱۲۸) ڈھونڈھنے (ص ۸۷) ڈھونڈھا (ص ۸۳) ڈھونڈھی (۹۸، ۲۶۶)، ڈھونڈھیں (ص ۶۹) ڈھونڈھتے (۶۸، ۶۹، ۸۲، ۲۷۰) ڈھونڈھتی (ص ۸۱)، ڈھونڈھوایا (ص ۸۷) ڈھونڈھ (ص ۶۹، ۷۷، ۸۳، ۹۲، ۱۷۷، ۱۸۷) یہ سب شکلیں ملتی ہیں۔ گھاس کو بھی پہلے گھانس بولتے اور لکھتے تھے۔ اب گھانس متروک ہے اور گھاس ہی فصیح ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک جگہ گھانس بھی آیا ہے (ص ۲۴۶)۔ بعض لفظوں کے دو دو املا بھی ملتے ہیں مثلاً پاؤں اور پانوں (ص ۸۲، ۹۶) اگرچہ میرا گمان ہے کہ انھوں نے پانوں ہی لکھا ہوگا، پاؤں کاتب کا تصرف ہے۔

ابتدا میں اعراب بالحروف کا رواج عام تھا؛ الفاظ میں پیش کی جگہ واو، زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یاے لکھتے تھے۔ یہ در اصل ترکی زبان کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۲ء تک جب اتاترک نے ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا، یہ زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس میں اعراب کی جگہ حروف ہی استعمال ہوتے تھے۔ بتدریج یہ رواج کم ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ترک ہوگیا۔ مولانا نے ان خطوں میں کم از کم تین لفظوں میں پرانے رواج کا تتبع کیا ہے۔ انڈیل کی جگہ اونڈیل (۶۷، ۱۰۷) اونڈیلی (ص ۱۰۶) اور پرانی کی جگہ پورانی (ص ۲۴۱)، اگرچہ ایک جگہ پرانی بھی لکھا ہے (ص ۳۰)؛ اور اولجھن (ص ۲۵۳)

زندہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف خود اس میں تخلیق و تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ طوعاً بھی دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنا خزانہ معمور کرتی رہتی ہے؛ اسے ضرورت کے مطابق غیر زبانوں سے الفاظ لینے میں عار نہیں ہوتی۔ اُردو تو اس معاملے میں ہے بھی معذور اور حق بجانب کیونکہ اس کا خمیر ہی متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے اٹھا تھا۔ ہم نے بیرونی زبانوں میں فارسی اور فارسی ہی کے واسطے سے عربی اور ترکی اور سب سے آخر انگریزی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ انگریزی الفاظ اُس دَور کی یادگار ہیں، جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مستقل ہو گیا۔ اِکّا دُکّا لفظ تو ہمیشہ آتا ہی رہتا ہے اور اسے آنا بھی چاہیے۔ لیکن چونکہ انگریزی کے ساتھ غیر ملکی اقتدار بھی وابستہ تھا، اس لیے غیر شعوری طور پر انگریزی لفظوں کے ساتھ کچھ ناپسندیدگی اور کراہت کا احساس ضرور رہا۔ اس کے باوجود ان لفظوں کا آنا ناگزیر تھا۔ یہ الفاظ دو حصّوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اول ان چیزوں کے نام جو انگریزوں کے ساتھ آئیں اور پہلے سے ہمارے ہاں موجود نہیں تھیں، یا ان نئے علوم کی اصطلاحات جو مغرب میں وجود میں آئے اور یہاں ان کی تعلیم انگریزی زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم علمی اصطلاحات کو جوں کا توں لینے پر کسی حد تک مجبور تھے لیکن یہ بات پہلی قسم سے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔ ان سے ملتی جلتی چیزیں ہمارے یہاں موجود تھیں؛ ان کا آسانی سے عام فہم ترجمہ کیا جا سکتا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اندھا دھند انگریزی کے لفظ استعمال کرنا شروع کر دیے حالانکہ اس کی کسی عنوان ضرورت نہیں تھی؛ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا سر سید اور ان کے دوستوں سے ہوئی جو یا تو انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، یا بہت تھوڑی جانتے تھے۔ سر سید کی اپنی تحریروں میں انگریزی کے بہت لفظ ہیں؛ رہی سہی کمی ان کے مقلدین میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی اور شبلی نے پوری کر دی۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی کے ایسے لفظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں، جن کے لیے ان کے پاس

کوئی عذر نہیں تھا۔ مولانا آزاد نے ان خطوط میں انگریزی کے بہت لفظ لکھے ہیں۔ ان میں بہت سے پہلی قسم میں شامل ہیں مثلاً موٹر کار (۱۰)، اسٹیشن (۱۳)، ٹرین (۱۲)، ٹائم پیس (۱۳)، سگرٹ کیس (۱۶، ۱۷)، وارنٹ (۱۶)، سول سرجن (۵۲) وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ اب عام طور پر اُردو میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور انھیں زبان سے خارج کر کے ہم کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں دینگے لیکن بعض جگہ ان کے قلم سے کچھ ایسے لفظ بھی نکل گئے ہیں، جن کے مرادف ہمارے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً پریس (۹)، آفس (۵۹)، پریسیڈنٹ (۲۱)، میس (۸۷، ۱۹۵)، ہیٹر (۱۷۲)، ٹیبل (۱۳، ۱۶، ۱۷، ۲۴) وغیرہ ہیں۔ ان کا مفہوم آسانی سے ہم اپنے موجودہ ذخیرۂ الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں، اور ہمیں قطعی ضرورت نہیں کہ ہم خواہی نخواہی ان سے اپنی تحریروں کو بوجھل بنائیں۔

زبان کی طرح مصنف کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہتا ہے، اور بعض حالتوں میں تو یہ اس کے کردار کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مولانا کی تعلیم خالص مشرقی انداز پر ہوئی۔ قدرتی طور پر مدتوں ان کا مطالعہ بھی زیادہ تر دینی علوم کا یا عربی فارسی کا رہا۔ لیکن جب انھوں نے انگریزی میں کافی مہارت پیدا کرلی، تو اس کے بعد انھوں نے مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انگریزی کتابیں بھی کثرت سے پڑھیں۔ اس کا اثر ان کی طرزِ تحریر پر پڑنا ہی چاہیے تھا۔ اب وہ غیر شعوری طور پر انگریزی روزمرّہ کا تتبع کرتے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ وہ انگریزی میں سوچ رہے اور اس کے محاوروں، جملوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ غبارِ خاطر میں بھی اس کی مثالیں کچھ کم نہیں۔ مثلاً صبح مسکرا رہی تھی (۲۲، ۶۹)؛ یہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے (۵۴)؛ مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں (۲۷)؛ آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی (۲۷)؛ یہ خیال بس کرتا ہے (۷۷)؛ میرے اختیار کی پسند نہیں تھی (۸۳)؛ حالات کی مخلوق (۹۳)؛ گردوپیش کے موثرات (۹۳) —— یہ سب جملے اور ترکیبیں اپنی ساخت میں بنیادی طور پر انگریزی کی ہیں۔ چونکہ قلعۂ احمد نگر کی نظر بندی کے ایام میں عام طور پر انگریزی کتابیں اُن کے مطالعے میں رہیں، وہی ترکیبیں ان کے ذہن میں بسی

ہوئی تھیں، اور جب وہ یہ خطوط لکھ رہے تھے، لامحالہ تحت الشعور سے ابھر کر انھوں نے اردو کا جامہ پہن لیا۔

(۴)

غبارِ خاطر پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی۔ اسے جناب محمد اجمل خان نے مرتب کیا تھا؛ اور اس کے شروع میں ان کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ چونکہ ایک زمانے کے بعد لوگوں نے مولانا آزاد کی کوئی تحریر دیکھی تھی، یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ تین مہینے بعد کتاب دوسری مرتبہ اسی سال اگست میں چھپی، اور یہ اشاعت بھی سال بھر میں ختم ہوگئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی تھے۔ بدقسمتی سے دونوں مرتبہ کتابت کا معیاری انتظام نہیں ہوسکا تھا اور اسی لیے مولانا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ تیسری مرتبہ اسے ان کے ایک دیرینہ مداح لالہ پنڈی داس[۵] نے ۱۹۴۷ء کے فروری میں لاہور سے شائع کیا۔ اس مرتبہ ان میں ایک خط بھی زائد تھا جو پہلی دونوں اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا؛ یہ

---

۵ لالہ پنڈی داس کا پنجاب کے پرانے انقلابیوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ لاہور کی اوّلین انقلابی انجمن 'بھارت ماتا سبھا' کے ممبر، بلکہ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ اس انجمن میں سردار اجیت سنگھ (بھگت سنگھ کے چچا)، صوفی انبا پرشاد (ایڈیٹر روزنامہ پیشوا)، ایشری پرشاد (نیم سوپ والے)، منشی منور خان ساغر اکبرآبادی، دینا ناتھ حافظ آبادی (ایڈیٹر اخبار ہندوستان)، لال چند فلک، مہتہ نند کشور وغیرہ ان کے شریکِ کار تھے۔ انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکلتا تھا۔ (پنڈی داس خود بھی ایک پرچہ "انڈیا" گوجرانوالہ سے نکالتے تھے)۔ اس سبھا کے جلسے باقاعدہ ہوتے، جن میں جوشیلے اراکین حکومت کے خلاف غم و غصّہ کا اظہار کرتے اور لوگوں کو اُبھارنے کے لیے نظم و نثر میں آگ اگلتے تھے۔ جب مئی ۱۹۰۷ء میں حکومت نے لالہ لاجپت رائے کو گرفتار کرکے مانڈلے (برما) میں نظربند کردیا، تو اسی زمانے میں پنڈی داس اور نند کشور کو بھی پانچ سال کے لیے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء کو دلّی میں انتقال ہوا۔

سب سے آخری خط موسیقی سے متعلق ہے۔ اب بازار میں اسی تیسری اشاعت کے چوری چھپے کے نقلی نسخے ملتے ہیں، اور یہ کتابت کی اغلاط سے پُر ہیں۔

مولانا آزاد مرحوم کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کے بعد ساہتیہ اکادیمی نے فیصلہ کیا کہ ان کی تمام تحریروں کو جمع کر کے جدید طریقے پر مرتب کیا جائے۔ کام کا آغاز ان کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن سے کیا گیا [اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ بقیہ دو جلدیں بھی غالباً اگلے سال ایک میں شائع ہو جائینگی۔]

غبارِ خاطر کی ترتیب میں مجھے سب سے زیادہ دقت مختلف کتابوں اور اشعار کے حوالوں کی تلاش میں ہوئی ہے۔ مرحوم لکھتے وقت اپنے حافظے سے بے تکلف کتابوں کی عبارتیں اور شعر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک معروف شعرا اور مطبوعہ دواوین کا تعلق ہے، ان سے رجوع کرنا چنداں دشوار نہیں تھا لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے شعر کسی تذکرے میں دیکھا تھا یا کہیں اور، میں نے حوالے دواوین سے دیے ہیں۔ آپ دیکھینگے کہ بہت جگہ لفظی تفاوت ہے۔ بعض اوقات وہ موقع کی ضرورت سے دانستہ بھی ردوبدل کر لیتے ہیں لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے جہاں اسے دیکھا تھا، وہاں یہ اسی طرح چھپا ہو۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اسے جوں کا توں محفوظ نہ رکھا ہو۔ اس صورت میں انھوں نے اس میں ایک آدھ لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھ دیا۔ چونکہ خود موزوں طبع تھے، شعر ساقط الوزن تو ہو نہیں سکتا تھا، البتہ اصل متن قائم نہ رہا۔

پوری کتاب میں کوئی سات سو شعر ہیں۔ پوری کوشش کے باوجود ان میں سے ستر اسی اشعار کی تخریج نہیں ہو سکی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے کئی احباب سے بھی مدد لی ہے اور میں ان سب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حتی الامکان اس سے دریغ نہیں کیا۔ دلّی میں اب کتابوں کا کال ہے اور یہاں کوئی اچھا کتب خانہ نہیں ہے۔ میں نے بہت جگہ سے کتابیں مستعار لیں اور اس کے لیے مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری اور ادارۂ علوم اسلامیہ

کے کتاب خانے سے بھی رجوع کرنا پڑا ۔ اس کے باوجود بعض حوالوں کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کتابیں مہیا نہ ہو سکیں۔ اگر کتاب کے پھر چھپنے کی نوبت آئی اور اس اثنا میں مزید معلومات مہیا ہو گئیں، تو اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔
اس ایڈیشن کا متن ۱۹۴۷ء کی طبع ثالث پر مبنی ہے۔ البتہ طبع اول کا نسخہ مقابلے کے لیے پیش نظر رہا ہے۔ اصل کتاب کے حواشی میں مداخلت نہیں کی گئی، حال آنکہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض خود مولانا مرحوم کے قلم سے نہ ہوں۔ میں نے امتیاز کے لیے اپنے حواشی کتاب کے آخر میں شامل کر دیے ہیں۔

(۵)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتابت سے متعلق بعض باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔
اردو میں متعدد لفظوں کے لکھنے میں بہت بے احتیاطی کا رواج سا ہو گیا ہے۔ مثلاً عام طور پر فارسی کے حاصل مصدر ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں جیسے آزمائش، ستائش، افزائش وغیرہ۔ یہاں ہمزہ غلط ہے؛ یہ تمام الفاظ یاے سے ہونا چاہییں یعنی آزمایش، ستایش، افزایش وغیرہ۔ اسی طرح فارسی مرکبات توصیفی و اضافی میں اگر موصوف یا مضاف کے آخر میں یاے ہو، تو اس پر ہمزہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر صلاے عام، پاے خود، جاے مہمان میں کسی جگہ بھی یاے پر ہمزہ لکھنا درست نہیں۔ ہاں، اگر یہ یاے معروف ہو، تو اس صورت میں اس کے نیچے زیر لگانا چاہیے مثلاً رعنائیِ خیال، بیماریِ دل وغیرہ
اردو کے وہ لفظ جو امرِ تعظیمی کی ذیل میں آتے ہیں جیسے کیجیے، پیجیے، ڈریے یا جمع ماضی کے صیغے مثلاً دیے، لیے وغیرہ؛ ان میں بھی ہمزہ نہیں، بلکہ آخر میں یاے ہے؛ یہی حال چاہیے کا ہے۔
آپ کو اس مرتبہ پچھلی اشاعتوں سے دو جگہ املا کا تفاوت ملیگا۔ پہلا لفظ 'طیار' ہے؛ یہ

مقدمہ

سب جگہ تیار کر دیا گیا ہے ۔ دوسرے علماء کرام اور اسی قبیل کی ترکیبیں ہیں، ان میں ہر جگہ ہمزہ کی جگہ یاے لکھ دی گئی ہے یعنی علماے کرام وغیرہ (اگرچہ ممکن ہے کہ کسی جگہ سہو سے یہ تبدیلی نہ کی جا سکی ہو)۔ اس تبدیلی کا جواز "تذکرہ" کا وہ نسخہ ہے، جو مولانا کے ذاتی مطالعے میں رہا اور جس میں ہر جگہ انھوں نے یہ تبدیلی اپنے ہاتھ سے کی ہے ۔

ہمارے ہاں تحریر میں رموزِ اوقاف کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے ۔ بعض اوقات اس سے بہت الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور عبارت کے معنی تک بدل جاتے ہیں۔ آپ کو انگریزی کی کوئی معیاری کتاب رموزِ اوقاف کے بغیر نہیں ملیگی ۔ یہ قابلِ تقلید روش ہے۔ ہمارے لکھنے والوں اور ناشروں کو اس پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے ۔ اُردو میں چونکہ اس کا رواج نہیں ہے، اس لیے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہے کہ کہاں کونسا نشان رکھنا چاہیے ۔ اگر یہ استعمال عام ہو جائے، تو رفتہ رفتہ یہ تعیین بھی ہو جائیگی — اس نسخے کی کتابت میں حتی الوسع ان اصولوں کی پابندی کی گئی ہے ۔

نئی دلی

فروری ۱۹۶۷ء — مالک رام

فہرست

متن

از

مَولانا ابُوالکلام آزاد

لرحیم

دیباچہ

میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی[1] مولوی غلام علی آزاد بلگرامی[2] کے معاصر اور ہم وطن تھے، اور جدّی رشتہ سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں میں جابجا ان کا ترجمہ لکھا ہے، اور سراج الدین علی خان آرزو[3] اور آنندرام مخلص[4] کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے ایک مختصر رسالہ "غبارِ خاطر" کے نام سے لکھا تھا۔ میں یہ نام اُن سے مستعار لیتا ہوں:

مپرس تا چہ نوشت ست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست ایں غبارِ خاطرِ ما

یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائینگے۔ لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خان صاحب کو ان کا علم ہوا، تو مُصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ اُن کی طرح اُن کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے، اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سر و سامان کر رہا ہوں۔ جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے، اسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیے گئے ہیں۔ نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا:

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگذارید کہ ایں نسخہ مجزّا ماند!

نیشنل ایرلائن
(مابین کراچی - جودھپور)
۲ فروری ۱۹۴۶ء

ابوالکلام

(۱)

شملہ
۲۷ جون ۱۹۴۵ء

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیان و دعا می فرستمت

ں حکایتوں سے لبریز ہے، مگر زبان درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں۔ جہلت کا
ظر ہوں[۲]۔

ابوالکلام

(۲)

مکتوبِ سرینگر

ہاؤس بوٹ۔ سرینگر
۲۴۔ اگست ۱۹۴۵ء

گہے از دست، گاہے از دل و گاہے ز پا ماندم
بسرعت می روی، اے عمر! می ترسم کہ وا مانم

صدیقِ مکرم

زندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈھ رہا ہوں، معالجوں نے وادیٔ کشمیر کی گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتے تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پا سکونگا، مگر ہرچند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا!

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا،

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر[۲]

لیکن میرے حصّے میں ناخوشی و علالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اٹھائے آیا تھا، اسی طرح اٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی بھی سرتاسر ایک بوجھ ہی ہے، خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے؛ مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا ہے اٹھانا ہی پڑتا ہے!

ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم [۳]

گلمرگ سے سرینگر آگیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالہ کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے، جو غالبؔ نے کہا تھا: [۴]

با چوں توئی معاملہ، بر خویش منّت ست

از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیامِ دلنواز نہیں بھیجا ہے، لطف و عنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے:

قلیل منك یکفینی ولٰکن

قلیلك لا یُقال لہٗ قلیل [۵]

ان سطور کو آیندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصوّر کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سُنائی تھی وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسّلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

(۳)

مکتوبِ نسیم باغ

نسیم باغ۔ سری نگر
۳ ستمبر ۱۹۴۵ء

از ما مپرس درد دلِ ما کہ یک زماں
خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم[1]

صدیقِ مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ دہنی طرف جھیل کی وسعت شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں:

گرچہ دوریم، بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی[2]

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا، وہ ۳ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی پہنچ کر اجمل خان صاحب کے حوالے کر دوں گا۔ وہ نقل رکھ کر آپ کو بھیج دینگے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انھوں نے خطوط کی نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا۔ اور میں نے یہ طریقہ منظور کر لیا تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھو گیا کہ اجمل خان صاحب کو خط دینا بھول گیا۔ ۹ اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے، تو بعض کاغذات رکھنے کے لیے راہ میں اٹاچی کیس کھولا، اور یکایک وہ خط سامنے آ گیا۔ اب دنیا سے تمام علائق منقطع ہو چکے

تھے ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اُسے اٹاچی کیس سے نکال کر مسودات کی فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کر دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے۔ اب اُس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی، اور اِس دنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی:

کیف الوصول الیٰ سُعاد و دُونہا
قلل الجبال و بینھن حتوف

دوسرے دن یعنے ۱۰ اگست کو حسبِ معمول صبح تین بجے اٹھا۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا تھا۔ میں نے چائے دم دی، فنجان سامنے رکھا، اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اچانک وہ خط جو ۳ اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا، یاد آ گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں، اور آپ سُن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا، اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوب قلم بند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دیگر احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آئی اور اُن کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبعِ واماندۂ حال درازنفسی کرتی رہی۔ قید خانہ سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے، اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوب کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکینگے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دلِ مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا، تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی بالِ کبوتر سے، میرے حصے میں عنقا آیا:

این رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہدِ ماست　　عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود[۴]

۱۰ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کے بعد رُک گیا۔ کیونکہ ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ کے بعد طبع درماندۂ حال بھی رُک گئی تھی، اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا، اور قلعۂ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں، تاہم یہ حقیقت حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار و سکون کی جو کچھ نمایش تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ملنے سے بچا لیا تھا، مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا:

دل دیوانۂ دارم کہ در صحراست پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں۔ مگر اب سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی، تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا، اور کسی تحریر و تسوید کے لیے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا ہے، ۳ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اس مکتوب پر یہ داستانِ بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے:

شمۂ از داستانِ عشقِ شور انگیز ماست\
ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

غور کیجیے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی، مگر جب گذرنے پر آتی ہے تو گذر ہی جاتی ہے۔ گذرنے سے پہلے سوچیے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹیگی! گزرنے کے بعد سوچیے، تو تعجب ہوتا ہے کہ

جو کچھ گذر چکا، وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا!
رہائی کے بعد جب کانگرس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لیے ۲۱ جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اُسی مکان اور اُسی کمرہ میں ٹھہرا جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا، تو یقین کیجیے، ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے ۹ اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے، اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا، وہ خواب تھا، یا جو کچھ گذر رہا ہے یہ خواب ہے:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں[8]

۱۵ جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیبِ تاریخ جمع کر دیے۔ خیال تھا کہ انھیں حسبِ معمول نقل کرنے کے لیے دے دونگا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دونگا؛ لیکن جب مولوی اجمل خان صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ میں بلایا گیا، اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالے کر دیا جائیگا۔ اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجونگا؛ مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کرونگا۔

شملہ میں اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے۔ انھوں نے مولوی اجمل خان صاحب سے اس سلسلے کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے، شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو۔ "صدیقِ مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ رُوئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔

چشم سُوئے فلک و رُوئے سخن سُوئے تو بود[9]

مکتوبات کے دو حصے کر دیے ہیں: غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب

پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔
پرسوں دہلی کا قصد ہے چونکہ امریکن فوج کے جنرل مقیم دہلی نے از راہِ عنایت اپنے خاص ہوائی جہاز کے یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے، اس لیے موٹر کار کے تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤنگا اور اڑھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤنگا۔ وہاں عید کی نماز پڑھ کر بمبئی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ سے ۲۴ تک بمبئی میں قیام رہیگا۔"

ابوالکلام

(۴)

مکتوبِ سفر

جو ۹ اگست کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جا سکا اور جس کی طرف احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

بمبئی میل (براہِ ناگپور)
۳ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرّم

دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدّت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اس کا اثر باقی ہے۔ سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں اس وبالِ دوش سے کیونکر سبکدوش ہوں! دیکھیے "وبالِ دوش" کی ترکیب نے غالبؔ کی یاد تازہ کر دی:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں![1]

۲۹ جولائی کو اس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گذرے کہ کل ۲ اگست کو بمبئی کے لیے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا، اب پھر اپنے ساتھ واپس لیے جا رہا ہوں:

رَو میں ہے رخشِ عمر؛ کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں[2]

مگر دیکھیے، صبح چار بجے کے وقتِ گرانمایہ کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے! قیام کی حالت ہو، یا سفر کی، ناخوشی کی کلفتیں ہوں یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں

ہوں، یا دل و دماغ کی افسردگیاں؛ کوئی حالت ہو، لیکن اس وقت کی مسیحائیاں افتادگان بسترِ الم سے کبھی تغافل نہیں کر سکتیں:

فیضے عجبے یافتم از صبح ببینید
ایں جادۂ روشن رہِ میخانہ نہ باشد [3]

میں ایک کوپے[4] میں سفر کر رہا ہوں۔ اس میں چار کھڑکیاں ہیں، دو بند تھیں، دو کھلی تھیں۔ میں نے صبح اٹھتے ہی دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جتنی گرم ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی ہوا کے جھونکوں کی خنکی بھی بڑھتی جاتی ہے جس بسترِ کرب پر ناخوشی* کی کلفتوں نے گرا دیا تھا، اسی پر نسیمِ صبح گاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہوگی، جب خواجۂ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:[5]

خوشش باد انسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد!

ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جا رہی ہے۔ جس منزل سے اس وقت تک گزر جانا تھا، ابھی تک اس کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا۔ سوچتا ہوں، تو اس معاملۂ خاص میں وقت کے معاملۂ عام کی پوری تصویر نمایاں ہو رہی ہے:

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست [6]

رات ایک ایسی حالت میں کٹی، جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں، نہ سکون سے ــ آنکھ لگ جاتی تھی، تو سکون تھا؛ کھل جاتی تھی، تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوگئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا، تو دوسرا تخریب کی

* یہاں "ناخوشی" سے محض خوشی کی نفی مقصود نہیں ہے، بلکہ فارسی کا "ناخوشی" مقصود ہے۔ فارسی میں بیماری کو ناخوشی کہتے ہیں۔

برہم زنی۔

بیداریِ میانِ دو خواب ست زندگی گردِ تخیّلِ دو سُراب ست زندگی
از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است یعنی طلسمِ نقش بر آب ست زندگی

تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ صبح کی چائے کے لیے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو عبد اللہ اسپرٹ کا چولھا اور پانی کی کیتلی پانی بمقدارِ مطلوب سے بھری ہوئی ٹیبل پر رکھ دیتا ہے۔ چائے دانی اس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکمِ وضع الشیٔ فی محلّہٖ یہی اس کا محلِ صحیح ہونا چاہیے۔ مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ وضع الشیٔ فی غیر محلہٖ میں داخل ہو جاتا۔ اگر صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے، تو اکثر حالتوں میں عبد اللہ آکر چائے دم دے دیتا ہے۔ نہیں آیا، تو پھر خود مجھے ہی اپنے دستِ شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں۔ "اکثر حالتوں" کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ تمام کلّیوں کی طرح یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رک بھی جاتی ہے مگر عبد اللہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پھر جب نظر آتی ہے، تو اس کی معذرتیں میری فکرِ کاوش آشنا کے لیے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیمِ صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے؛ عبد اللہ کو اور زیادہ سُلا دیتی ہے۔ الارم کی ٹائم پیس بھی اس کے سرہانے رہنے لگی، پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں، آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے، مگر مجھے شیخ شیراز کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے۔ اور اس پر مطمئن ہو چکا ہوں:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس[1]

بہرحال چائے کا سامان حسبِ معمول مرتب اور آمادہ تھا۔ نہیں معلوم آج اسٹیشن کب

آئے! اور آئے بھی تو اس کا اطمینان کیونکر ہو کہ عبد اللہ کی آمد کا قاعدۂ کلیہ آج ہی بحالتِ استثنا نمودار نہ ہوگا! میں نے دیا سلائی اٹھائی اور چولھا روشن کر دیا۔ اب چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں مقصود اس تمام درازنفسی سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لیے تقریبِ سخن ہاتھ آئے:

نفسے بیادِ تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم[11]

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابونواس والی بات ہوئی کہ:[12]

رقّ الزجاج و رقّت الخمر

فتشابھا، فتشاکل الامر

کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اس کا ہر فنجان قاآنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے:

ساقی بدہ رطلِ گراں، زاں مے کہ دہقاں پرورد[13]

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لونگا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہونگا۔ علمی اصطلاح میں اس صورتِ حال کو علیٰ سبیل التوالی والتعاقب کہیے۔ اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگرٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جُرعہ سے خالی ہوا، اُدھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگرٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش

سے کیف وسرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے، فیضی کے الفاظ مستعار لوں:

اعتدالِ معانی از من پُرس
کہ مزاجِ سخن شناختہ ام[14]

آپ کہیں گے، چاے کی عادت بجاے خود ایک علت تھی؛ اس پر مزید علت ہاے نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے؟ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا، علتوں پر علتیں بڑھانا، گویا حکایتِ بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کہوں! جب کبھی معاملے کے اس پہلو پر غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگارِ خراب میں زندگی کو بناے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرنی چاہییں:

پیرِ ما گفت، خطا در قلمِ صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاکِ خطا پوشش باد![15]

غور کیجیے، وہ زندگی ہی کیا ہوئی، جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے! وہ چال ہی کیا، جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو!

تو و قطعِ منازلہا، من و یک لغزشِ پاے[16]

اور اگر پھر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے، تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جا کر ختم ہو جائیگا، جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
زِ زہدِ ہمچو توئی یا بفسقِ ہمچو منی[17]

اور اگر پوچھیے کہ پھر کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہوا؟ اگر یہ آلودگیاں راہ میں مُخل نہ سمجھی گئیں؟ تو

اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

ترکِ ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش [18]

یعنی ترک و اختیار، دونوں کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں، مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا، دامنگیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے۔ لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی:

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

دامن نچوڑ دیں، تو فرشتے وضو کریں [19]

یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے، بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تردامنی کی گرانی محسوس کیجیے، نہ خشک دامنی کی سبک سری؛ نہ آلودہ دامنی پر پریشان حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سرگرانی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق

رُوئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست [20]

آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کھل جائے۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا، تو مجھے معلوم تھا کہ قیدخانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیرِ اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اُسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورتِ حال کا احساس ہوا تو رک گیا۔ لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، بہ اصرار کہا کہ ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگریٹ تھے۔ ایک کمشنر پولس کے آفس میں پیا، دوسرا راستہ میں سُلگایا، دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ باقی چھ رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر سے جب اندر

جانے لگا تو خیال ہوا، اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں، تو بہتر ہے۔
میں نے کیس نکالا اور مع سگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا، اور پھر اُس دن سے لے کر دو برس
تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں
کی تھی، جن کے پاس سگرٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی
کرتا تھا۔ بعض "شرب الیہود" [1] کا طریقہ کام میں لاتے تھے:

شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم! [21]

بعضوں کی جرأتِ رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ:

ولا تسقنی سراً، فقد امکن الجھر [2]

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنی [24] توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ
گھر سے سگریٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیے!

خوشم کہ توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد [25]

سرگذشت کا اصلی واقعہ اب سنیے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا، تو قید خانہ کے دفتر
میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا، اور ازراہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجیے،
جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا، اتنے ہی درجہ کی آمادگی
کے ساتھ یہ پیش کش قبول کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی، نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔
نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا، نہ حصول پر نشاط [26] ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزا دیا تھا"

---

[1] اسلامی حکومتوں میں یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے اور بیچتے تھے، اس لیے پوشیدہ شراب پینے کے معنی میں "شربِ الیہود" کی اصطلاح رائج ہو گئی۔

[2] پورا شعر یہ ہے: [22]

ألا فاسقنی خمراً، وقل لی ھی الخمر — ولا تسقنی سراً فقد أمکن الجھر

"مجھے شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ یہ شراب ہے۔ مجھے چھپا کر نہ پلا کیونکہ اب کھل کر پینا ممکن ہو گیا ہے" [23]

وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریفِ صافی و دُردی نہٗ خطا ایں جاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کنی، بلا ایں جاست [۲۷]

۱۹۲۱ء کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے، تو پھر ترک کر دیتا۔

اب قلم کی سیاہی جواب دینے لگی ہے اس لیے رُک جاتا ہوں:

قلم ایں جا رسید و سر بشکست [۲۸]

ابوالکلام

(۵)

داستانِ بے ستون و کوہ کن

قلعۂ احمد نگر

۱۰ اگست ۱۹۴۲ء

ازسازِ و برگِ قافلۂ بے خوداں مپرس ۱
بے نالہ می رود جرس کاروانِ ما!

صدیقِ مکرم

کل صبح تک وسعت آبادِ بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مایگی کا یہ حال تھا کہ ۳ اگست کا لکھا ہوا مکتوبِ سفر بھی اجمل خان صاحب کے حوالہ نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعۂ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اُس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں۔

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش ۲
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند

نو مہینے ہوئے، ۴ دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعۂ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں، اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی:

دو کروٹیں ہیں عالمِ غفلت میں خواب کی ۳

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گذر چکی:

چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد[4]

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کریگا!

فریبِ جہاں قصۂ روشن است
بہ بیں، تا چہ زاید، شب آبستن ست[5]

۴ اگست کو بمبئی پہنچا، تو انفلوئنزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷ اگست تک ورکنگ[6] کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے؛ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا؛ لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ کو دو بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک بیٹھنا پڑا، لیکن کارروائی ختم کر کے اٹھا:-

کام تھے عشق میں بہت، پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے[7]

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحبِ مکان[8] کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصہ سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں ان سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا، تاکہ ان کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ[9] کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفا منظور بھی نہیں کیا ہے، لیکن انھیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے فلاں شخص[10] شام کو آیا تھا، کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ گرفتاری[11] کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لیے گئے

ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئیگا"۔ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دلّی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا:

یا وفا، یا خبرِ وصلِ تو، یا مرگِ رقیب
بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند[10]

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ اُن کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا: "جس طرح کے حالات درپیش ہیں۔ ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا! اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جو اب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے، اور چند گھنٹے آرام کرلوں"۔

گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم![11]

حسبِ معمول چار بجے اٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین (Genaspirin) کی دو گولیاں منھ میں ڈال کر چاے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوط کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روزویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا، اور اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور ہوا کے ٹھنڈے اور رطوبت آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا، کچھ نسیمِ صبحگاہی کے ان شفابخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کر دی:

نسیمِ صبح! تیری مہربانی![12]

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا، لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا

محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی ہیں اور اس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے، اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دَھیرو[13] رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا میں خواب دیکھ رہا ہوں، اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا:

زہے مراتبِ خوابے کہ بہ زبیداری ست![14]

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گزرے ہونگے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ دَھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لیے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا اور دیکھوں:

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی![15]

میں نے دَھیرو سے کہا: مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگیگا۔ اُن سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا، کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے، اور باہر نکلا تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے:

کارِ مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم![16]

کار باہر نکلی، تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیمِ صبح کے جھونکے احاطہ کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی:[17]

صبا وقتِ سحر بوئے ز زلفِ یار می آورد
دلِ شوریدۂ ما راز نو در کار می آورد!

کار دکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی، تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں

تھا، اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گذر رہا تھا۔ لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی کیونکہ ایک انجن رسٹورنٹ کار کو ڈھکیل ڈھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا یہی کاروانِ خاص ہے، جو ہم زندانیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈور کیریج (Corridor carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں، جو آپس میں جڑ جاتی ہیں، اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر چلا جاتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں؛ جو نہیں آئے، وہ آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں [۲۰]

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے، ان کے چہروں پر بیخوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے اُٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا، بمشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ میں نے کہا، معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؛ اسے بھی کوئی جگانے کے لیے پہنچا یا نہیں؟

درازیِ شب و بیداریِ من، ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید "تا کجا خفتست"! [۲۱]

بہرحال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مُخل نہیں ہوسکتی تھیں۔ چونکہ رسٹورنٹ کار لگ چکی تھی اور چائے کے لیے پوچھا گیا تھا، اس لیے گو پی چکا تھا، لیکن پھر منگوائی اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جامِ صبحگاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار مٹائیں:

بنوش مے چو سبک رُوحی، اے حریفِ مُدام
علی الخصوص دریں دم کہ سرگراں داری [۲۲]

یہاں "بادۂ دوشینہ" کی ترکیب محض "جامِ صبحگاہی" کی مناسبت سے زبانِ قلم پر طاری

ہوگئی۔ مگر غور کیجیے کتنی مطابقِ حال واقع ہوئی ہے! صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورتِ حال کیسی منقلب ہوگئی! کل شام کو جو بزمِ کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دو پہر رات تک طول کھینچا تھا۔ لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے تو:

نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے![23]

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی، اور مجلس دوشین کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی، تو اب صبحِ خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا تھا:

خمیازہ سنجِ تہمتِ عیش رسیدہ ام
مے آں قدر نہ بود کہ رنجِ خمار برد

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبحِ خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑ ا تھا، تو ایسا ہونا ناگزیر تھا' اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا' تو کاش، جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی، اور نئے تُلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیے ہوتے! خواجہ میر درد کیا خوب کہہ گئے ہیں![24]

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رندِ شرابی کا
بھِڑا دے مُنھ سے مُنھ ساقی! ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا:

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست　　　ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید[25]

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں، ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی، اور پونا کی راہ اختیار کی، تو سب کو خیال ہوا غالباً منزلِ مقصود پونا ہی ہے؛ لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقا اُتار لیے گئے، اور بمبئی کے مقامی قافلے کو بھی اُترنے کے لیے کہا گیا مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا، اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:[26]

جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا، کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے، تو پھر اس رُخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسّی میل سے زیادہ نہیں، اس لیے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا: احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے، بہت جلد آ جائیگا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؛ احمد نگر سے تو شروع ہوگا۔ بے اختیار ابو العلاء معرّی کا لامیہ[27] یاد آگیا:

فیادارھا بالخیف ، اِنّ مزارھا
قریبٌ، ولکن دُون ذالک اُھوالُ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے، مگر قلعۂ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا، تو قصد بھی کیا تھا، مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے اُن خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں[28] آباد تھا۔ پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی، تو ملک احمد نظام الملک بھیری[29] نے عَلَمِ استقلال بلند کیا اور

بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر تعمیر کی جگہ اُسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اُس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دار الحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندران سے آکر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے:[30] "چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کر لی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا":

کس پایمالِ آفتِ فرسودگی مباد

دیرو ز ریگِ بادیہ آیینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول[31] نے اسے منہدم کر کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کیا، اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگِ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اُس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے:

کارواں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست

زاں نشانہا کہ بہ ہر راہگذار افتادست[32]

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی[33] نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار ِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے:

بفشاں جرعۂ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت پرس

کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد[34]

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خان خاناں[35] کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا

جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی[36] اور صمصام الدّولہ[37] نے ہمیں سنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے در پیش [است] و فتح آسانی. اگر [شکست] رُو دہد، جاے نشاں دہید کہ [ما] شمارا دریابیم"۔ خانخاناں نے جواب دیا تھا: "زیرِ لاشہا"[38]

وَنَحنُ اُناسٌ لا توسّط بیننا
لنا الصّدرُ دُونَ العالمین اَوِ القبرُ[39]

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکا یک تازہ کردیے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا، اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق پر ورق الٹتا جاتا، ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا:

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہاے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چنی گئی ہے، تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خراباتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

بایک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست[40]

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا، جس سے ہمیں ملایا گیا ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موٹر[41] نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا، تو

پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مُڑ سکتے ہیں، لیکن پیچھے مُڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

ہاں رہِ عشق ست، کج گشتن ندارد بازگشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست! [۴۲]

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلے پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اُس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے اور اِس میں جو قلعہ کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے، خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا:

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا [۴۳]

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل[۴۴] نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی، اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ولزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے، اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی، وہ بھی اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی، پھر ٹینکوں[۴۵] کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لیے چڑھائی پر واقع ہے، کاریں رُک گئیں اور ہمیں اُترنے کے لیے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس، بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ افیسر کے حوالہ کی۔ وہ

فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سررشتہ حکومتِ بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگئے :

در جستجوے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد[46]

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا، غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے؛ یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جاسکے، تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلیگا تو محسوس کریگا کہ کھلی جگہ میں آگیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اُڑائی جاسکتی ہے :

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے[47]

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے؛ مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لیے سر اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا :

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے[48]

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے، مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا :

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں[49]

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے! چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہرحال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی؛ ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی تھیں، وہیں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سبحان اللہ! اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں! اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لیے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو!

کشتوں کا تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی، تو خرابات ہوویگا!

مغربی رُخ کے تمام کمرے کھُلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصّے میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

ما گوشہ را نہ بہرِ قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو ۹ بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھولی:

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے[50]

تین بجے اٹھا، تو تازہ دم اور چست و چاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی، نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا۔ اور چائے دم دی[51]۔ اب جام و صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصوّر کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و

کوہکن سُنا رہا ہوں:

شیریں ترازحکایتِ مانیست قصۂ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم[52]

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا، تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے![53]

غلط گفتی: "چرا سجادۂ تقویٰ گرد کردی؟"
بزہد آلودہ بودم، گرنمی کردم، چہ می کردم؟

یہ اُسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو مجتہدِ کاشان کی نسبت کہا تھا، بہت مشہور ہو چکا ہے![54]

زشیخِ شہر جاں بردم بہ تزویرِ مسلمانی
مدارا گر باایں کافر نمی کردم، چہ می کردم

ردیف کا نبھانا آسان نہ تھا مگر دیکھیے، کس طرح بول رہی ہے؛ بول نہیں رہی ہے، چیخ رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں، اور اس کا مطلع دہرا رہا ہوں:[55]

زساغر گر دماغے تر نمی کردم، چہ می کردم؟

خدارا داد دیجیے۔ نظر بہ حالتِ موجودہ یہاں "چہ می کردم" کیا قیامت ڈھا رہا ہے! گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ مگر یوں پتہ نہیں چلیگا، "چہ می کردم" پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھیے۔ پھر دیکھیے، صورتِ حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلیشہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں

معلوم، بحالتِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکینگی یا نہیں! تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی، جسے مرزا غالبؔ نے ذوقِ خامہ فرسائی کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ابوالکلام

(۶)

قلعۂ احمد نگر

۱۱ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی، اور اب پھر اُسی منزل سے قافلۂ بادپیماے عمر گذر رہا ہے:

باز می خواہم ز سر گیرم رہِ پیمودہ را![1]

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدّت شمار کی جائے، تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔[5] عمر کے تریپن برس جو گذر چکے ہیں، ان سے یہ مدّت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصّے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گذرا۔ تورات کے احکامِ عشرہ[2] میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا۔ یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی۔ سو ہمارے حصّہ میں

۵ یہ مکتوب ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گذر گئے اور مجموعی مدّت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اس اضافہ کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصّہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی، اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

بھی سنت کا دن آیا۔ مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں، گویا خواجہ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے:[3]

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے، اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے!

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود[4]

وقت کے جو حالات ہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، اُن میں اِس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں: بے حسی کی زندگی بسر کریں، یا احساس حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے، مگر دوسری کے لیے قید خانہ کی کوٹھڑی[5] کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کرسکتے تھے، ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست[6]

زندگی میں جتنے جرم کیے اور اُن کی سزائیں پائیں، سوچتا ہوں تو اُن سے کہیں زیادہ تعداد اُن جرموں کی تھی جو نہ کرسکے، اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں، لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا، تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ

ُوں۔ اُس وقت عمر کے صرف ۲۷ برس گزرے تھے۔ "الہلال"، "البلاغ" کے نام سے جاری تھا۔ "دارالارشاد" قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا، اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلابِ حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہوئی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا:[ف]

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اس صورتِ حال کا ردِّ فعل شروع ہوا، تو معلوم ہوا کہ معاملہ اتنا سہل نہ تھا، جتنا ابتدائے حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوتا تھا اور اس کی آزمائشیں ابھی گزر نہیں چکیں، بلکہ اب پیش آ رہی ہیں۔

جب کبھی اسی طرح کا معاملہ یکایک پیش آ جاتا ہے، تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں، کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ صورتِ حال سے دب جائے؛ وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پرجوش نشّہ کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشّہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے، اس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ تکلیف اس وقت محسوس ہوگی، جب نشّہ اُترنے لگیگا اور جماہیاں آنی شروع ہونگی۔ اس

[ف] ۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا تھا۔ میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورابادی میں مقیم ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا اور اس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔

وقت ایسا معلوم ہوگا، جیسے سارا جسم درد سے چُور چُور ہو رہا ہو چنانچہ اس معاملہ میں بھی پہلا دَورتشنۂ جذبات کی خود فراموشیوں کا گذرا۔ علائق کا فوری انقطاع، کاروبار کی ناگہانی برہمی، مشغولیتوں کا یک قلم تعطّل، کوئی بات بھی دامن دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتہ سے بہ اطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک عیز آباد حصہ میں مقیم ہو گیا۔ لیکن پھر جوں جوں دن گذرتے گئے، طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں، اور صورت حال کا ایک ایک کانٹا پہلوے دل میں چبھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا، اور ایک خاص طرح کا سانچا اس کے لیے ڈھالنا پڑا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک کہ چھبّیس برس گذر چکے، وہی سانچا کام دے رہا ہے، اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے، مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی برابر بڑھتی گئی۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلا شبہہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی (Stoical) بے پروائی پیدا کر دیتا ہے، اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں، لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے، لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے' ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ 'فقدان' کا افسوس کم کر دیگا۔ لیکن 'حاصل' کی کوئی امید نہیں دلائیگا۔ اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں، تو فلسفہ ہمیں کلیلہ و دمنہ (پنچ تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کریگا: لا تاسَ علیٰ ما فات (جو کچھ کھو چکا، اس پر افسوس نہ کر) لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے؛ اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا، کیونکہ بتلا سکتا ہی نہیں، اور اس لیے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔

سائنس عالمِ محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادّی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دیگا، مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کریگا۔"

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں، تو کس کی طرف اٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں؟
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند[11]

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے:

دلِ شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست[12]

بلاشبہہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بیرنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے، اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔

درِ دگرے بنما کہ من بکجا روم، چو براِنیم[13]

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دیگا، اور پھر اسے بند نہیں کر سکیگا۔ سائنس ثبوت دے دیگا، مگر عقیدہ نہیں دے سکیگا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے، اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے جنھیں

ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہییں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

By Faith, and Faith alone, embrace
۱۳
Believing, Where we cannot prove

عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے، اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا؛ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈھنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی، اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آ کھڑے ہوئے تھے، اُن پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے، اور اُن کے متعارض دعووں اور متصادم فیصلوں نے حیران و سرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے، تو خود نفسِ مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آ گئیں، اور انھوں نے حیرانگی کو شک تک، اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔ پھر اس کے بعد مذہب اور علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہوا۔ اور اس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھو دیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں، ایک ایک کر کے اُبھرے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں! اگر ہے، اور ایک ہی ہے، کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں، تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے؟ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے، بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے؟ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف و نزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم، اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے، اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پُر اسرار تاریکیاں جنھیں نوعِ انسانی عظمت و تقدیس کی

نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہو گئی تھی، ایک ایک کر کے نابود ہو رہی ہیں![14]
یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے، اور اگر قدم اسی پر رک جائیں
تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں![15]

مجھے بھی ان منزلوں سے گذرنا پڑا، مگر میں رکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں
چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام
نمودار ہوا، اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی
انہی متعارض راہوں اور اوہام و خیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی
راہ بھی موجود ہے، جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے، اور اگر سکون و
طمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے، تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت
کی جستجو میں کھو دیا تھا، وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علّت تھی
وہی بالآخر داروے شفا بھی ثابت ہوئی:

تداویتُ من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ
کما یتداوی شاربُ الخمرِ بالخمرِ[16]

البتہ جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا؛ اور جو عقیدہ پایا، وہ تحقیقی تھا:

راہے کہ خضر داشت زسرچشمہ دور بود
لب تشنگی زراہِ دگر بردہ ایم ما[17]

جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری
آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں، ہم اس راہ کا سراغ نہیں پا سکتے۔ لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی
ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی، اور نہ کھوئی ہوئی تھی۔ یہ خود ہماری ہی

چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گم کر دیا تھا:

دردشتِ آرزو نہ بود بیمِ دام و دَد

راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو[18]

اب معلوم ہوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے، وہ مذہب کہاں تھا! وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صورت گری تھی:

"تا بغایت ما ہنر پنداشتیم

عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ ست!"[19]

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں، مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہ راہِ عام بن گئی ہے، سب اسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہیے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں اسلام درج کرا دیجیے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے، اُسے نہ چھیڑیے اور اُسی میں ڈھلتے رہیے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لیے اُسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے، اور اسی کی راہ گم ہو جاتی ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدّعا ایں جاست![20]

اسی مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے، وہ فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے، مدّعیانِ علم کی خام کاریوں اور مدّعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر:

عباراتنا شتّٰی و حُسنک واحد   وکلّ الیٰ ذاک الجمال یشیر

علم عالمِ محسوسات سے سروکار رکھتا ہے، مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدّد ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماوراء ہے، اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں!

برچہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرستِ ماست![21]

بہرحال زندگی کی دشواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی، بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (Moral Values) کا یقین دلاتا ہے، اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیے:

جلوۂ کاروانِ ما نیست بہ نالۂ جرس
عشقِ تو راہ می برد، شوقِ تو زادمی دہد[22]

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا؟
نہیں اٹھایا جا سکتا، کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوئے جن کا ہمیں جواب دینا ہے، اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے۔ جن باتوں کو ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے راحتیں اور لذتیں ہی کب رہینگی، اگر ان تقاضوں اور مقصدوں سے منھ موڑ لیں! بلاشبہ یہاں زندگی کا بوجھ اٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا، لیکن اس لیے دوڑنا پڑا کہ دیبا و مخمل کے فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب دیا نہیں جا سکتا تھا۔ کانٹے کبھی دامن سے الجھینگے، کبھی تلووں میں چبھینگے، لیکن مقصد کی خلش جو پہلوے دل میں چبھتی رہیگی، نہ دامنِ تار تار کی خبر لینے

دیگی، نہ زخمی تلووں کی:

معشوق درمیانۂ جاں، مدّعی کجاست
گل در دماغ می دمد آسیبِ خار چیست [23]

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافتوں کے کرشموں کی ایک صورت گری ہے؛ یہاں نہ مطلق راحت ہے، نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سرتاسر اضافی ہیں:

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مُردن [24]

اضافتیں بدلتے جاؤ، راحت والم کی نوعیتیں بھی بدلتی جائینگی۔ یہاں ایک ہی ترازو ہے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جاسکتا۔ ایک دہقان کی راحت والم تولنے کے لیے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں، اُس سے فنونِ لطیفہ کے ایک ماہر کا معیارِ راحت و الم نہیں تول سکینگے۔ ایک ریاضی دان کو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذّت ملتی ہے، وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکیگی! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اس کی ہر چبھن میں راحت و سرور کی ایک نئی لذت پانے لگتے ہیں:

بہر یک گل، زحمتِ صد خار می باید کشید! [25]

راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے۔ طلب و سعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذّت ہے، بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست [26]

اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، فلسفہ نہیں ہے؛ زندگی کے عام واردات ہیں۔ عشق و محبت کے واردات کا میں حوالہ نہیں دونگا۔ کیونکہ وہ ہر شخص کے حصّے میں نہیں آسکتے۔ لیکن زندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خبر رکھنے والے تو بہت نکلینگے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ دیکھیں کہ کسی کی راہ میں رنج و الم کی تلخیوں نے کبھی خوشگواریوں کے مزے بھی دیے تھے یا نہیں؟

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نۂ، ناصح!
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن [۲۷]

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد!
سرمد بہ مے و پیالہ ربطے دارد [۲۸]

کوئی زندگی کی کاربرآریوں ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ کران پر قانع ہو جاتا ہے [۲۹]، کوئی ان پر قانع نہیں ہوسکتا۔ جو قانع نہیں ہوسکتے ان کی حالتیں بھی مختلف ہوئیں۔ اکثروں کی پیاس ایسے مقصدوں سے سیراب ہو جاتی ہے، جو انھیں مشغول رکھ سکیں لیکن کچھ طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے صرف مشغولیت کافی نہیں ہوسکتی؛ وہ زندگی کا اضطراب بھی چاہتی ہیں،

نہ داغِ تازہ می کارد، نہ زخمِ کہنہ می خارد
بدہ یارب! دلے کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم [۳۰]

پہلوں کے لیے جو دلبستگی اس میں ہوئی کہ مشغول رہیں، دوسروں کے لیے اس میں ہوئی کہ مضطرب رہیں:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست
تسلّیے بہ ہزار اضطراب می بافند [۳۱]

ایک خنک اور نا آشنائے شورش مقصد سے ان کی پیاس نہیں بُجھ سکتی۔ انھیں ایسا مقصد چاہیے، جو اضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو، جو اُن کے اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچا دے، جس کے دامنِ ناز کو پکڑتے کے لیے وہ ہمیشہ اپنا گریبانِ وحشت چاک کرتے رہیں:

دامن اُس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں ۳۲

ایک ایسا بلائے جان مقصد جس کے پیچھے انھیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے، جو دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے اور ہمیشہ دُور بھی ہوتا رہے۔ نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیں، دُور اتنا کہ اس کی گردِ راہ کا بھی سُراغ نہ پا سکیں!

با من آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من ۳۳

پھر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیے، تو معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے صرف نہ رس نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ یکسانی اگرچہ سکون و راحت کی ہو، یکسانی ہوئی؛ اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو، مگر پھر تبدیلی ہے؛ اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں حمّضوا مجالسکم، اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انہی کو مل سکتا ہے، جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں، اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا، جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے۔ خواجہ درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی تنگ
آخر جیے گا کب تلک، اے خضر! مر کہیں! ۳۴

یہاں پانے کا مزہ اُنہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں، اُنھیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں! نظیری کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی: ۳۵

آنکہ اُو در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ یافت

تو کہ چیزے گم نہ کردی، از کجا پیدا شود!

اور پھر غور و فکر کا ایک قدم اور بڑھائیے، تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں، اگر چاہیں تو اسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے؛ آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگی ما عدمِ ماست ۳۶

ما زندہ از انیم کہ آرام نگیریم!

اور پھر یہ راہ اس طرح بھی طے نہیں کی جا سکتی کہ اُس کے اُکاؤ کے ساتھ دوسرے لگاؤ بھی لگائے رکھیے۔ راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے، میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی:

خاکِ کوئیش خود پسند افتاد در جذبِ سجود ۳۷

سجدہ از بہرِ حرم نہ گذاشت در سیمائے من!

مقصود اس تمام دراز نفسی سے یہ تھا کہ آج اپنے اوراقِ فکرِ پریشاں کا ایک صفحہ آپ کے سامنے کھول دوں: ۳۸

لختے زحالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

اس میکدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتارِ دامِ تخیل نے اپنی خود فراموشیوں کے لیے

کوئی نہ کوئی جامِ سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اسی میں بیخود رہتا ہے:

ساقی بہ ہمہ، بادہ زیک خُم دہد، امّا
در مجلسِ او مستی ہر یک زشرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے، کوئی کانٹوں سے؛ اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کریگا کہ تہی دامن رہے۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے، تو ہمارے حصّے میں تمنّاؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں نے پھول چُن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے؛ ہم نے کانٹے چُن لیے اور پھول چھوڑ دیے؛

زخارِ زارِ محبّت دلِ ترا چہ خبر
کہ گل بجیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا ۳۹

ابوالکلام

(۷)

قلعۂ احمد نگر

۱۵ اگست ۱۹۴۲ء

ما را زبان شکوہ ز بیداد چرخ نیست
از ما خطے بہ مہر خموشی گرفتہ اند [۱]

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ۔ ایک دَور ختم کر چکا ہوں۔ دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحی مے ناب و سفینۂ غزل ست
جریدہ رَو کہ گذرگاہِ عاقبت تنگ ست
پیالہ گیر کہ عمرِ عزیز بے بدل ست [۲]

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر این و آں سے بکلّی آسودہ ہے۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجہ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے۔ مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جانفزا وقت ہو، اور چینی کی بہترین چائے کے پے در پے فنجان!

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیرِ ما بدستِ شرابِ دو سالہ بود [۳]

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی صحن میں نکلا، تو ہر طرف سناٹا تھا، صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و بازگشت کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اُس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن کا شعر یاد آگیا:

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے[5]

زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں، اور اِسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں:

دائم کسے بقافلہ بود ست پاسباں
بیدار شو کہ چشمِ رفیقاں بخواب شد[6]

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصّے میں آئی۔ دنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا، وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذّت یاب ہوتا رہوں:

خلق را بیدار باید بود ز آبِ چشمِ من
وین عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست[8]

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جراُتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں:

خوابِ غفلت ہمہ را بُردہ و بیدار یکےست [9]

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں، لیکن اپنا وقت صاف بچائے جاتا ہوں کیونکہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش و طرب کی بزم اُس وقت آراستہ ہوتی ہے، جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے، نہ کوئی کان سننے والا۔ قصی دانش نے میری زبان سے کہا تھا:

خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروش گل و بلبل خبرم نیست

اک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سُلگ جاتی ہے، اُس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں؛ راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں:

اناں بہ دَیرِ مُغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نہ میرد، ہمیشہ در دلِ ماست [10]

دن بھر اگر سوز و تپش کا سامان نہ بھی ملے، جب بھی چولھے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا۔ عرفی کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

سینۂ گرم نہ داری مطلبِ صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات عُود مخر [11]

اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد مرحوم [12] کا منت گزار ہوں ان کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر [13] ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اُٹھنا زندگی کی سعادت کی پہلی علامت ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات سناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین [14] مرحوم سے صبح کی سنت و فرض کے درمیان سبق لیا کرتا تھا اور اس امتیاز پر نازاں

رہتا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے، مجھے خصوصیت کے ساتھ اوروں سے علیحدہ سبق دیں، اور اس کے لیے صرف وہی وقت[16] نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے کہ یہ فیض مجھے اپنے نانا رکن المدرسین[15] سے ملا۔ وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصباح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر[17] سے اُٹھ کر اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجۂ شیراز کا یہ مقطع ذوق لے لے کر پڑھتے:

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
زورِ دِ نیم شب و درسِ صبحگاہ رسید[18]

میری ابھی دس گیارہ سال کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئی تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پر سوار رہتی تھی، مگر میں اس سے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اُٹھتا، اور شمعدان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے، تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھیں؛ یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے! اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے، والد مرحوم روکتے، لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی، دن بھر پشیمان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے، یہ ان سے میرا پہلا سابقہ تھا:

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی
فصادف قلباً فارغاً فتمکنا

دیکھیے، یہاں "پہلا سابقہ" لکھتے ہوئے میں نے عربی کی ترکیب کان اول عہدی بھا کا بلاقصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور عالمِ تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اٹھا رہا ہوں۔ گویا ساری دنیا میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں بستا۔ کہہ نہیں سکتا، تنہائی کا یہ احساس میری طبع خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدلؔ کی خیال بندیوں کا غلو بے کیف ہو

لیکن اس کی بحرِ طویل کی بعض غزلیں کیف سے خالی نہیں ہیں:

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا، بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے گجستہ بو، مپسند زحمتِ جستجو
بخیالِ حلقۂ زلفِ او گرہے خورد بہ ختن درآ[19]

پانچ بجے سے قلعہ میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھڑگھڑ کی آواز آنے لگتی ہے، مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لیے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے، آئی تھی اور واپس گئی۔ اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ملکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں؛ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسبِ معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم[20]

مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری محمد شاہی امرا میں سے تھا؛ اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں[21] میں دیکھا ہوگا؛ ضلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں، تو بے اختیار یاد آ جاتا ہے:

زبسکہ در دلِ تنگم خیالِ آں گل بود
نفیرِ خوابِ من امشب صفیرِ بلبل بود

نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے، جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے، اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام

کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔ فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا، داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کرلیا، ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جاسکتا تھا، وہ بھی کرلیا؛ لیکن اس سے زیادہ ہمارے معاملات سے انھیں کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اور اصلی رشتۂ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۸ اگست کو یرودا سنٹرل جیل، پونا سے ایک سینیر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ دس جیل کے وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لیے اس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے؛ صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈیٹنشن کیمپ[۲۲] (Detention Co) کھل رہا ہے، چند دنوں کے لیے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے، تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا، اور بیچارہ سراسیمہ ہوکر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصّہ اُس غریب پر نکالا تھا، اُس لیے کئی دن تک منھ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی، تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا، وہ اس سے زیادہ بےخبر تھا۔

در ہر کس کہ زدم، بے خبر و غافل بود[۲۳]

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کرکے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے! معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنا چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنہ کی درخواست کی۔ میں نے کہا: میرا سینہ دیکھنا بیسود ہے؛ اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے، تو اُسے کام میں لایئے۔

بگذر مسیح، از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر است [24]

بہر حال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن[25] آیا، اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالہ کیا۔ کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی؛ کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی؛ کوئی اخبار نہیں آ سکتا؛ ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اُس پر غور کرنے کے لیے تیار[26] ہے۔ اب ان باتوں کے بعد اور کون سی بات رہ گئی تھی، جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت ازراہِ عنایت اسے دُور کر دیتی!

زباں جلائی، کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بندوبست ہوئے ہیں مری دعا کے لیے[27]

انسپکٹر جنرل نے کہا۔ اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان منگوانا چاہیں، تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں، گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دیگی۔ چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لیے ساتھ رکھ لی تھیں، مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا۔ خیال ہوا، اگر مکان سے بعض مسودات اور کچھ کتابیں آجائیں، تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔ دنیا را بہ امید خوردہ اند، آرزو عیب ندارد:

نقابِ چہرۂ امید باشد گردِ نومیدی
غبارِ دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد [28]

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جب صورتِ حال پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا، تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے پر راضی ہو گئی۔ جب عزیز و اقربا سے بھی ملنے اور خط و

کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا، تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کردیگی! ایسی حالت میں عزتِ نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے، نہ توقع رکھی جائے:

ز تیغِ بے نیازی تا توانی قطعِ ہستی کُن
فلک تا افگند از پا ترا، خود پیش دستی کُن [29]

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کردیا جائے؛ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم رہتا ہے، میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا:

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں! [30]

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لیے کہ ہمیشہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر، خواجۂ شیراز کے پیرِ مے فروش کی موعظت بھی وقت پر کیا کام دے گئی ہے: [31]

دی پیرِ مے فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا: "شراب نوش و غمِ دل ببر ز یاد"
گفتم: "بباد می دہدم بادہ نام و ننگ"
گفتا: "قبول کن سخن و ہرچہ باد باد"
"بے خار گل نباشد و بے نیش نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضعِ جہاں این چنین فتاد"
"پُر کن ز بادہ جام و دما دم بگوش ہوش
بشنو از و حکایتِ جمشید و کیقباد"

(۸)

قلعۂ احمد نگر

۱۹ اگست ۱۹۴۲ء

چو تخمِ اشک بہ کلفت سرشتہ اند مرا
بہ ناامیدیِ جاوید کشتہ اند مرا
زِ آہِ بے اثرم داغِ خام کاریِ خویش
زِ آتشے کہ نہ دارم، برشتہ اند مرا

صدیقِ مکرم

وہی چار بجے صبح کا وقت ہے۔ چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے، آپ کو مخاطب تصوّر کروں اور کچھ لکھوں۔ مگر لکھوں تو کیا لکھوں! مرزا غالب نے رنجِ گراں نشین کی حکایتیں لکھی تھیں؛ صبرِ گریزپا کی شکایتیں کی تھیں:

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہیے[۲]

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں، نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے جو ناصر علیؒ نے اس کے تمام کلام میں سے چُنا تھا:

من ازیں رنجِ گرانبار چہ لذّت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند![۴]

اگر اس شعر کو اپنی حالت پر ڈھالنے کی کوشش کروں، تو یہ ایک طرح کی خود ستائی اور خویشتن بینی کی بے ظرفی سمجھی جائیگی۔ لیکن یہ کہنے میں کیا عیب ہے کہ اس

مقام کی لذت شناسی سے بے بہرہ نہیں ہوں اور اس کا آرزو مند رہتا ہوں ؛ اُسی عرفی نے یہ بھی تو کہا ہے :

منکر نہ تواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بہ من گر نہ بود، با دگرے ہست[5]

یہاں پہنچنے کے بعد چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا، اسی دن ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا، آئی، ایم، ایس[6] سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک (Sendak) نام ہے، اور یہاں کے لیے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا یہ سینڈک، بینڈک کون کہے! کوئی اور نام ہونا چاہیے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظہ نے یاد دلایا، کہیں نظر سے گذرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتہ خان نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے ان حضرت[8] کا نام چیتہ خاں ہی رکھ دیا کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد :

نام اُس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں![9]

ابھی دو چار دن بھی نہیں گذرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر چیتہ خان تھا۔ قیدی اور وارڈر بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتہ خان وقت سے پہلے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا چیتہ خان کون؟ کہنے لگا میجر اور کون؟

ما ہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد[10]

بہرحال غریب جیلر کی جان چھٹی، اب سابقہ چیتہ خاں سے رہتا ہے۔ جب جاپانیوں نے انڈیمین پر قبضہ کیا تھا تو یہ وہیں متعین تھا۔ اس کا تمام سامان غارت گیا۔ اپنی بربادیوں کی کہانیاں یہاں لوگوں کو سناتا رہتا ہے :

اگر ما دردِ دل داریم، زاہد دردِ دیں دارد[11]

اس مرتبہ سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ زندانیوں کا کوئی تعلّق باہر کی دنیا سے نہ رہے، حتّٰی کہ باہر کی پرچھائیں بھی یہاں نہ پڑنے پائے۔ غالباً ہمارا محل قیام بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اب گویا احمد نگر بھی جنگ کے پُراسرار مقامات کی طرح "سم ور ان انڈیا"[12] (in India) کے حکم میں داخل ہو گیا۔ دیکھیے، ناسخ کا ایک فرسودہ شعر یہاں کام دے گیا ہے:

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھُدے نام ہمارا[13]

قلعہ کی جس عمارت میں ہم رکھے گئے ہیں، یہاں غالباً چھاؤنی کے افسر رہا کرتے تھے۔ گاہ گاہ جنگی قیدیوں کے لیے بھی اسے کام میں لایا گیا ہے۔ جنگ بوئر[14] کے زمانے میں جو قیدی ہندوستان لائے گئے تھے، ان کے افسروں کا ایک گروہ یہیں رکھا گیا تھا۔ گذشتہ جنگ میں بھی ہندوستان کے جرمن یہیں نظر بند کیے گئے، اور موجودہ جنگ میں بھی اطالوی افسروں کا ایک گروہ جو مصر سے لایا گیا تھا، یہیں نظر بند رہا۔

چیتہ خان کہتا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فوجی افسروں کی ٹرننگ کی ایک کلاس کھولی گئی تھی۔ کل میرے کمرے میں الماری ہٹا کر اس نے دکھایا کہ ایک بڑا سیاہ بورڈ دیوار پر بنا ہے۔ میں نے جی میں کہا، غالباً اسی لیے ہمیں یہاں لاکر رکھا گیا ہے کہ ابھی درسگاہِ جنون و وحشت کے کچھ سبق باقی رہ گئے تھے:

دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم
نہ دانم کے سبق آموز خواہم شد بہ دیوانش[15]

احاطہ کے مغربی رُخ پر جو کمرے ہیں اور جو ہمیں رہنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ ان کی کھڑکیاں قلعہ کے احاطہ میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشندان بھی ہیں۔ اس خیال سے کہ ہماری طرح ہماری نگاہیں بھی باہر نہ جا سکیں، تمام کھڑکیاں دیواریں چن کر بند کر دی

گئی ہیں۔ دیواریں ہمارے آنے سے ایک دن پہلے چنی گئی ہونگی۔ کیونکہ جب ہم آئے تھے، تو سفیدی خشک نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ پڑ جاتا تو اپنا نقش بٹھا دیتا، اور نقش اس طرح بیٹھتا کہ پھر اٹھتا نہیں؛

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سیہ کاغذِ نم اٹھ نہیں سکتا[16]

دیواریں اس طرح چنی ہیں کہ اوپر تلے، داہنے بائیں، کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا؛ روشندان تک چھپ گئے۔ بظاہر ہے کہ اگر کھڑکیاں کھلی بھی ہوتیں، تو کون سا بڑا میدان سامنے کھل جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قلعہ کی سنگی دیواروں تک نگاہیں جاتیں، اور ٹکرا کر واپس آجاتیں؛ لیکن ہماری نگاہوں کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی گئی، روشندان کے آیینے تک بند کر دیے گئے؛

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا، بے پر و بالی نے مجھے[1]

قلعہ کے دروازے کی شب و روز پاسبانی کی جاتی ہے اور قلعہ کے اندر بھی مسلّح سنتری چاروں طرف پھرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہماری حفاظت کے لیے مزید روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے احاطہ کا شمالی رُخ پہلے کھلا تھا؛ اب دس دس فٹ اونچی دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان میں دروازہ بنایا گیا ہے، اور اس دروازے پر بھی رات دن مسلّح فوجی پہرہ رہتا ہے۔ فوج یہاں تمام تر انگریز سپاہیوں کی ہے، وہی ڈیوٹی پر لگائے جاتے ہیں۔ جیلر اور ایک وارڈر کے سوا جسے بازار سے سودا سلف لانے کے لیے نکلنا پڑتا ہے، اور کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کوئی دروازے پر سے گذرے، سنتری کو جامہ تلاشی دے۔ وارڈر کو ہر مرتبہ برہنہ ہو کر تلاشی دینی پڑتی ہے۔ وہ جیلر کے پاس جا کر روتا ہے، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ پہلے دن جیلر نکلا تھا، تو اس سے بھی جامہ تلاشی کا

مطالبہ کیا گیا تھا کہ " ایں ہم بچۂ شتر ست"۔
بازار سے سودا سلف لانے کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ قلعہ کے دروازے کے پاس فوجی ادارہ کا ایک دفتر ہے، یہاں کے سپرنٹنڈنٹ کا آفس ٹیلیفون کے ذریعہ اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جب بازار سے کوئی چیز آتی ہے تو پہلے وہاں روکی جاتی ہے، اور اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پھر وہاں کا متعینہ افسر سپرنٹنڈنٹ کو فون کرتا ہے کہ فلاں چیز اس طرح کی اور اس شکل میں آئی ہے۔ مثلاً ٹوکری میں ہے، رومال میں بندھی ہے، یا ٹین کا ڈبہ ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر یہاں سے جیلر احاطہ کے دروازے پر جاتا ہے اور نشان زدہ سامان سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں اٹھوالے جاتا ہے۔ اب یہاں پھر دوبارہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اگر ٹوکری ہے تو اسے خالی کر کے اس کا ہر حصہ اچھی طرح دیکھ لیا جائیگا کہ ادھر ادھر کوئی پرچہ تو چھپا ہوا نہیں ہے شکر اور آٹے کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے کیونکہ ان کی تہ میں بہت کچھ چھپا کر رکھ دیا جاسکتا ہے! وارڈر جو پونا سے یہاں لائے گئے ہیں، وہ آئے تو تھے قیدیوں کی نگرانی کرنے، مگر اب خود قیدی بن گئے ہیں۔ نہ تو احاطہ سے باہر قدم نکال سکتے ہیں، نہ گھر سے خط و کتابت کر سکتے ہیں، جیلر کو بھی گھر خط لکھنے کی اجازت نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے، انہی راہوں سے کوئی خبر باہر پہنچ جائے۔ وہ رونا رہتا ہے کہ مجھے صرف ایک دن کی چھٹی ہی مل جائے کہ پونا ہو آؤں، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ یہاں جسے دیکھو، ہائے ہائے کر رہا ہے:

شبنم خرابِ مہر، کتاں سینہ چاکِ ماہ
لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں! [18]

اس صورتِ حال نے یہاں کی ضروریات کی فراہمی میں عجیب عجیب الجھاؤ ڈال دیتے ہیں۔ چیتہ خان جب دیکھو، کسی نہ کسی گرہ کے کھولنے میں الجھا ہوا ہے۔ مگر گرہیں ہیں، کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا اور پیش آیا باہر کا

کوئی آدمی رکھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ قیدی بن کر رہنے کیوں لگا! اور قیدیوں میں ضروری نہیں کہ باورچی نکل آئے۔ قیدی باورچی بھی مل سکتا ہے کہ پہلے کوئی قرینہ کا باورچی ذوقِ جرائم پیشگی میں اتنی ترقی کرے کہ پکڑا جائے، اور پکڑا بھی جائے کسی اچھے خاصے جرم میں کہ اچھی مدت کے لیے سزا دی جا سکے۔ لیکن ایسا حُسنِ اتفاق گاہ گاہ ہی پیش آسکتا ہے، اور آج کل تو سوءِ اتفاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے باورچیوں میں کوئی مردِ میدان رہا ہی نہیں۔ انسپکٹر جنرل جب آیا تھا تو کہتا تھا، یرودا جیل میں ہر گروہ اور پیشے کے قیدی موجود ہیں، مگر باورچیوں کا کال ہے۔ نہیں معلوم ان کمبختوں کو کیا ہوگیا ہے:

کس نہ دارد ذوقِ مستی، مے گساراں را چہ شد[19]

جو قیدی یہاں چن کر کام کے لیے بھیجے گئے ہیں، ان میں سے دو قیدیوں پر باورچی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے:

ستم رسیدہ یکے، نا اُمیدوارے[20]

حال آنکہ دونوں اس الزام سے بالکل معصوم واقع ہوئے ہیں اور زبانِ حال سے نظیری کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں۔ داد دیجیے گا۔ کہاں کی بات کہاں لا کر ڈالی ہے، اور کیا برمحل بیٹھی ہے:

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ بینمش — می آرم اعترافِ گناہِ نہ بودہ را[21]

چینی خان یہاں آتے ہی اس عقدۂ لاینحل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روز اپنی طلب و جستجو کی ناکامیوں کی کہانیاں سُناتا:

اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را[22]

ایک دن خوش خوش آیا اور یہ خبر سُنائی کہ ایک بہت اچھے باورچی کا شہر میں انتظام ہوگیا ہے، کلکٹر نے ابھی فون کے ذریعہ خبر دی ہے کہ کل سے کام پر لگ جائیگا:

صبا بہ خوش خبری ہُدہُدِ سلیمان ست — کہ مژدۂ طرب از گلشنِ سبا آورد[23]

دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طبّاخِ موعود یہی ہے؛

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید![24]

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آگیا، لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا، اور سراسیمہ حال تھا، جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو؛ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا:

اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا[25]

بعد کو اس معاملے کی جو تفصیلات کھلیں، ان سے معلوم ہوا کہ یہ شکار واقعی کلکٹر ہی کے جال میں پھنسا تھا۔ کچھ تو اُس کے زورِ حکومت نے کام دیا، کچھ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی ترغیب نے، اور یہ اجل رسیدہ دام میں پھنس گیا۔ اگر اُسے بعافیت قلعہ میں فوراً پہنچا دیا جاتا، تو ممکن ہے، کچھ دنوں تک جال میں پھنسا رہتا؛ لیکن اب ایک اور مشکل پیش آگئی۔ یہاں کے کمانڈنگ آفیسر سے باورچی رکھنے کے بارے میں ابھی بات چیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ پونا کے صدر دفتر کی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا، اور اس لیے اس شکار کو فوراً قلعہ کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اب اگر اسے اپنے گھر جانے کا موقع دیا جاتا ہے، تو اندیشہ ہے کہ شہر میں چرچا پھیل جائیگا؛ اور بہت ممکن ہے، کوئی موقع طلب اس معاملہ سے بروقت فائدہ اٹھا کر باورچی کو نامہ و پیام کا ذریعہ بنا لے۔ اگر روک لیا جاتا ہے، تو پھر رکھا کہاں جائے، کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ جگہ ہو، اور باہر کا کوئی آدمی وہاں تک نہ پہنچ سکے!

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا![26]

اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھیے، یا بے وقوفی کہ اسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قیدخانہ میں بھیج دیا، کیونکہ ان کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ

جگہ ہو سکتی تھی تو وہ قید خانہ کی کوٹھری ہی تھی۔ قید خانہ میں جو اُسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑینگے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی تیار ہو گیا:

کہ عشق آساں نمود اوّل، ولے افتاد مشکلہا[۲۷]

بہرحال دو دن تو اس نے کسی نہ کسی طرح نکال دیے، تیسرے دن ہوش و حواس کی طرح صبر و قرار نے بھی جواب دے دیا۔ میں صبح کے وقت کمرے کے اندر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں، جیسے باہر ایک عجیب طرح کا مخلوط شور و غل ہو رہا ہو۔ "مخلوط" اس لیے کہنا پڑا کہ صرف آوازوں ہی کا غل نہیں تھا، رونے کی چیخیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی آدمی دم گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہتا جاتا ہے، اور پھر بیچ بیچ میں روتا بھی جاتا ہے۔ گویا وہ صورتِ حال ہے جو خسرو نے سختی کشانِ عشق کی سنائی تھی کہ

قدرے گریدو ہم برسرِ افسانہ رود[۲۸]

باہر نکلا تو سامنے کے برآمدے میں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ چینۃ خان دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہے، سامنے باورچی زمین پر لوٹ رہا ہے، تمام وارڈرز حلقہ باندھے کھڑے ہیں، قیدیوں کی قطار صحن میں صف بستہ ہو رہی ہے، اور ہمارے قافلے کے تمام زندانی بھی ایک ایک کر کے کمروں سے نکل رہے ہیں۔ گویا اس خرابہ کی ساری آبادی وہیں سمٹ آئی ہے:

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں![۲۹]

چینۃ خان کہہ رہا ہے، تمھیں کوئی اختیار نہیں کہ یہاں سے نکلو۔ باورچی چیختا ہے کہ مجھے پورا اختیار ہے، تمھیں کوئی اختیار نہیں کہ مجھے روکو۔ جبر و اختیار (Determinis

(Freewill and) کا یہ مناظرہ سُن کر مجھے بے اختیار نعمت خان عالی کا وہ قطعہ یاد آگیا جو اس نے مختار خان کی ہجو میں کہا تھا اور جس کی شرح لکھنے میں صاحبِ خزانۂ عامرہ نے بڑی مغز پاشی کی ہے:[30]

ایں دلیل از جبر می آورد، اُو از اختیار
ایں سخن ہم درمیاں ماندہ ست امر بین بین[31]

باورچی ان لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ:

قومے بہ جدّ و جہد گرفتند وصلِ دوست[32]

مگر چینیہ خان اس پر زور دیتا تھا کہ

قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند[32]

جیلر نے خیال کیا کہ حقیقتِ حال کچھ ہی ہو، مگر بین الجبر والاختیار[*] " کا مذہب اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔ اُس کی نظر اشاعرہ کے "کسب"[33] اور شوپن ہارر (Schopenhauer) کے "ارادہ" پر گئی۔

گناہ اگرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظؔ!
تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من ست[34]

* یعنی "ڈٹرمن ازم" اور "فری وِل" کے درمیان راہ نکالنے کا مذہب جیسا کہ مسلمان متکلموں میں اشاعرہ نے اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں، اگرچہ انسان خدا کی قدرت کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا، مگر اسے "کسب" کی قوت حاصل ہے۔ یعنی ارادہ کے ساتھ کام کرنے اور اس کے اثرات کسب کرنے کی قوت حاصل ہے اگرچہ اُس کا ارادہ بھی خود اس کے بس کی چیز نہیں۔ دراصل اشاعرہ کا "کسب" بھی مذہبِ "جبر" کی ہی ایک دوسری تعبیر ہے۔ شوپن ہار نے اسی اعتقاد کو یوں تعبیر کیا کہ ہمارے تمام افعال کی تہ میں ہمارا ارادہ کام کرتا ہے، اگرچہ ہمارا ارادہ ہمارے اختیار میں نہیں۔

اس نے باورچی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی ہٹ ٹھیک نہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک مہینا نکال دو۔ پھر تمھیں گھر جانے کی اجازت مل جائیگی:

مُرغِ زیرک چوں بہ دام افتد، تحمّل بایدش[۳۵]

لیکن اس کا معاملہ اب نصیحت پذیریوں کی حد سے گذر چکا تھا:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے[۳۶]

ایک مہینے کی بات جو اس نے سُنی، تو اور کپڑے پھاڑنے لگا:

دل سے دیوانے کو مت چھیڑ، یہ زنجیر نہ کھینچ[۳۷]

شام کو چیتہ خان اس طرف آیا تو میں نے اُس سے کہا کہ اس طرح مجبور کر کے کسی آدمی کو رکھنا ٹھیک نہیں۔ اُسے فوراً رخصت کر دیا جائے۔ اگر اُسے جبراً رکھا گیا، تو ہم اُس کا پکایا ہوا کھانا چھونے والے نہیں۔ چنانچہ دوسرے دن اسے رہائی مل گئی۔ اتوار کے دن حسبِ معمول کلکٹر آیا، تو معلوم ہوا جس دن چھوٹا تھا۔ اسی دن اس نے اپنا بوریا بستر سنبھالا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں:

کردہ ام توبہ و از توبہ پشیماں شدہ ام   کافرم، باز [illegible] ہی کہ مسلماں شدہ [illegible]

یہ تو باورچی کی سرگذشت ہوئی، لیکن یہاں کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی نئی سرگذشت پیش نہ آتی ہو۔ باورچی کے بعد حجام کا مسئلہ پیش آیا۔ ابھی وہ حل نہیں ہوا تھا کہ دھوبی کے سوال نے سر اُٹھایا۔ چیتہ خان کا سارا وقت ناخن تیز کرنے میں بسر ہوتا ہے، مگر رشتہ کار میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ یہ وہی غالب والا حال ہوا:

پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اُمید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل[۳۸]

ابوالکلام

(۹)

حکایتِ بادہ و تریاک

قلعۂ احمد نگر
۲۷ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی، ایک اندر کی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
رُوے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است[1]

دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں:

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقہ زخشم ما یۂ طلا باف است[2]

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا، خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں:

تا کے چو موج بحر بہر سو شتافتن
در عینِ بحر پاے چو گرداب بند کن[3]

لیکن جونہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے، میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریمِ دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے، تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انھیں پھر سے آراستہ کر دوں:

وقفِ است دگر بُت کدہ سازند حرم را[۴]

اس تحوّلِ صورت (Metamorphism) کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے، اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکینگی؛ لیکن خود میرے فریبِ حال کے لیے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں، اور جب تک اُس کے سُراغ میں نہ نکلوں، اُسے واپس نہیں لا سکتا:

دل کہ جمع ست، غم از بے سر و سامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست[۵]

اگر آپ مجھے اُس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم، اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں۔ "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ" جس کا دستور العمل ہے:

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست ۔۔۔ بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داری ۔۔۔ خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست[۶]

میں نے قید خانے کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جُز

رواقیہ (Stoics) کا ہے ایک لذتیہ (Epicureans) کا:

پنبہ را آتشی ایں جا بہ شرار افتاد است![7]

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے اُن کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

ہر وقتِ بد کہ رُوے دہد آب سیل داں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کُند موجِ آب گیر[8]

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں:

ہر وقتِ خوش کہ دست دہد، مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجامِ کار چیست![9]

میں نے اپنے کاک تیل[10] (Cocktail) کے جام میں دونوں بوتلیں اونڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکّب کے تسکین نہیں پاسکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایتِ بادہ و تریاک میں نے تازہ کردی ہے:

چناں افیون ساقی در مے افگند
حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار[11]

البتّہ کاک تیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی اسے کام میں لاسکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermouth) اور جن[12] (Gin) کا مرکّب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمّل نہیں ہوسکینگے۔ مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

بادۂ آں درخورِ ہر ہوش نیست
حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست[13]

آپ کہینگے قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے۔ لیکن لذتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، انھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سروسامان کہاں میسّر آسکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤنگا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں میں لذتیہ سے اُن کا دماغ لے لیتا ہوں، جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے[14]

اور غور کیجیے، تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سروسامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے، خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے، وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زار کو میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ [15]

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا![16]

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے جہاں کہیں اپنے پَر کھول دیگا،[17] ایک چمنستانِ بوقلموں کھل جائیگا:

نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
بہر جا می روم، از خویش می جوشد تماشائے[18]

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں، تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئیگی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگیگی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائیگا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کرینگی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اُٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا[19]

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہانتاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے!

یہاں سرو سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں کھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہینگے، مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھینگے۔[20] حالانکہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عشرت و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھڑی کے اندر سمٹا ہوا مل جائے:

بغیرِ دل ہمہ نقش و نگارِ بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا ایں جاست [21]

ایوان و محل نہ ہوں، تو کسی درخت کے سایے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے، تو سبزۂ خودرُو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسّر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بُجھا سکتا ہے! اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں، تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائیگی، چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کریگی لیکن اگر دلِ زندہ پہلو میں نہ رہے، تو خدارا بتلایئے، اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں! اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چُولھے کے انگارے کام دینگے!

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تو نہ مَر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے [22]

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے! میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑیگی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اُجڑا، اور ساری دنیا اُجڑ گئی:

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد ست
"عالم نہ شود ویراں، تا میکدہ آباد ست" [23]

باہر کے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دیدمش خرّم و خنداں قدحِ بادہ بدست [24]
و اندراں آئینہ صدگونہ تماشا می کرد [25]
گفتمش "ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟"
گفت "آں روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد" [26]

آپ کو معلوم ہے، میں ہمیشہ صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر اُٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم

فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں، خواجۂ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہ ہوتی ہے کہ:

خورشیدِ مے زمشرقِ ساغر طلوع کرد
گر برگِ عیش می طلبی، ترکِ خواب کُن[۲۹]

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے۔ لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا، جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اُس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں، اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اُس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامانِ کار میں اُن کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا، اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین[۳۰] اور بورڈو کے صدسالہ نہ خانوں کے عرقِ کُہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا، جو چائے کے اس دَورِ صبحگاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیّا کر دیتا ہے:

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذّتِ شُربِ مدامِ ما![۳۰]

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے، تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے

لگا! میں جُرعہ کشانِ کُہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیونگا، اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لونگا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائیگا، تو کچھ دیر کے لیے رُک جاؤنگا؛ اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں، طول دونگا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤنگا، اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دونگا:

خوش تر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن
تا بہ بینیم، سرانجام چہ خواہد بودن![31]

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں۔ اُسی عالم میں ہوں، اور نہیں جانتا کہ ۹ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا، اور اب کیا ہو رہا ہے:

شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش
کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام ست نے گورش[32]

میرا دوسرا پُر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے، یا زیادہ صحتِ تعیّن کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں، تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چاے کا دَور تازہ کرتا ہوں، اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کرونگا، اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دونگا۔ گوشہ ہاے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں

کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں:

بازم بہ کُلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب
بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پُرشُدست[۳۳]

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے۔ اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی، اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

ناصحم گفت کہ، جُز غم چہ ہنر دارد عشق
گفتم "اے خواجۂ عاقل! ہنرے بہتر ازیں"؟[۳۴]

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے: "سب سے زیادہ دانشمند آدمی کون ہے؟" پھر جواب دیا ہے: "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے"۔ اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے:

نہ ہر درخت تحمّل کند جفاے خزاں
غلامِ ہمّتِ سروم کہ ایں قدم دارد![۳۵]

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی، کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں:

چو مہمانِ خراباتی، بعشرت باش با رنداں
کہ دردِ سرکشی جاناں، گر ایں مستی خمار آرد[۳۶]

۳۷

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندرے ژیدا (Andre' Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی، جو اُس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے: خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے، بلکہ ایک اخلاقی ذمّہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیّت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں:

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را ۳۸

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آ جائیگا، تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائینگے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے، وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اُٹھتی ہے، لیکن اسی ایک لہر سے بیشمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی؛ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں، اُس میں بھی دوسروں کا حصّہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکیگی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائینگے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں، اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عُرفی نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا:

بدیدارِ تو دل شاد ند باہم دوستانِ تو
ترا ہم شادماں خواہم، چو رُوئے دوستاں بینی ۳۹

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ، اور اخلاق۔ تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا؛ اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بُجھا دل اور سُوکھا چہرہ لے کر پھریگا، اتنا ہی زیادہ مذہبی،

فلسفی' اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدس' دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ زندگی کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلبیہ (Cynics) ہی کا شعار نہ تھا' بلکہ رواقی (Stoics) اور مشائی (Peripatetic) نقطۂ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ دلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اس کے مذہب طمانیت و مسرت (Eudemonism) اور مادّیاتی مذہبِ عشرت (Hedonism) کے تصوّرات مستثنیٰ کردیجیے، تو اس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سر گرروئی سے خالی نہیں ملیگا۔ مذہب اور روحانیت کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خنک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زُہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دینداری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قاآنی کو کہنا پڑا تھا:

اسبابِ طرب را ببر از مجلس بیروں
زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در[40]

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی، اُس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اس کی تصویر کھینچی تھی:

ہرچہ درجملہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن وارمنی و گبر و نصارا و یہود![41]

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہوجاتی ہے۔ اسی لیے بعض یارانِ بےتکلّف کو کہنا پڑا تھا:

در مجلسِ ما زاہد! زنہار تکلّف نیست
البتّہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سینکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑیگا، کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اُس مرقع میں کھپ نہیں سکتے، جو نقاشِ فطرت کے مُو قلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنّم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اُس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سُوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو، اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔ صائبؔ کیا خوب کہہ گیا ہے:

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی
کشادہ رُوے تر از رازہاے مستاں باش
تمیزِ نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست
چو چشمِ آیینہ، در خوب و زشت حیراں باش [۴۲]

ابوالکلام

(۱۰)

قلعۂ احمد نگر
۲۹ اگست ۱۹۴۲ء

ایں رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہدِ ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود [۱]

صدیقِ مکرم

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے۔ چاے کا فنجان سامنے دھرا ہے، اور طبیعت درازنفسی کے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکینگی۔ تاہم طبعِ نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سُن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ رُوے سخن آپ کی طرف ہے:

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما [۲]

بالسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے؛ یہی حال میرا ہے:

بہ فسانۂ ہوسِ طرب، تہی از خودیم و پُر از طلب
چہ دمد ز صنعتِ صِفرِ نَے بجز اینکہ نالہ فزوں کند [۳]

قید و بند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے، موجودہ تجربہ ان سب سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہوا۔ اب تک یہ صورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نجی خط و کتابت روکی نہیں جاتی

٭ بالسری میں جو سوراخ بنائے جاتے ہیں، انھیں فارسی میں 'صِفرِ نَے' کہتے ہیں، یعنی بالسری کے نقطے!

تھی۔ اخبارات دیے جاتے تھے، اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے، مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑجاتی تھیں۔ لیکن کان بند نہیں ہوجاتے تھے اور آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اسی دنیا میں بس رہا ہے، جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا:

زنداں [میں] بھی خیال بیاباں نورد تھا![5]

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں اُن لوگوں کو پریشان نہیں کرسکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کرے، تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اُسے پریشان نہیں کرسکیگا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کردی جاسکتی ہے، اور زندگی بہرحال بسر ہو ہی جاتی ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام!
زیں ہوسہا بگذر، یا نگذر، می گذرد[6]

یہ حالت انقطاع و تجرّد کا ایک نقشہ بناتی تھی، مگر نقشہ ادھورا ہوتا تھا کیونکہ نہ تو باہر کے علائق پوری طرح منقطع ہوجاتے تھے، نہ باہر کی صداؤں کو زنداں کی دیواریں روک سکتی تھیں:

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں، کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا[8]

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش آئی، اس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا۔ باہر کی

نہ صرف تمام صورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہوگئیں، بلکہ صدائیں بھی بیک دفعہ رک گئیں۔ اصحاب کہف کی نسبت کہا گیا ہے۔ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا[9] تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہوگئی۔ گویا جس دنیا میں بستے تھے، وہ دنیا ہی نہ رہی:

كَأَنْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَجُونِ إِلَى الصَّفَا
أَنِيسٌ وَلَمْ يَسْمُرْ بِمَكَّةَ سَامِرُ[10]

اچانک ایک نئی دنیا میں لاکر بند کر دیے گئے جس کا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا، اور جس کی ساری مردم شماری پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی، اسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی:

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب[11]

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا، تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدّت کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسبِ معمول علی الصّباح اٹھا اور جام و مینا کا دَور گردش میں آیا، تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دُور ہو رہا ہو،[12] اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ ہا، مخلص خان عالمگیری نے کیا خوب لفّ و نشر مرتّب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجیے:

خمارِ ما و درِ توبہ و دلِ ساقی
بیک تبسّمِ مینا شکست و بست و کُشاد[13]

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھو گئی ہے، مگر فکر و

تصوّر کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جاسکتے ہیں، تو کون ایسا زیان عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو:

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں[14]

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لیے موجبِ شکایت نہ ہو سکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا، اس کا آرزو مند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں، میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائیگی۔ بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاہِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ۔[15]
ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جاسکتے، اس لیے بہ تکلّف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے، مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کا مجوئیوں میں لگ گئی:

درخرابا تم نہ دیدستی خراب
بادہ پنداری کہ پنہاں می زنم[16]

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر[17] ضرور دیکھا ہوگا، جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے؛ اسے عام طور پر لال ڈِگّی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جا بیٹے تو اچھی خاصی جگہ

ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں، اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا، تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔[18] والد مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے: "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی، تو گھر سے نکلا کیوں؟" یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا، اور شاید اب بھی ہو، میں نے چن لیا تھا کیونکہ اس طرف لوگوں کا گذر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آجاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے:

عالمِ بے خبری، طُرفہ بہشتے بوداست
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم![19]

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں، اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کُن شہر تھا؛ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رُخ ہی نہیں کرتی تھی:

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیالِ ماہے
چہ کنم کہ نفسِ بدخو نکند بکس نگاہے[20]

والد مرحوم میرے اس شوقِ علم سے خوش ہوتے، مگر فرماتے: یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دیگا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری، مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا:

کہ گفتہ بود کہ در دش دوا پذیر مباد[21]

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا

تھا۔ اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدتمندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نو عمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خودپرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصہ میں بھی آئے ہوں کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے خود اپنے کمین میں بیٹھنا جیسا کہ عرفی نے کہا ہے، آسان نہیں:

خواہی کہ عیبہاے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش [۲۲]

لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جا رہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا، بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحّش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آ کر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈھتے ہیں، اور ملتی نہیں۔ مجھے گھر بیٹھے ملی، اور میں اس کا قدرشناس نہ ہو سکا:

دونوں جہان دے کے، وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں! [۲۳]

البتہ اب سوچتا ہوں تو یہ معاملہ بھی فائدہ سے خالی نہ تھا، اور یہاں کا کونسا معاملہ ہے جو فائدہ سے خالی ہوتا ہے! یہی فائدہ کیا کم ہے کہ جس غذا کے لیے دنیا کی طبیعتیں للچاتی

رہتی ہیں، اس سے پہلے ہی دن اپنا جی سیر ہو گیا اور طبیعت میں للچاہٹ باقی نہ رہی۔
فیضی نے ایک شعر ایسا کہا ہے کہ اگر اور کچھ نہ کہتا جب بھی فیضی تھا:

کعبہ را ویران مکن، اے عشق کانجا یک نفس
گہ گہے پس ماندگانِ راہ منزل می کنند[24]

طبیعت کی اس افتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لیے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں، تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو، اور زیادہ منّت گزار ہونے لگتا ہے کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوشحال کرتا ہے، میرے لیے بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں، تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا؛ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا، جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا:[25]

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ!
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما[26]

اسی طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے، تو اس حالت کی جو رکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیے اذیت کا موجب ہوتی ہیں، میرے لیے یکسوئی اور رجوعِ مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کر سکتیں۔ میں جب کبھی قید خانے میں سُنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے، تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے! اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے، تو کاش، ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جا سکیں!

حسد تہمتِ آزادیِ سَرو م بگداخت کیں مرادیست کہ بر تہمتِ آں ہم حسد ست[27]

ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھڑی[28] میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیار ہو گیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے، جہاں اور لوگ بھی رکھے جا سکیں، اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن حضرت سے کہا: آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی، مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی، وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھینی جا رہی ہے! یہ تو وہی غالب والا معاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے[29]

میں اپنی طبیعت کی اس افتاد سے خوش نہیں ہوں، نہ اسے حسن و خوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں[30]۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو، اور صحبت و اجتماع کی جگہ خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے:

حریفِ صافی و دُردی نہٗ، خطا اینجاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی، بلا اینجاست[31]

لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے توڑا جا سکتا ہے، مگر موڑا نہیں جا سکتا:

قطرہ از تشویشِ موجِ آخر نہاں شد در صدف
گوشہ گیری ہائے خلق از انفعالِ صحبت ست[32]

اس افتادِ طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مَورد رہتا ہوں، اور لوگوں کو حقیقتِ حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور و پندار پر محمول کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، میں دوسروں کو کمتر تصوّر کرتا ہوں، اس لیے ان کی طرف بڑھتا نہیں حال آنکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا، دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں! غنی کشمیری نے

ایک شعر کیا خوب کہا ہے۔[۳۳]

طاقتِ برخاستن از گردِ تمنا کم نہ ماند
خلق پندارد کہ مے خوردست و مست افتادہ است

سرخوش نے کلمات الشعراء میں جو شعر نقل کیا ہے، اس میں "خلق می داند" ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں، یہ محل "دانستن" کا نہیں ہے "پنداشتن" کا ہے؛ اس لیے "پندارد" زیادہ موزوں ہوگا اور عجب نہیں، اصل میں ایسا ہی ہو۔

بہرحال جو صورت حال پیش آئی ہے، اس سے جو کچھ بھی انقباضِ خاطر ہوا تھا، وہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ باہر کے علائق اچانک یک قلم قطع ہو گئے اور ریڈیو سٹ اور اخبار تک روک دیے گئے، ورنہ قید و بند کی تنہائی کا شکوہ نہ پہلے ہوا ہے، نہ اب ہے:

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا [۳۴]

اور پھر جو کچھ بھی زبانِ قلم پر طاری ہوا، صورتِ حال کی حکایت تھی، شکایت نہ تھی کیونکہ اس راہ میں شکوہ و شکایت کی تو گنجایش ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں اختیار ہے کہ اپنا سر ٹکراتے رہیں، تو دوسرے کو بھی اختیار ہے کہ نئی نئی دیواریں چُنتا رہے۔ بیدل کا یہ شعر موجودہ صورتِ حال پر کیا چسپاں ہوا ہے:

دوری و صلش طلسمِ اعتبارِ ما شکست
ورنہ ایں عجزے کہ می بینی، غبارِ ناز بود [۳۵]

اگرچہ یہاں تنہا نہیں ہوں، گیارہ رفیق ساتھ ہیں؛ لیکن چونکہ ان میں سے ہر شخص از راہِ عنایت میرے معمولات کا لحاظ رکھتا ہے، اس لیے حسبِ دلخواہ یکسوئی اور [خود] مشغولیت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دن بھر میں صرف چار مرتبہ کمرہ سے نکلنا پڑتا ہے کیونکہ کھانے کا کمرہ قطار کا آخری کمرہ ہے، اور چائے اور کھانے کے اوقات میں وہاں جانا ضروری ہوا۔ باقی

تمام اوقات کی تنہائی اور خود مشغولی بغیر کسی خلل کے جاری رہتی ہے:

خوش فرشِ بوریا و گدائی و خوابِ امن
کیں عیش نیست درخورِ اورنگ خسروی [۳۶]

زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے، تو کیا مضائقہ! وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اُسے سجاتا ہوں اور اُس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں:

آیینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما [۳۷]

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ صرف دو کتابیں میرے ساتھ آگئی تھیں، جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں، اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا تو لکھنے کے سامان میں کوئی کمی نہیں ہوئی، کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے:

در جنوں بیکار نتواں زیستن
آتشم تیز ست و داماں می زنم [۳۸]

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں، یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں:

بیکاری جنوں میں ہے، سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی [۳۹]

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا، وہ اس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا

جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لیے یہ ہیں کہ اخبار دیے جائینگے، قریبی رشتہ داروں کو خط بھیجا جا سکتا ہے، لیکن ملاقات کسی سے نہیں کی جا سکتی۔ چیتہ خاں نے یہاں کے فوجی مس (Mess) سے ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ منگوا لیا تھا؟ وہ اُس نے خط کے ساتھ حوالہ کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دنیا جو ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی، پھر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا، بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کیے:

ہے ایک خلق کا خوں، اشکِ خونفشاں پہ مرے
سکھائی طرز اُسے دامن اٹھا کے آنے کی [41]

میں نے چیتہ خان سے کہا کہ اگر ۹ اگست سے ۲۷ تک کے پچھلے پرچے کہیں سے مل سکیں، تو منگوا دے۔ اُس نے ڈھونڈھوایا، تو بہت سے پرچے مل گئے۔ رات دیر تک انھیں دیکھتا رہا تھا:

دیوانگاں ہزار گریباں دریدہ اند
دستِ طلب بہ دامنِ صحرا نمی رسد [42]

مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہوا کرتی:

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس [43]

میری دُکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی۔ لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔ دیکھیے، اس چھان لینے کے مضمون کو شریف خان شیرازی نے کہ جہانگیر کے عہد میں امیر الامراء ہوا، کیا خوب باندھا ہے:

شرر نالہ بہ غربالِ ادب می بیزم ۔۔۔ کہ بہ گوشِ تو مبادا رسد آواز درشت [44]

یہ وہی امیرالامراء ہے، جس کے حسبِ ذیل شعر پر جہانگیر نے شعرائے دربار سے غزلیں لکھوائی تھیں اور خود بھی طبع آزمائی کی تھی:

بجز رمیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر است [45]

ابوالکلام

(۱۱)

قلعۂ احمد نگر

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرّم

آج غالباً صبحِ عید ہے۔ عید کی تبریک آپ تک پہنچا نہیں سکتا، البتہ آپ کو مخاطب تصوّر کر کے صفحۂ کاغذ پر نقش کر سکتا ہوں:

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت
در راہِ دوست مرحلۂ قُرب و بُعد نیست
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

اپنی حالت کیا لکھوں:

خمیازہ سنجِ تہمتِ عیشِ رمیدہ ایم
مے آں قدر نہ بود کہ رنجِ خمار بُرد

معلوم نہیں، ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں! بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی، گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھیگی، جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح ابھر آئینگے کہ معلوم ہوگا، ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں۔

مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ، اور صفحہ کے ساتھ یہ تعیّن کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا، یا درمیانی سطروں میں، یا آخری سطروں میں؛ نیز صفحہ کا رُخ کہ دہنی طرف کا تھا، یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، حسبِ معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا:

کم لذّتم و قیمتم افزوں ز شمار ست
گوئی ثمرِ پیشتر از باغِ وجودم![2]

ساتھ ہی یاد آ گیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو اواخر عہدِ اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہان کے عہد تک زندہ رہا اور آفتابِ عالمتاب[3] میں نظر سے گذرا تھا غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتابِ عالمتاب دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہونگے؟ پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اُسے کھولا ہو۔

غور فرمائیے، کیا عمدہ مثال دی ہے! آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہونگے، مثلاً جاڑوں میں آم۔ چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے، نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے؛ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں، اور دوستوں کو بطور تحفہ کے بھیجتے ہیں۔ لیکن جو علّت اس کی تحفگی اور گرانی کی ہوئی، وہی بے لذّتی کی بھی ہو گئی۔ کھائیے تو مزہ نہیں ملتا۔ اور مزہ ملے تو کیسے ملے! جو موسم ابھی نہیں آیا، اُس کا میوہ ناوقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی، اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوہ کے حصّے میں آئے۔ تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے، اس لیے بیمزہ ہونے پر بھی بیقدر نہیں ہو جاتی۔ کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا؛ پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خریدینگے اور کہینگے، یہ جنسِ نایاب جتنی بھی گراں ہو ارزاں ہے!

غور کیجیے، تو انسان کے افکار و اعمال کی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے، موسم کے دماغ بھی اُگا کرتے ہیں۔ اور پھر جس طرح یہاں کا ہر فضائی موسم اپنے مزاج کی ایک خاص نوعیّت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق اس کی تمام پیداوار ظہور میں آتی رہتی ہے۔ اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے اور ضروری ہے کہ اسی کے مطابق طبیعتیں اور ذہنیتیں ظہور میں آئیں۔ لیکن چونکہ یہاں فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اس کی گاہ گاہ کی ناہمواریاں بھی ہوئیں اور یہاں کا کوئی قانون اپنے فلتات اور شواذ سے خالی نہیں، اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانۂ نشوونما کے کاروبار کا نقص کہیے، یا زمانہ کی غلط اندیشی وقت (Anachronism)، لیکن بہر حال ایسا ہوتا ضرور ہے۔ ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور میں آئینگی، تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لیے اجنبی ہونگی۔ نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکینگی، نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکیگا۔ تاہم چونکہ اُن کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہوتی ہے، اس لیے ناوقت کی چیز ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہوجاتیں۔ لوگوں کو مزہ ملے یا نہ ملے، لیکن ان کی گراں قیمتی کا اعتراف ضرور کرینگے۔ صدرائے شیرازی کی دقّتِ تخیّل نے اسی صورتِ حال کا سراغ لگایا، اور دو مصرعوں میں ایک بڑی کہانی سنادی۔

یہ شعر دُہراتے ہوئے مجھے خیال ہوا، میرا اور زمانہ کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیّت کا ہوا۔ طبیعت کی بے میل افتادِ فکر و عمل کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے چل نہ سکی۔ اسے وجود کا نقص کہیے۔ لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا، جو اوّل روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی، اور اس لیے وقت کی کوئی خارجی تاثیر اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے، اس ناوقت کے پھل میں کیا لذّت

پا سکتا تھا! لوگ کھاتے ہیں، تو مزہ نہیں ملتا۔ تاہم اس بے مزگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں ہی رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے نہ ملے، مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی:

متاعِ من کہ نصیبش مباد ارزانی ۴

بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے، جس کی مانگ ہوتی ہے۔ اور چونکہ مانگ ہوتی ہے، اس لیے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اسے قبول کرتی ہے۔ مگر میرا معاملہ اس سے بالکل اُلٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوئی، میری دکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ زمانہ کے روز بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈھ کر لائینگے، جن کا رواج عام ہو؛ میں نے ہمیشہ ایسی جنس ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کی جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لیے پسند و انتخاب کی جو علّت ہوئی، وہی میرے لیے ترک و اعراض کی علّت بن گئی۔ انھوں نے دکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں:

قمارش دست زد در شہر و دِہ زمن مطلب

متاعِ من ہمہ دریائی ست یا کانی ۵

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے:

در کوے ما شکستہ دلی می خرند و بس

بازارِ خود فروشی ازاں سوے دیگرست ۶

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا:

بارفیقانِ ز خودرفتہ سفر دست نداد
سیرِ صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم![7]

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا، تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا؛ اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی:

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگزارم
باآبلہ پایاں چہ کنم، قافلہ تیز ست![8]

اس تیز رفتاری سے تلووں میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن عجب نہیں، راہ کے کچھ خس و خاشاک بھی صاف ہو گئے ہوں:

خارہا از اثر گرمیِ رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہروان ست مرا[9]

اب اس وقت رشتۂ فکر کی گرہ کھل گئی ہے، تو یہ توقع نہ رکھیے کہ اسے جلد لپیٹ سکوں گا:

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز ست[10]

زندگی میں بہت سے حالات ایسے پیش آئے، جو عام حالات میں کم پیش آتے ہیں؛ لیکن معاملہ کا ایک پہلو ایسا ہے، جو ہمیشہ میرے لیے ایک معمہ رہا اور شاید دوسروں کے لیے بھی رہے۔ انسان اپنی ساری باتوں میں حالات کی مخلوق اور گرد و پیش کے مؤثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ مؤثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مخفی ہوتے ہیں اور تہ میں اتر کر انھیں ڈھونڈھنا پڑتا ہے، تاہم سراغ ہر حال میں مل جاتا ہے؛ نسل، خاندان، صحبت، تعلیم و تربیت، ان مؤثرات کے عنصری سرچشمے ہیں؛

عن المرءِ لا تسئل، وَسل عن قرینہ[11]

لیکن اس اعتبار سے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو بڑی حیرانی میں پڑ جاتا ہوں۔ فکر و طبیعت کی کتنی ہی بنیادی تبدیلیاں ہیں، جن کا کوئی خارجی سرچشمہ دکھائی نہیں دیتا، اور جو گرد و پیش کے تمام موثرات سے کسی طرح بھی جوڑے نہیں جا سکتے۔ کتنی ہی باتیں ہیں جو حالات و موثرات کے خلاف ظہور میں آئیں۔ کتنی ہی ہیں کہ ان کا ظہور سرتا سر متضاد شکلوں میں ہوا۔ دونوں صورتوں میں معاملہ ایک عجیب افسانہ سے کم نہیں:

فریادِ حافظ ایں ہمہ آخر بہ ہرزہ نیست
ہم قصۂ عجیب و حدیثے غریب ہست[12]

جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات و خصائل کا تعلق ہے، میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بیخبر نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادات و خصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی۔ ہر خاندان اپنی روایتی زندگی کی ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے اور وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اس روایتی زندگی کے اثرات میرے خمیر میں رچ گئے ہیں اور میں اُن کی پکڑ سے باہر نہیں جا سکتا۔ میری عادات و خصائل، چال ڈھال، طور طریقہ، امیال و اذواق ــــــ سب کے اندر خاندان کا ہاتھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خاندانی زندگی کی روایتیں مجھے میرے ددھیال اور ننھیال، دونوں سلسلوں سے ملیں؛ اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں؛ وہ بہر حال میرے حصے میں آنی تھیں، ان کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں میری خواہش اور پسند کو کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن یہاں سوال عادات و خصائل کا نہیں ہے، افکار و عقائد کا ہے؛ اور جب اس اعتبار سے

اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہوں، تو خاندان، تعلیم، ابتدائی گرد و پیش ـــــ کوئی گوشہ بھی میں کھلا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری مؤثرات کے جتنے بھی احوال وظروف (Environments) ہوسکتے ہیں اُن میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے لاتا ہوں اور اُن میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہوں، مگر مجھے اپنا سُراغ کہیں نہیں ملتا!

میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد وافکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ سخت اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا کفر و زندقہ تصوّر کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سنیں، وہ بھی سرتا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور میرا دماغی ورثہ اس تصلّب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی، جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چاردیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گذر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا، وہ بھی وہی تھے، جنھیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ ان کے معیارِ عقائد وفکر پر پورے اتر سکتے ہیں۔ اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ ان کے معاصروں میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہوسکتی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس دروازہ سے بھی کسی نئی ہوا کے گذرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلّق ہے، میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دُور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی، اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچا ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے۔ لیکن میری سوسائٹی اوائل عمر میں گھر کی چاردیواری کے اندر محدود رہی، اور گھر کے

عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی، تو خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے؛ یا رجعت قہقری کر کے پیچھے ہٹتے، اور دُور مؤدّب ہو کر بیٹھ جاتے۔ یہ فضا صورتِ حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی جگہ اور زیادہ اُسے گہری کرتی رہتی۔ والد مرحوم کے مُریدوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانہ میں اکثر ان کا مجمع رہتا، مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر اسی خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا؛ کسی دوسرے رنگ کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

علاوہ بریں مرید اور معتقد جب کبھی مجھ سے ملتے تھے، تو مجھے مرشد زادہ سمجھ کر منتظر رہتے تھے کہ مجھ سے کچھ سنیں؛ وہ مجھے سنانے کی گستاخانہ جرأت کب کر سکتے تھے!

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ سے واسطہ پڑتا۔ مدرسہ کی تعلیمی زندگی گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسۂ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابلِ وقعت تھی بھی نہیں؛ اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انھیں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں۔ یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے، گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ملا ہی نہیں۔ بلاشبہہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے۔ لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں، جب کہ طالبِ علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی

تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا۔
پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا! اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے، تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں! اور آپ کے لیے تفصیل ضروری نہیں۔ ایک ایسا فرسودہ نظامِ تعلیم جسے فنِ تعلیم کے جدید نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سرتاسر عقیم ہو چکا ہے: طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخابِ کتب کے اعتبار سے ناقص، درس و املا کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص۔ اگر فنونِ آلیہ کو الگ کر دیا جائے، تو درسِ نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں: علومِ دینیہ اور معقولات۔ علومِ دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے، اُس سے اُن کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو، لیکن خود ان علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے، تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے، اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں[13] کہ تاریخ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے، حال آنکہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنونِ ریاضیہ جس قدر پڑھائے جاتے ہیں، وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں، اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے؛ میں نے اپنے شوق سے پڑھا تھا۔ جامعِ ازہر قاہرہ کے نصابِ تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتبِ معقولات کو فروغ ہوا۔ وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی:

اے طبلِ بلند بانگ، در باطن ہیچ![14]

سید جمال الدین اسد آبادی[15] نے جب مصر میں کتبِ حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں، اور علمائے ازہر ان کتابوں کے

ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ بلا شبہہ اب ازہر کا نظامِ تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے؛ لیکن جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت تک اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی، اور شیخ محمد عبدہ[۲۷] مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درسگاہ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی تھی۔

فرض کیجیے، میرے قدم اسی منزل میں رک گئے ہوتے، اور علم و نظر کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈھی گئیں، ان کی لگن پیدا نہ ہوئی ہوتی، تو میرا کیا حال ہوتا! ظاہر ہے کہ تعلیم کا ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے، میرا معاملہ اس سے مختلف رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۰۰ء میں جب میری عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی، میں فارسی کی تعلیم سے فارغ، اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا اور شرح ملّا اور قطبی وغیرہ کے دور میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں میرے مرحوم بھائی مجھ سے عمر میں دو برس بڑے تھے۔ باقی اور جتنے تھے، ان کی عمریں بیس اکیس برس سے کم نہ ہونگی۔ والد مرحوم کا طریقِ تعلیم یہ تھا کہ ہر علم میں سے پہلے کوئی ایک مختصر متن حفظ کر لینا ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ[۱۸] (رحمۃ اللہ علیہ) کے خاندان کا طریقِ تعلیم ایسا ہی تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں، میں نے فقہ اکبر، تہذیب، خلاصۂ کیدانی وغیرہا بر زبان حفظ کر لی تھیں، اور اپنے بر وقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں کو بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے گیارہ بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اڑتے، تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں انھیں منطق کے قضیوں اور اصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکا بکا کر دیتا۔ اس طریقہ کے فائدہ میں کلام نہیں۔ آج تک ان متون کا ایک ایک لفظ حافظہ میں محفوظ ہے۔ خلاصۂ کیدانی کی لوح کا شعر تک بھولا نہیں؛ کسی

افغانی ملّانے "کے دانی" اور کیدانیؒ کی تُک بندی کی تھی:

تو طریقِ صلوٰۃ کے دانی
گر نہ خوانی خلاصہ کیدانی

کتابوں کی درسی تحصیل کی مدّت بھی عام رفتار سے بہت کم رہا کرتی تھی۔ اساتذہ میری تیز رفتاریوں سے پہلے جھنجھلاتے، پھر پریشان ہوتے، پھر مہربان ہو کر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دَور شروع ہوتا، تو باہر کے چند طلبا بھی شریک ہو جاتے۔ لیکن ابھی چند دن بھی گذرنے نہ پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا، کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میرے معقولات کے ایک اُستاد لوگوں سے کہا کرتے تھے: "یہ چھوٹے حضرت مجھے آج کل صدرا سنایا کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں۔"

۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا، میں درسِ نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والد مرحوم کی ایما[19] سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں۔ چونکہ تعلیم کے باب میں قدیم خیال یہ تھا کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے، استعداد پختہ نہیں ہوتی، اس لیے فاتحۂ فراغ کی مجلس ہی میں طلبا کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا؛ اور ان کے مصارفِ قیام کے والد مرحوم کفیل ہو گئے۔ میں نے تکمیلِ فن کے لیے طب شروع کر دی تھی۔ خود قانون پڑھتا تھا اور طلبا کو مطوّل، میر زاہد اور زاہد آیہ وغیرہ کا درس دیتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا، اور شک و شبہہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے؛ اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے، جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں، جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چُنی تھیں، یہ یک دفعہ متزلزل ہوگئیں؛ اور پھر وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چُننی پڑیں:

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم در آں روزے کہ خرمن داشتم[۲۰]

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک، اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی، جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا، اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے، اُس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کریگا، مگر اُسے چھونے کی جرأت نہیں کریگا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دیگی، لیکن اُس کی بناوٹ کے اندر نہیں اُتریگی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہیگا۔

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی؛ وہ سر تا سر اُسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جو مؤثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیے تھے، تعلیم نے انھیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انھیں اور زیادہ سہارے دیے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا، وہ اسی تقلید کے خلاف تھا! میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں، مگر بار بار یہی سوال سامنے

اُبھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو! یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا، کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے؛ جب بنیاد ہل گئی، تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی! کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارے دیتی رہیں لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا:

ازاں کہ پیروِی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست[۲۱]

شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیلِ راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا، مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی، اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ گویا جس علت نے بیمار کیا تھا، وہی بالآخر داروے شفا بھی ثابت ہوئی:

دردہا دادی و درمانی ہنوز[۲۲]

ہر چند سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ یہ کانٹا کہاں سے اُڑا تھا کہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو گیا، مگر کوئی پتا نہیں لگتا، کوئی تعلیل کام نہیں دیتی:

چہ مستی است نہ دانم کہ رُو بما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد[۲۳]

بلاشبہ آگے چل کر کئی حالات ایسے پیش آئے، جنھوں نے اس کانٹے کی چبھن اور زیادہ گہری کر دی، لیکن اُس وقت تو کسی خارجی محرک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی۔ اور ہوش و آگہی کی عمر ہی نہ تھی کہ باہر کے مؤثرات کے لیے دل و دماغ کے دروازے کھل سکتے۔ یہ تو وہ حال ہوا کہ:

اتانی هواها قبل ان اعرف الهوی
فصادف قلباً فارغاً فتمکنا[24]

یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چُبھنے لگی، اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحّش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اس وقت محسوس نہیں کرتا تھا، مگر طبیعت کا ایک قدرتی تقاضہ تھا جو ان باتوں کے خلاف لے جارہا تھا:

بُوے آں دُود کہ امسال بہ ہمسایہ رسید
زآتشے بود کہ درخانۂ من پار گرفت[25]

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور مؤثرات کے خلاف طبیعت کی یہ افتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی؟ خاندان عقائد و افکار کا جو سانچا ڈھالنا چاہتا تھا، نہ ڈھال سکا۔ تعلیم جس طرف لے جانا چاہتی تھی، نہ لے جاسکی۔ حلقۂ صحبت و اثرات[26] کا جو تقاضہ تھا، پورا نہ ہوا۔ اس عالمِ اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی علّت سے بندھا ہوتا ہے۔ آخر اس رشتہ کا بھی تو کوئی سرا ملنا چاہیے! واقعہ یہ ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ میری نظر کی کوتاہی ہو، اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے، تو کوئی نہ کوئی محرک ڈھونڈھ نکالے؛ مگر مجھے تو تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑا:

کار زلفِ تست مشک افشانی، امّا عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوے چیں بستہ اند[27]

جس نامراد ہستی کو چودہ برس کی عمر میں زمانہ کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو، وہ اگر کچھ عرصہ کے لیے شاہراہِ عام سے گم ہو کر آوارۂ دشتِ وحشت نہ ہوتی، تو اور کیا ہوتا! ایک عرصہ تک طرح طرح کی سرگردانیوں میں نشانِ راہ گم رہا؛ نہ مقصد کی خبر مل سکی نہ منزل کی:

سگِ آستانم، امّا ہمہ شب قلادہ خایم
کہ سرِ شکار دارم، نہ ہوائے پاسبانی
عجب ست، اگر نہ باشد خضرے بہ جستجویم
کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلالِ زندگانی[۲۸]

لیکن جس ہاتھ نے زمانہ کی آغوش سے کھینچا تھا، بالآخر اُسی نے دشت نوردیوں کی تمام بیراہ رویوں میں رہنمائی بھی کی، اور اگرچہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑا، اور چپہ چپہ پر کانٹوں سے اُلجھنا پڑا، مگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف بڑھائے لے گئی اور جستجو نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رُک کر دم لے لے۔ بالآخر دم لیا تو اس وقت لیا، جب منزلِ مقصود سامنے جلوہ گر تھی، اور اس کی گردِ راہ سے چشمِ تمنائی روشن ہو رہی تھی:

بہ وصلش تا رسم، صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم[۲۹]

چوبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چُن رہا تھا:

در بیاباں گر بہ شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مُغیلاں، غم مخور![۳۰]

گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانہ سے اُلٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا:

کام تھے عشق میں بہت، پر میر!
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے[۳۱]

اُس وقت سے لے کر آج تک کہ کاروانِ باد رفتارِ عمر منزلِ خمسین سے بھی گزر چکا،

فکر و عمل کے بہت سے میدان نمودار ہوئے اور اپنی راہ پیمائیوں کے نقوش جا بجا بنانے پڑے۔ وقت یا تو انھیں مٹا دیگا جیسا کہ ہمیشہ مٹاتا رہا ہے، یا محفوظ رکھیگا جیسا کہ ہمیشہ محفوظ رکھتا آیا ہے:

آیینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما! [۳۲]

یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے تھے جنھیں ابوطالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتلا دیا ہے:

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت [۳۳]

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا؛ ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا:

کارِ مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم! [۳۴]

جو نامراد یہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ نہ تو راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں، نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بیخبر ہوتے ہیں؛ تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں، کیونکہ قدم اٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناموافقتوں اور بے امتیازیوں کے ساتھ بار بار سامنے آتا ہے، اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر دامنِ عزم و ہمت سے الجھنا چاہتی ہیں؛ تاہم اُن کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ زمانہ کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے، لیکن زمانہ کے اوپر سے گزر جا سکتے تھے، اور بالآخر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں:

وقت عرفی خوش، کہ نکشود در گردد بر رخش
بردرِ نکشودہ ساکن شد، درِ دیگر نہ زد! [۳۵]

اب صبحِ عید نے اپنے چہرہ سے صبحِ صادق کا ہلکا نقاب بھی اُلٹ دیا ہے اور بے حجابانہ مسکرا رہی ہے:

اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا [36]

میں اب آپ کو اور زیادہ اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش نہیں کرونگا کیونکہ صبحِ عید کی اس جلوہ نمائی کا آپ کو جواب دینا ہے۔ کئی سال ہوئے، ایک مکتوبِ گرامی میں شبہائے رمضان کی "عنبریں جائے" کا ذکر آیا تھا۔ بیمحل نہ ہوگا اگر اس کے جُرعہ ہائے پیہم [37] سے قبلِ صلوٰۃِ عید افطار کیجیے کہ عید الفطر میں تعجیل مسنون ہوئی اور عید اضحیٰ میں تاخیر: [38]

عید ست و نشاط و طرب و زمزمہ عام ست
مے نوش، گنہ بر من اگر بادہ حرام است!
از روزہ اگر کوفتۂ، بادہ روا گیر
ایں مسئلہ حل گشت ز ساقی کہ امام است! [39]

ابوالکلام

(۱۲)

قلعۂ احمد نگر
۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء

از بہرِ چہ گویم "ہست"، از خود خبرم چوں نیست
وز بہرِ چہ گویم "نیست"، با او نظرے چوں ہست

صدیقِ مکرم

صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ اس وقت لکھنے کے لیے قلم اٹھایا، تو معلوم ہوا سیاہی ختم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ سیاہی کی شیشی خالی ہو چکی تھی؛ نئی شیشی منگوانی تھی، مگر منگوانا بھول گیا۔ میں نے سوچا، تھوڑا سا پانی کیوں نہ ڈال دوں! یکایک چائے دانی پر نظر پڑی۔ میں نے تھوڑی چائے فنجان میں اونڈیلی اور قلم کا منھ اس میں ڈبو کر پچکاری چلا دی، پھر اسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھوون پوری طرح نکل آئے اور اب دیکھیے روشنائی کی جگہ چائے کے تند و تیز گرم عرق سے اپنے نفسہائے سرد صفحۂ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں:

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما
جوشِ آتش بود امروز بہ فوارۂ ما[1]

طبیعت افسردہ ہوتی ہے تو الفاظ بھی افسردہ نکلتے ہیں۔ میں طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں۔ آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا:

ایں کہ در جام وسبو دارم مہیا آتش ست[2]

آپ اس طریقِ کار پر متعجب نہ ہوں۔ آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے فیضی کو بھی یہی

طریقہ کام میں لانا پڑا تھا۔ نل ذمن میں اُس نے ہمیں خبر دی ہے:

"تا تازہ و تر زنم برقسم را
در بادہ کشیدہ ام قلم را"[3]

آج بھی جام وہی ہے، جو روز گردش میں آتا ہے، لیکن جام میں جو کچھ اونڈیل رہا ہوں اس کی کیفیتیں کچھ بدلی ہوئی پائیے گا:

از مے دوشین قدرے تُند تر[4]

بارہا مجھے خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کارخانۂ ہستی کے معمّے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے:

آں کہ ایں نامۂ سربستہ نوشتہ است نخست
گرہے سخت بہ سر رشتۂ مضموں زدہ است[5]

اگر ایک اُلجھا ہوا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں اس کے حل کی جستجو ہوتی ہے، تو ہم کیا کرتے ہیں؟ ہمارے اندر بالطبع یہ بات موجود ہے اور منطق اور ریاضی نے اسے راہ پر لگایا ہے کہ ہم الجھاؤ پر غور کرینگے۔ ہر الجھاؤ اپنے حل کے لیے ایک خاص طرح کے تقاضے کا جواب چاہتا ہے۔ ہم کوشش کرینگے کہ ایک کے بعد ایک طرح طرح کے حل سامنے لائیں اور دیکھیں، اس تقاضا کا جواب ملتا ہے یا نہیں! پھر جونہی ایک حل ایسا نکل آئیگا جو الجھاؤ کے سارے تقاضوں کا جواب دے اور معاملہ کی ساری کلیں ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائینگی، ہمیں پورا پورا یقین ہو جائیگا کہ اُلجھاؤ کا صحیح حل نکل آیا اور صورتِ حال کی یہ اندرونی شہادت ہمیں اس درجہ مطمئن کر دیگی کہ پھر کسی بیرونی شہادت کی احتیاج باقی نہیں رہیگی۔ اب کوئی ہزار شبہے نکالے، ہمارا یقین متزلزل ہونے والا نہیں۔

فرض کیجیے، کپڑے کے ایک تھان کا ٹکڑا کسی نے پھاڑ لیا ہو اور ٹکڑا اس طرح پھٹا ہو
اس طرح ٹیڑھا ترچھا اور دندانہ دار ہو کر کہ جب تک ویسے ہی اُلجھاؤ کا ایک ٹکڑا
وہاں آ کر بیٹھتا نہیں، تھان کی خالی جگہ بھرتی نہیں۔ اب اُسی کپڑے کے بہت سے
ٹکڑے ہمیں مل جاتے ہیں اور ہر ٹکڑا وہاں بٹھا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس خلا کی نوعیت کا
تقاضا پورا ہوتا ہے یا نہیں، مگر کوئی ٹکڑا ٹھیک بیٹھتا نہیں۔ اگر ایک گوشہ میل کھاتا
ہے تو دوسرے گوشے جُڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکڑا ایسا نکل آتا ہے کہ
ٹیڑھے ترچھے کٹاؤ کے سارے تقاضے پورے کر دیتا ہے اور صاف نظر آ جاتا ہے کہ صرف
اسی ٹکڑے سے یہ خلا بھرا جا سکتا ہے۔ اب اگرچہ اس کی تائید میں کوئی خارجی شہادت
موجود نہ ہو، لیکن ہمیں پورا یقین ہو جائیگا کہ یہی ٹکڑا یہاں سے پھاڑا گیا تھا اور اس
درجہ کا یقین ہو جائیگا کہ لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً! ۲

اس مثال سے ایک قدم اور آگے بڑھائیے، اور گورکھ دھندے کی مثال سامنے لائیے۔
بیشمار طریقوں سے ہم اسے مرتّب کرنا چاہتے ہیں مگر ہوتا نہیں۔ بالآخر ایک خاص ترتیب
ایسی نکل آتی ہے کہ اس کے ہر جُز کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کی چُول ٹھیک ٹھیک
بیٹھ جاتی ہے۔ اب گو کوئی خارجی دلیل اس ترتیب کی صحت کی موجود نہ ہو، لیکن یہ
بات کہ صرف اسی ایک ترتیب سے اس کا الجھاؤ دور ہو سکتا ہے، بجائے خود ایک ایسی
فیصلہ کن دلیل بن جائیگی کہ پھر ہمیں کسی اور دلیل کی احتیاج باقی ہی نہیں رہیگی۔
اُلجھاؤ کا دور ہو جانا اور ایک نقش کا بن جانا بجائے خود ہزاروں دلیلوں
کی ایک دلیل ہے!

اب علم و تیقن کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور ایک تیسری مثال سامنے لائیے۔
آپ نے حرفوں کی ترتیب سے کھلنے والے قفل دیکھے ہونگے؛ انھیں پہلے قفلِ ابجد کے نام
سے پکارتے تھے ایک خاص لفظ کے بننے سے وہ کُھلتا ہے، اور وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب

ہم طرح طرح کے الفاظ بناتے جائینگے، اور دیکھینگے کہ کُھلتا ہے یا نہیں! فرض کیجیے ایک خاص لفظ کے بنتے ہی کُھل گیا۔ اب کیا ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو جائیگا کہ اسی لفظ میں اس قفل کی کنجی پوشیدہ تھی! جستجو جس حل کی تھی، وہ قفل کا کُھلنا تھا۔ جب ایک لفظ نے قفل کھول دیا، تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا جس کی مزید جستجو ہو!

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اس طلسمِ ہستی کے معمّے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمّہ کا حل ڈھونڈھ رہا ہے، لیکن اس پُرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق اس طرح کھو یا گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی، نہ اسی کا سراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جاکر ہوگی؟ اور کیونکر ہوگی؟

اوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتادست![8]

زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اور اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جاکر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے" تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی، یا نہیں؟

مُردم در انتظار و دریں پردہ راہ نیست   یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد[9]

اُس وقت سے لے کر جب کہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال نکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک، جب کہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بیشمار چہرے بےنقاب دیکھ رہا ہے، انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں، مگر یہ معمّہ، معمّہ ہی رہا:

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من   وِیں حرفِ معمّہ نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من و تو   چوں پردہ بر اُفتد، نہ تو مانی و نہ من[10]

ہم اس اُلجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سُلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں، وہ اور زیادہ اُلجھتا جاتا ہے۔ ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے، اُسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں، لیکن جب وہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، سو پردے اور اُس کے پیچھے پڑے تھے اور جو پردہ ہٹا تھا، وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا، بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا۔ ایک سوال کا جواب ابھی مل نہیں چکتا کہ دس نئے سوال سامنے آکھڑے ہوتے ہیں"۔ ایک راز ابھی حل نہیں ہو چکتا کہ سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں!

درین میدانِ پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی[۱۲]

انسٹائن[۱۳] (Einstein) نے اپنی ایک کتاب[۱۴] میں سائنس کی جستجوے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز[۱۱] کی سراغرسانیوں سے تشبیہ دی ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نہایت معنی خیز تشبیہ دی ہے۔ علم کی یہ سراغرسانی فطرت کی غیر معلوم گہرائیوں کا کھوج لگانا چاہتی تھی، مگر قدم قدم پر نئے نئے مرحلوں اور نئی نئی دشواریوں سے دوچار ہوتی رہی۔ ذی مقراطیس[۱۵] (Democritus) کے زمانہ سے لے کر جس نے چار سو برس قبل مسیح مادّہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی آج تک، جب کہ نظریۂ مقادیرِ عنصری (Quantum Theory) کی رہنمائی میں ہم سالمات کا از سرِ نو تعاقب کر رہے ہیں، علم کی ساری کدوکاوش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ پچھلی گتھیاں سُلجھی گئیں، نئی نئی گتھیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس ڈھائی ہزار برس کی مسافت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سراغ پالیا، جو اثنائے سفر میں نمودار ہوتی رہیں؛ لیکن حقیقت کی وہ آخری منزلِ مقصود جس کے سراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا، آج بھی اُسی طرح غیر معلوم

---

۵ "دی ایویلیوشن آف فزیکس" جس کی ترتیب میں لیوپولڈ انفلیڈ بھی شریک تھا۔

ہے، جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی۔ ہم جس قدر اُس سے قریب ہونا چاہتے ہیں، اُتنا ہی وہ دُور ہوتی جاتی ہے:

بامن آویزشِ اُو الفتِ موج ست و کنار
دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من[16]

دوسری طرف ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس کھول رہی ہے جو اس معمۂ ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے۔ ہم کتنا ہی اسے دبانا چاہیں مگر اس کی تپش لبوں پر آہی جائیگی۔ ہم بغیر ایک حل کے سکونِ قلب نہیں پاسکتے۔ بسا اوقات ہم اس دھوکے میں پڑجاتے ہیں کہ کسی تشفی بخش حل کی ہمیں ضرورت نہیں، لیکن یہ محض ایک بناوٹی تخیل ہوتا ہے اور جونہی زندگی کے قدرتی تقاضوں سے ٹکراتا ہے پاش پاش ہوکر رہ جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے مفکروں کے تازہ ترین آثار کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے موجودہ جنگ نے ان تمام دماغوں میں جو کل تک اپنے آپ کو مطمئن تصور کرنے کی کوشش کرتے تھے کیسا تہلکہ مچا رکھا ہے! ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ پروفیسر جوڈ[17] (Joad) کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اُن تمام فیصلوں پر جو ہم نے مذہب اور خدا کی ہستی کے بارے میں کیے تھے، اب از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ یہ پروفیسر جوڈ کا بعد از جنگ کا اعلان ہے، لیکن پروفیسر جوڈ کے قبل از جنگ کے اعلانات کس درجہ اس سے مختلف تھے! برٹرنڈرسل[18] (Bertrand Russell) نے بھی گزشتہ سال ایک مطوّل مقالہ میں جو بعض امریکی رسائل میں شائع ہوا، ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی۔

مگر جس وقت یہ معمّہ انسانی دماغ کے سامنے نیا نیا اُبھرا تھا، اُسی وقت اِس کا حل بھی اُبھر آیا تھا۔ ہم اُس کی جگہ دوسرا حل ڈھونڈھنا چاہتے ہیں اور یہیں سے ہماری تمام بے حاصلیاں سر اُٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔

اچھا اب غور کیجیے۔ اس معمّہ کے حل کی کاوش بالآخر ہمیں کہاں سے کہاں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے؟ یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سرتاسر ایک سوال ہے۔ سورج سے لے کر اس کی روشنی کے ذرّوں تک، کوئی نہیں جو یک قلم پرسش و تقاضہ نہ ہو۔ "یہ سب کچھ کیا ہے؟" "یہ سب کچھ کیوں ہے؟" "یہ سب کچھ کس لیے ہے؟" ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں، اور اس روشنی میں جسے ہم نے علم کے نام سے پکارا ہے، جہاں تک راہ ملتی ہے، چلتے چلے جاتے ہیں، لیکن ہمیں کوئی حل ملتا نہیں [۱۹]، جو اس الجھاؤ کے تقاضوں کی پیاس بجھا سکے۔ روشنی گل ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دے دیتے ہیں۔ لیکن پھر جونہی ہم پُرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ "ایک صاحبِ ادراک و ارادہ قوت پسِ پردہ موجود ہے!" تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، جیسے اندھیرے سے نکل کر یکایک اُجالے میں آ کھڑے ہوئے۔ اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہر سوال نے اپنا جواب پا لیا، ہر تقاضے کی طلب پوری ہو گئی۔ سرِ پیاسے کو سیرابی مل گئی۔ گویا یہ سارا اُلجھاؤ ایک قفل تھا، جو اس کنجی کے چھوتے ہی کھل گیا:

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم
ساکن شدم، میانۂ دریا، کنارہ شد [۲۰]

اگر ایک ذی عقل ارادہ پسِ پردہ موجود ہے تو یہاں جو کچھ ہے، کسی ارادہ کا نتیجہ ہے اور کسی معیّن اور طے شدہ مقصد کے لیے ہے۔ جونہی یہ حل سامنے رکھ کر ہم اس گورکھ دھندے کو ترتیب دیتے ہیں، معاً اس کی ہر کج پیچ نکل جاتی ہے اور ساری کڑیاں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کیونکہ "یہ کیا ہے"؟ اور "کیوں ہے"؟ کو ایک معنی خیز جواب

مل جاتا ہے ۔ گویا اس معمّہ کے حل کی ساری روح ان چند لفظوں کے اندر سمٹی ہوئی تھی۔ جونہی یہ سامنے آئے، معمّہ معمّہ نہ رہا، ایک معنی خیز داستان بن گیا۔ پھر جونہی یہ الفاظ سامنے سے ہٹنے لگتے ہیں، تمام معانی واشارات غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک خنک اور بیجان چیتیاں باقی رہ جاتی ہے۔

اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے، تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمّۂ ہستی کے بیجان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کریں۔

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے، تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے؛ لیکن ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے، تو پھر جو کچھ بھی ہے، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے، ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں۔ اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔

فطرتِ کائنات میں ایک مکمّل مثال (Pattern) کی نمو داری ہے۔ ایسی مثال، جو عظیم بھی ہے اور جمالی (Aesthetics) بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے۔ اس کا جمال ہم میں محوبیت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کر لیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مُدرک (Intelligent) قوّت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں، مگر نہیں کر سکتے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔

اگر غور کیجیے، تو اس حل پر یقین کرتے ہوئے ہم اُسی طریقِ نظر سے کام لینا چاہتے ہیں، جو ریاضیات کے اعدادی اور پیمائشی حقائق سے ہمارے دماغوں میں کام کرتا رہتا ہے۔ ہم کسی عددی اور پیمائشی الجھاؤ کا حل صرف اسی حل کو تسلیم کریں گے، جس کے ملتے ہی

الجھاؤ دور ہو جائے۔ اُلجھاؤ کا دور ہو جانا ہی حل کی صحت کی اٹل دلیل ہوتی ہے۔ بلاشبہ دونوں صورتوں میں اُلجھاؤ اور حل کی نوعیت ایک طرح کی نہیں ہوتی؛ اعدادی مسائل میں اُلجھاؤ عددی ہوتا ہے، یہاں عقلی ہے۔ وہاں عددی حل عددی حقائق کا یقین پیدا کرتا ہے، یہاں عقلی حل عقلی اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تاہم طریقِ نظر کا سانچا دونوں جگہ ایک ہی طرح کا ہوا؛ دونوں راہیں ایک ہی طرح کھلتی اور ایک ہی طرح بند ہوتی ہیں۔

اگر کہا جائے، حل کی طلب ہم اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ اپنے محسوسات و تعقّل کے محدود دائرے میں اس کے عادی ہو گئے ہیں؛ اور اگر اس حل کے سوا اور کسی حل سے ہمیں تشفّی نہیں ملتی، تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ ہم حقیقت تولنے کے لیے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ تو اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم اپنے آپ کو اپنے فکر و نظر کے دائرے سے باہر نہیں لے جا سکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اُسی کے اندر رہ کر سوچیں اور حکم لگائیں اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ "ہم مجبور ہیں کہ سوچیں اور حکم لگائیں" تو:

این سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من است![21]

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے، جو اگر غور کریں تو فوراً ہمارے سامنے نمایاں ہو جائیگا۔ انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہنچ کر نشو و ارتقا کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں، اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے، جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوق سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اُسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہیے، جو اُسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ اُبلتی رہتی ہے، اور وہ اونچی سے اونچی بلندی تک اڑ کر بھی رُکنا نہیں چاہتی۔

اُس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اُس کے سامنے سے ہٹ جائے، تو پھر اُس کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

کرۂ ارضی کی موجودات میں جتنی چیزیں ہیں، سب انسان سے نچلے درجے کی ہیں؛ وہ اُن کی طرف نظر نہیں اٹھا سکتا۔ اُس کے اوپر اجرامِ سماوی کی موجودات پھیلی ہوئی ہیں، لیکن اُن میں بھی کوئی ہستی ایسی نہیں، جو اس کے لیے نصب العین بن سکے۔ وہ سورج کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا۔ وہ چمکتے ہوئے ستاروں سے عشق نہیں کر سکتا۔ سورج اس کے جسم کو گرمی بخشتا ہے۔ لیکن اس کی مخفی قوتوں کی اُمنگوں کو گرم نہیں کر سکتا۔ ستارے اس کی اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں، لیکن اس کے دل و دماغ کے نہاں خانہ کو روشن نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کون سی ہستی ہے جس کی طرف وہ اپنی بلند پروازیوں کے لیے نظر اٹھا سکتا ہے؟

یہاں اُس کے چاروں طرف پستیاں ہی پستیاں ہیں، جو اسے انسانیت کی بلندی سے پھر حیوانیت کی پستیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہیں، حالانکہ وہ اوپر کی طرف اُڑنا چاہتا ہے۔ وہ عناصر کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجہ میں آیا۔ نباتات سے بلند تر ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہنچا؛ پھر حیوانی مرتبہ سے اُڑ کر انسانیت کی شاخِ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا۔ اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا، اگرچہ حیوانیت کی پستی اُسے برابر نیچے ہی کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ وہ فضا کی لاانتہا بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھاتا ہے:

نہ باندازۂ بازوست کمندم، ہیہات
ورنہ با گوشۂ بامیم سرِ کارے ہست [۲۲]

اُسے بلندیوں، لامحدود بلندیوں کا ایک بامِ رفعت چاہیے، جس کی طرف وہ برابر دیکھتا رہے، اور جو اُسے ہر دم بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کا اشارہ کرتا رہے:

ترا ز کنگرۂ عرش مے زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است![۲۳]

اسی حقیقت کو ایک جرمن فلسفی ریحل (Riehl) نے ان لفظوں میں ادا کیا تھا:
"انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو، جو خود اس سے بلند تر ہے؛ وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اُوپر کرسکتا ہے!"

بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصوّر کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ اگر یہ بلندی اس کے سامنے سے ہٹ جائے، تو پھر اُسے نیچے کی طرف دیکھنے کے لیے جھکنا پڑیگا۔ اور جونہی اس نے نیچے کی طرف دیکھا، انسانیت کی بلندی پستی میں گرنے لگی۔

یہی صورتِ حال ہے، جو ہمیں یقین دلاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے، اور چونکہ فطری تقاضے کا جواب ہے، اس لیے اس کی جگہ انسان کے اندر پہلے سے موجود ہونی چاہیے، بعد کی بنائی ہوئی بات نہیں ہوئی![۲۴] زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ فطرت نے فطری تقاضوں کے فطری جواب دیے ہیں، اور دونوں کا دامن اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے کہ اب اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، دونوں میں سے کون پہلے ظہور میں آیا تھا! تقاضے پہلے پیدا ہوئے تھے، یا اُن کے جوابوں نے پہلے سر اُٹھایا تھا! چنانچہ جب کبھی ہم کوئی فطری تقاضا محسوس کرتے ہیں، تو ہمیں پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کا فطری جواب بھی ضرور موجود ہوگا۔ اس حقیقت میں ہمیں کبھی شبہہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بچّہ کی دماغی نشو ونما اور اُس کی قوتِ محاکات کے اُبھرنے کے لیے مثالوں اور نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مثالوں اور نمونوں کے بغیر اپنی فطری قوتوں کو ان کی اصلی چال چلا نہیں سکتا۔[25] حتیٰ کہ بات کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا، جو اس کے مرتبۂ انسانیت کا امتیازی وصف ہے؛ اور چونکہ یہ اس کی ایک فطری طلب ہے، اس لیے ضروری تھا کہ خود فطرت ہی نے اوّل روز سے اس کا جواب بھی مہیّا کر دیا ہوتا، چنانچہ یہ جواب پہلے 'ماں' کی ہستی میں اُبھرتا ہے، پھر 'باپ' کے نمونے میں سر اُٹھاتا ہے۔ پھر روز بروز اپنا دامن پھیلاتا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس صورتِ حال کا یقین کس طرح ہمارے دماغوں میں بسا ہوا ہے! ہم کبھی اس میں شک کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے دماغوں میں یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں کہ بچّے کے لیے والدین کا نمونہ ابتدا سے کام دیتا آیا ہے یا بعد کو انسانی بناوٹ نے پیدا کیا ہے! کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک فطری مطالبہ ہے، اور فطرت کے تمام مطالبے جبھی سر اٹھاتے ہیں، جب اُن کے جواب کا بھی سروسامان مہیّا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی دماغ کی نشو ونما ایک خاص درجہ تک پہنچ کر ان تمام نمونوں سے آگے بڑھ جاتی ہے، جو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے عروج وارتقا کی پرواز جاری رکھنے کے لیے اُوپر کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے، تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اُس کی ہستی کا ایک فطری مطالبہ ہے۔ اور اگر فطری مطالبہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کا فطری جواب بھی خود اُس کی ہستی کے اندر ہی موجود ہو، اور اس کے ہوش وخرد نے آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ یہ جواب کیا ہو سکتا ہے؟ جس قدر جستجو کرتے ہیں، خدا کی ہستی کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس تصوّر کی امنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ ِوید[26] کے زمزموں کا فکری مواد اس ذوقِ نمنا

شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ اور حتیوں[27] (Hittites) اور عیلامیوں[28] نے جب اپنے تعبدانہ تصوّرات کے نقش و نگار بنائے تھے، تو انسانی تمدّن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادتِ مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا، اور کالڈیا[29] کے صنعت گروں نے مٹّی کی پکّی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے، جو گذری ہوئی قوموں سے انھیں ورثہ میں ملے تھے:

در ہیچ پردہ نیست، نہ باشد نوائے تو
عالم پُرست از تو و خالیست جائے تو[30]

ابوالفضل[31] نے عبادت گاہِ کشمیر کے لیے کیا خوب کتبہ تجویز کیا: "الٰہی، بہ ہر خانہ کہ می نگرم جویائے تو اند، و بہ ہر زبان کہ می شنوم، گویائے تو؟"

اے تیرِ غمت را دلِ عشّاق نشانہ
خلقے بتو مشغول و تو غائب ز میانہ
گہ معتکفِ دیرم و گہ ساکنِ کعبہ
یعنی کہ تُرا می طلبم خانہ بخانہ[32]

ابوالکلام

(۱۳)

قلعۂ احمد نگر

۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

کل کا مکتوب کاغذ پر ختم ہو چکا تھا، لیکن دماغ میں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت قلم اٹھایا تو پھر خیالات اسی رُخ پر بڑھنے لگے۔

غور و فکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقّل اور غیر شخصی تصوّر پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک شخصی تصوّر پیدا کرتا رہا؟ میں "شخصی" تصوّر اُس معنی میں بول رہا ہوں؛ جس معنی میں "پرسنل گاڈ" (Personal God) کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ شخصی تصوّر کے مختلف مدارج ہیں: ابتدائی درجہ تو تشخص محض کا ہوتا ہے، جو صرف شخصیت کا اثبات کرتا ہے، لیکن پھر آگے چل کر یہ شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعّالیتوں کا جامہ پہن لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا؟ اس کی علّت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے، اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک متشخص اور علائق نواز تصوّر کے بجھ نہیں سکتی۔ حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصوّر جب کبھی اُس کے سامنے آئیگا، تو تشخص کی ایک نقاب چہرہ پر ضرور ڈال لیگا۔ یہ نقاب کبھی بھاری رہی کبھی ہلکی ہوگئی، کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی لُبھانے والی بن گئی، لیکن چہرہ سے کبھی اُتری نہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی

ساری درماندگیاں شروع ہوگئیں:

برچہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ ۲

جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرستِ ماست

دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا، اور مذہب افلاطون جدید (Neo- Platonism) نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصوّر کو ہر طرح کے تصوّری تشخصات سے منزّہ کر کے ایک کامل مطلق اور بحت تصوّر قائم کر دیتا ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ صفات متشکّل نہیں ہو سکتیں، اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات اور مظاہر کے اعتبار سے، نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے۔ اس عقیدہ کا رُوشناس اُس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ "ہے" اور کچھ نہیں کہہ سکتا، یہاں تک کہ اشارہ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں، تو ذاتِ مطلق، مطلق نہیں رہتی، تشخص اور حدود کے غبار سے آلود ہو جاتی ہے۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے:

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عینِ اُوست

اما نمی تواں کہ اشارت بأو کنند ۳

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اُپنیشدوں نے نفی صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے۔ لیکن پھر دیکھیے، اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذاتِ مطلق) کو ایشور (ذاتِ متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے، بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے:

کرے کیا کعبہ میں جو سرِ بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں للہ ہی للہ ہے[۴]

یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا، اور اسرائیل کے گھرانے سے اس کا رشتہ ایسا ہوا جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی[۵] بیوی کے ساتھ ہوتا ہے شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دیگا، مگر اس کی بیوفائی کبھی معاف نہیں کریگا، کیونکہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی محبت بھی شریک ہو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ[۶]۔ چنانچہ تورات کے احکامِ عشرہ[۷] میں ایک حکم یہ تھا: "تو کسی چیز کی مورتی نہ بنائیو، نہ اس کے آگے جھکیو، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا ایک غیور خدا ہوں۔" لیکن پھر زمانہ جوں جوں بڑھتا گیا، یہ تصور بھی زیادہ وسعت اور رقت پیدا کرتا گیا۔ یہاں تک کہ یسعیا [ہ] (Isaiah) ثانی[لہ] کے زمانہ میں اُس تصور کی بنیادیں پڑنے لگیں جو آگے چل کر مسیحی تصور کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ چنانچہ مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ[لہ] کو دیکھا کیونکہ باپ اپنے بچوں کے لیے سرتاسر رحم و شفقت اور یک قلم عفو و درگزر ہوتا ہے:

لہ انیسویں صدی میں بائبل کے نقد و تدبر کا جو مسلک "انتقادِ اعلیٰ" کے نام سے اختیار کیا گیا تھا، اس کے بعض فیصلے آج تک طے شدہ سمجھے جاتے ہیں؛ از آنجملہ یہ کہ یسعیا [ہ] نبی کے نام سے جو صحیفہ موجود ہے، وہ تین مختلف مصنفوں نے تین مختلف زمانوں میں مرتب کیا ہوگا۔ باب اوّل سے باب ۳۹ تک ایک مصنف کا کلام ہے، باب ۴۰ سے باب ۵۵ آیت ۱۳ تک دوسرے مصنف کا، اور اس کے بعد کا آخری حصہ تیسرے کا۔ ان تینوں مصنفوں کو امتیاز کے لیے یسعیا [ہ] اوّل، ثانی اور ثالث سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لہ ہندو تصور نے باپ کی جگہ ماں کی تمثیل اختیار کی تھی، کیونکہ ماں کی محبت باپ کی محبت سے بھی زیادہ گہری اور غیر متزلزل ہوتی ہے۔

من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو [8]

اسلام نے اپنے عقیدہ کی بنیاد سرتاسر تنزیہہ پر رکھی ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ [9] میں تشبیہہ کی ایسی عام اور قطعی نفی کر دی کہ ہمارے تصوری تشخص کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ لَا تَضْرِبُوا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ [10] نے مثلیوں کے سارے دروازے بند کر دیے۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ [11] اور لَنْ تَرَانِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ [12] نے ادراکِ حقیقت کی کوئی اُمید باقی نہ چھوڑی:

زبان ببند و نظر باز کن کہ منعِ کلیم
اشارت از ادب آموزیِ تقاضائی ست [13]

تاہم انسان کے نظارۂ تصوّر کے لیے اسے بھی صفات کی ایک صورت آرائی کرنی ہی پڑی اور تنزیہہ مطلق نے صفاتی تشخص کا جامہ پہن لیا وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِہَا [14] اور پھر صرف اتنے ہی پر معاملہ نہیں رُکا، جا بجا مجازات کے جہرہ کے بھی کھولنے پڑے بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتَانِ [15] اور یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ [16] اور وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی [17] اور اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی [18] اور اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ [19] اور کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ [20]:

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر [21]

اس سے معلوم ہوا کہ بلندی کے ایک نصب العین کی طلب انسان کی فطرت کی طلب ہے اور وہ بغیر کسی ایسے تصوّر کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے اور سامنے جبھی آسکتا ہے کہ اس کے مطلق اور غیر متشخص چہرہ پر کوئی نہ کوئی نقاب تشخص کی پڑ گئی ہو:

آہ ازاں حوصلۂ تنگ وازاں حسنِ بلند
کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدار تو نیست [۲۴]

غیر صفاتی تصوّر کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اُسے ایسے مطلوب کی ہوئی، جو اس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے، جس میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسنِ گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے، جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ [لہ] اور وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ [۵۲]۔

در پردہ و بر ہمہ کس پردہ می دری
با ہر کسی و با تو کسے را وصال نیست [۲۵]

غیر صفاتی تصوّر محض نفی و سلب ہوتا ہے، مگر صفاتی تصوّر نفیِ تشبّہ کے ساتھ ایک اجمالی صورت بھی متشکل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں صفات کی نقش آرائیاں ناگزیر ہوئیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں علمائے سلف اور اصحابِ حدیث نے تفویض کا مسلک اختیار کیا اور تاویلِ صفات سے گریزاں رہے اور اِسی بنا پر انھوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطّل سے تعبیر کیا اور معتزلہ و متکلمین کی تاویلوں میں بھی تعطیل کی بُو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے اصحابِ حدیث کو تشبّہ اور تجسّم (Anthropomorphism) کا الزام دیا تھا، مگر وہ کہتے تھے، تمھارے تعطّل سے تو ہمارا

لہ بلاشبہہ تیرا پروردگار تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔

۵۲ اے پیغمبر! جب میری نسبت میرے بندے تجھ سے دریافت کریں تو اُن سے کہہ دے) میں اُن سے دُور کب ہوں؟ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

نام نہاد تشبیہ ہی بہتر ہے، کیونکہ یہاں تصوّر کے لیے ایک ٹھکانا تو باقی رہتا ہے؛ تمھاری سلب ونفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا!

ہندوستان کے اونپشیدوں نے ذاتِ مطلق کو ذاتِ متّصف میں اُتارتے ہوئے جن تنزّلات کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر "احدیّت" اور "واحدیّت" کے مراتب میں دیکھی۔ "احدیّت" کا مرتبہ یکتائیِ محض کا ہوا، لیکن "واحدیّت" کی جگہ اوّل کی ہوئی، اور اوّلیت کا مرتبہ چاہتا ہے کہ دوسرا، تیسرا، چوتھا بھی ہو۔ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق[26] حدیثِ قدسی نہیں ہے، مگر جس کسی کا بھی قول ہے، اس میں شک نہیں کہ ایک بڑے ہی گہرے تفکر کی خبر دیتا ہے،

دل کُشتۂ یکتائی حسن است، وگرنہ
در پیشِ تو آیینہ شکستن ہنرے بود[27]

ترجمان القرآن جلد اوّل میں بہ ضمنِ تفسیرِ سورۂ فاتحہ[28]، اور جلد دوم میں بہ ضمنِ تفسیرِ وَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ[29] اس مبحث کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، اور مبحث ایسا ہے کہ اگر پھیلایا جائے، تو بہت دُور تک پھیل سکتا ہے۔

تلقینِ درسِ اہلِ نظر یک اشارت ست
کردم اشارتے و مکرّر نمی کنم[30]

اس سلسلے میں ایک اور مقام بھی نمایاں ہوتا ہے اور اُس کی وسعت بھی ہمیں دُور دُور تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر یہاں مادّہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو پھر مرتبۂ انسانی میں اُبھرنے والی وہ قوت، جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں، کیا ہے؟ کس انگیٹھی سے یہ چنگاری اُڑی؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ ہم خود مادّہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اُس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بتدریج اس درجہ تک پہنچا۔ وہ عرصہ تک نباتات میں سویا رہا،

حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا، اور پھر انسانیت کے مرتبہ میں پہنچ کر جاگ اٹھا، لیکن
صورتِ حال کا یہ علم ہمیں اس گتھی کے سلجھانے میں کچھ مدد نہیں دیتا۔ یہ بیج فوراً برگ و
بار لے آیا ہو، یا مدتوں کے نشو و ارتقا کے بعد اس درجہ تک پہنچا ہو، بہر حال مرتبۂ
انسانیت کا جوہر و خلاصہ ہے، اور اپنی نمود و حقیقت میں تمام مجمع موجودات سے اپنی
جگہ الگ اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیوانیت کی پچھلی
کڑیوں سے جدا ہو گیا اور کسی آیندہ کڑی تک مرتفع ہونے کی استعداد اس کے اندر
سے سر اٹھانے لگی۔ وہ زمین کی حکمرانی کے تخت پر بیٹھ کر جب اوپر کی طرف نظر اٹھاتا
ہے، تو فضا کے تمام اجرام اُسے اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں، جیسے وہ بھی صرف
اُسی کی کاربرآریوں کے لیے بنائے گئے ہوں۔ وہ ان کی بھی پیمائشیں کرتا ہے، اور
ان کے خواص و افعال پر بھی حکم لگاتا ہے۔ اُسے کارخانۂ قدرت کی لاانتہائیوں
کے مقابلہ میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن درماندگیوں
کے اس احساس سے اس کی سعی و طلب کی امنگیں پژمردہ نہیں ہو جاتیں، بلکہ اور
زیادہ شگفتگیوں کے ساتھ ابھرنے لگتی ہیں اور اسے اور زیادہ بلندیوں کی طرف اڑا
لے جانا چاہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فکر و ادراک کی یہ فضا لامتناہی جو انسان کو اپنی
آغوشِ پرواز میں لیے ہوئے اُڑ رہی ہے، کیا ہے؟ کیا اس کے جواب میں اس قدر کہہ
دینا کافی ہوگا کہ یہ محض ایک اندھی بہری قوت ہے، جو اپنے طبعی خواص اور طبعی احوال و
ظروف سے ترقی کرتی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوالہ بن گئی؛ جو لوگ مادیت کے دائرے
سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، وہ بھی اس کی جرأت بہت کم کر سکے کہ اس سوال
کا جواب بلا تامل اثبات میں دے دیں۔

میں ابھی اُس انقلاب کی طرف اشارہ کرنا نہیں چاہتا جو انیسویں صدی کے آخر میں رونما
ہونا شروع ہوا، اور جس نے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی 'کلاسیکل طبیعیات' کے تمام

بنیادی مسلّمات یک قلم متزلزل کر دیے۔ میں ابھی اُس سے الگ رہ کر ایک عام نقطۂ نگاہ سے مسئلہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

اور پھر خود وہ صورتِ حال جسے ہم نشوو ارتقا (Evolution) سے تعبیر کرتے ہیں، کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا وہ ایک خاص رُخ کی طرف انگلی اٹھائے اشارہ نہیں کر رہی ہے؟ ہم نے سینکڑوں برس کی سُراغ رسانیوں کے بعد یہ حقیقت معلوم کی کہ تمام موجوداتِ ہستی آج جس شکل و نوعیت میں پائی جاتی ہیں، یہ بیک دفعہ ظہور میں نہیں آگئیں یعنی کسی براہ راست تخلیقی عمل نے انھیں یکایک یہ شکل و نوعیت نہیں دے دی، بلکہ ایک تدریجی تغیر کا عالمگیر قانون یہاں کام کرتا رہا ہے، اور اس کی اطاعت و انقیاد میں ہر چیز درجہ بدرجہ بدلتی رہتی ہے اور ایک ایسی آہستہ چال سے جسے ہم فلکی اعداد و شمار کی مدّتوں سے بھی بہ مشکل اندازہ میں لا سکتے ہیں، نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔ ذرّات سے لے کر اجرامِ سماوی تک، سب نے اسی قانونِ تغیر و تحوّل کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیّت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتارِ فطرت ہے جسے ہم 'نشوو ارتقا' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایک معیّن، طے شدہ، ہم آہنگ اور منظّم، ارتقائی تقاضہ ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے، اور اُسے کسی خاص رُخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لے جا رہا ہے۔ ہر نچلی کڑی بتدریج اپنے سے اوپر کی کڑی کا درجہ پیدا کریگی، اور ہر اوپر کا درجہ نچلے درجہ کی رفتارِ حال پر ایک خاص اثر ڈالتے ہوئے اسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا رہیگا۔ یہ ارتقائی صورتِ حال خود توضیحی (Self Explanatory) نہیں ہے، یہ اپنی ایک توضیح چاہتی ہے۔ لیکن کوئی مادّی توضیح ہمیں ملتی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں صورتِ حال ایسی ہی ہوئی کہ یہاں ایک ارتقائی تقاضا موجود ہو، اور وہ ہر تخلیقی ظہور کو نچلی حالتوں سے اٹھاتا ہوا بلند تر درجوں کی طرف بڑھائے لے جائے؟

کیوں فطرتِ وجود میں رفعت طلبیوں کا ایسا تقاضا پیدا ہوا کہ سلسلۂ اجسام کی ایک مرتب سیڑھی نیچے سے اوپر تک اٹھتی ہوئی چلی گئی، جس کا ہر درجہ اپنے ماسبق سے اوپر، مگر اپنے مابعد سے نیچے پیدا ہوا ہے؟ کیا یہ صورتِ حال بغیر کسی معنی اور حقیقت کے ہے؟ کیا یہ سیڑھی بغیر کسی بالاخانہ کی موجودگی کے بن گئی اور یہاں کوئی بامِ رفعت نہیں جس تک یہ ہمیں پہنچانا چاہتی ہو؟

۳۱

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

زمانۂ حال کے علمائے علم الحیات میں پروفیسر لائیڈ مارگن (Lloyd Morgan) نے اس مسئلہ کا علم الحیاتی (Biological) نقطۂ خیال سے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن بالآخر اُسے بھی اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑا کہ اس صورتِ حال کی کوئی مادّی توضیح نہیں کی جاسکتی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو حاصلات (Resultants) یہاں کام کر رہی ہیں، ہم ان کی توضیح اس اعتبار سے تو کر سکتے ہیں کہ انھیں موجودہ احوال و ظروف کا نتیجہ قرار دیں، لیکن ارتقائی تقاضا کا فجائی ظہور (Emergence) جس طرح اُبھر تا رہا ہے، مثلاً زندگی کی نمود، ذہن و ادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ، اُن کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جاسکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کر لی جائے۔ ہمیں یہ صورتِ حال بالآخر مجبور کر دیتی ہے کہ فطرتِ کائنات میں ایک تخلیقی اصل (Creative Principle) کی کارفرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔ ایک ایسی تخلیقی اصل جو اس کارخانۂ ظرف و زماں میں ایک لازماں (Timeless) حقیقت ہے

حقائقِ ہستی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں، تو ایک خاص بات فوراً ہمارے سامنے اُبھرنے لگتی ہے۔ یہاں فطرت کا ہر نظام کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جب تک اُسے اُس کی سطح سے بلند ہو کر نہ دیکھا جائے، اس کی حقیقت بےنقاب نہیں ہوسکتی،

یعنی فطرت کے ہر نظم کو دیکھنے کے لیے ہمیں ایک ایسا مقامِ نظر پیدا کرنا پڑتا ہے، جو خود اُس سے بلند تر جگہ پر واقع ہے۔ عالمِ طبیعیات کے غوامض علم الحیاتی (Biological) عالم میں کھلتے ہیں؛ علم الحیاتی غوامض نفسیاتی (Psychological) عالم میں نمایاں ہوتے ہیں؛ نفسیاتی غوامض کے لیے ہمیں منطقی بحث و تحلیل کے عالم میں آنا پڑتا ہے لیکن منطقی بحث و تحلیل کے معمّوں کو کس مقام سے دیکھا جائے؟ اس سے اوپر بھی کوئی مقامِ نظر ہے یا نہیں، جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا دے سکتا ہو؟

ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس سے اوپر بھی ایک مقامِ نظر ہے، لیکن وہ اس سے بلند تر ہے کہ عقلی نظر و تعلیل سے اس کی نقش آرائی کی جا سکے۔ وہ ماوراے محسوسات (Supra Sensible) ہے، اگرچہ محسوسات سے معارض نہیں۔ وہ ایک ایسی آگ ہے، جو دیکھی نہیں جا سکتی؛ البتّہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جا سکتے ہیں۔ وَمن لم یذق لم یدر:[۳۲]

تو نظر باز نہ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نہ، ورنہ خموشی سخن ست[۳۳]

کائنات ساکن نہیں ہے، متحرک ہے؛ اور ایک خاص رُخ پر بنتی اور سنورتی ہوئی بڑھی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اندرونی تقاضہ ہر گوشہ میں تعمیر و تکمیل ہے۔ اگر کائنات کی اس عالمگیر ارتقائی رفتار کی کوئی مادّی توضیح ہمیں نہیں ملتی، تو ہم غلطی پر نہیں ہو سکتے، اگر اس معمّہ کا حل روحانی حقائق میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔

اس موقعہ پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ مادّہ کی نوعیت کے بارے میں ٹھاروِیں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کیے تھے، وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہو گئے، اور اب یکسر منہدم ہو چکے ہیں۔ اب ٹھوس مادّہ کی جگہ مجرّد قوت نے

لے لی ہے، اور الکٹرون (Electron) کے خواص و افعال اور رسالمات کے اعدادی و شماری انضباط کے مباحث نے معاملہ کو سائنس کے دائرہ سے نکال کر پھر فلسفہ کے صحراہیں گم کر دیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیت (Objective) کے علم و انضباط کا جو یقین[۳۴] تھا، وہ اب یکسر متزلزل ہو چکا، اور علم پھر داخلی ذہنیت[۳۵] (Subjective) کے اُسی ذہنی اور ظنّیاتی مقام پر واپس لوٹ رہا ہے، جہاں سے نشأتِ جدیدہ کے دَور کے بعد اُس نے نئی مسافرت کے قدم اٹھائے تھے۔ لیکن میں ابھی یہ داستان نہیں چھیڑونگا کیونکہ بجائے خود یہ ایک مستقل مبحث ہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ راہ محض استدلالی ذریعۂ علم سے طے نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی اصلی روشنی کشف و مشاہدہ کی روشنی ہے۔ لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنی چاہتے، جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں، اور اگر غور کریں، تو خود ہماری ہستی ہی سرتاسر نشانِ راہ ہے۔ وَلقد احسن من قال۔

خلقے نشانِ دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافل اند بچندیں نشاں کہ ہست[۳۶]

ابوالکلام

(۱۴)

قلعۂ احمد نگر
۵ دسمبر ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

پانچویں صلیبی حملہ کی سرگزشت ایک فرانسیسی مجاہد (Crusader) ژرے آن دوژوان
ویل (Jean De Joinville) نامی نے بطور یادداشت کے قلم بند کی تھی۔ اس کے کئی
انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں، زیادہ متداول نسخہ الوری مینس لائبریری کا ہے۔
پانچواں[۲] صلیبی حملہ سینٹ لوئس[۳] (Lewis) شاہ فرانس نے براہِ راست مصر پر کیا
تھا۔ دمیاط[۴] (Damiette) کا عارضی قبضہ، قاہرہ کی طرف اقدام، ساحل نیل کی لڑائی،
صلیبیوں کی شکست، خود سینٹ لوئس کی گرفتاری، اور زرِ فدیہ کے معاہدہ پر رہائی، تاریخ
کے مشہور واقعات ہیں اور عرب مؤرخوں نے ان کی تمام تفصیلات قلمبند کی ہیں[۵]۔ لوئس
رہائی کے بعد عکّہ[۶] (Acre) آیا، جو چند دوسرے ساحلی مقامات کے ساتھ صلیبیوں
کے قبضہ میں باقی رہ گیا تھا، اور کئی سال تک وہاں مقیم رہا۔ ژوواین ویل نے یہ تمام
زمانہ لوئس کی ہمراہی میں بسر کیا تھا؛ مصر اور عکّہ کے تمام اہم واقعات اُس کے
چشم دید واقعات ہیں۔

لوئس ۱۲۴۸ء میں فرانس سے روانہ ہوا۔ دوسرے سال دمیاط پہنچا، تیسرے سال
عکّہ، پھر ۱۲۵۴ء میں فرانس واپس ہوا۔ یہ سنین اگر ہجری سنین سے مطابق کیے جائیں
تو تقریباً ۶۴۶ھ اور ۶۵۲ھ ہوتے ہیں۔

ژوواین ویل جب لوئس کے ہمراہ فرانس سے روانہ ہوا، تو اس کی عمر چوبیس برس کی تھی۔

لیکن یہ یادداشت اس نے بہت عرصے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سالوں میں لکھی، یعنی ۱۳۰۹ء (۷۰۸ھ) میں جب اس کی عمر خود اس کی تصریح کے مطابق پچاسی برس کی ہوچکی تھی، اور صلیبی حملہ کے واقعات پر نصف صدی کی مدت گذر چکی تھی۔ اس طرح کی کوئی تصریح موجود نہیں، جس کی بنا پر خیال کیا جاسکے کہ مصر اور فلسطین کے قیام کے زمانہ میں وہ اہم واقعات قلمبند کر لیا کرتا تھا۔ پس جو کچھ اس نے لکھا ہے، وہ پچاس برس پیشتر کے حوادث کی ایک ایسی روایت ہے، جو اس کے حافظہ نے محفوظ رکھ لی تھی۔ بااین ہمہ اُس کے بیانات جہاں تک واقعاتِ جنگ کا تعلق ہے، عام طور پر قابلِ وثوق تسلیم کیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال اور اخلاق و عادات کی نسبت اس کی معلومات ازمنۂ وسطیٰ کی عام فرنگی معلومات سے چنداں مختلف نہیں، تاہم درجہ کا فرق ضرور ہے۔ چونکہ اب یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے باہمی تعلقات پر جو صلیبی لڑائیوں کے سایے میں نشوونما پاتے رہے تھے، تقریباً ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا تھا، اور فلسطین کے نوآباد صلیبی مجاہد اب مسلمانوں کو زیادہ قریب ہوکر دیکھنے لگے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ژواین ویل کے ذہنی تاثرات کی نوعیت اُن تاثرات کی نوعیت سے مختلف دکھائی دیتی ہے، جو ابتدائی عہد کے صلیبیوں کے رہ چکے ہیں۔ مسلمان کافر ہیں؛ ہیدین (Heathen) ہیں؛ پے نیم (Paynım) ہیں؛ پے گن (Pagan)؛ مسیح کے دشمن ہیں؛ تاہم کچھ اچھی باتیں بھی اُن کی نسبت خیال میں لائی جاسکتی ہیں، اور ان کے طور طریقہ میں تمام باتیں بُری ہی نہیں ہیں۔ مصری حکومت اور اس کے ملکی اور فوجی نظام کے بارے میں اُس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ستر فیصدی کے قریب صحیح ہے، لیکن مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال کے بیانات میں پچیس فیصدی سے زیادہ صحت نہیں۔ پہلی معلومات غالباً اس کی ذاتی ہیں، اس

لیے صحت سے قریب تر ہیں۔ دوسری معلومات زیادہ تر فلسطین کے کلیسائی حلقوں سے حاصل کی گئی ہیں، اس لیے تعصب و نفرت پر مبنی ہیں۔ اُس عہد کی عام فضا دیکھتے ہوئے یہ صورتِ حال چنداں تعجب انگیز نہیں۔

ایک عرصہ کے بعد مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا یہاں پھر اتفاق ہوا۔ ایک رفیق زنداں نے ایوری مینس لائبریری کی کچھ کتابیں منگوائی تھیں، ان میں یہ بھی آگئی۔ اس سلسلہ میں دو واقعات خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں۔

قیامِ عکّہ کے زمانے میں لوئس نے ایک سفیر سلطانِ دمشق کے پاس بھیجا تھا، جس کے ساتھ ایک شخص ایوِے لابریتان (Yves le Breton) بطور مترجم کے گیا تھا۔ یہ شخص مسیحی واعظوں کے ایک حلقہ سے تعلق رکھتا تھا اور "مسلمانوں کی زبان" سے واقف تھا۔ "مسلمانوں کی زبان" سے مقصود یقیناً عربی زبان ہے۔ ژواین ویل اس سفارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> جب سفیر اپنی قیام گاہ سے سُلدان (سلطان) کے محل کی طرف جا رہا تھا، تو لابریتاں کو راستہ میں ایک مسلمان بڑھیا عورت ملی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک برتن آگ کا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پانی کی صراحی تھی۔ لابریتان نے اس عورت سے پوچھا: "یہ چیزیں کیوں اور کہاں لے جا رہی ہو؟" عورت نے کہا: "میں چاہتی ہوں، اس آگ سے جنت کو جلا دوں اور پانی سے جہنم کی آگ بجھا دوں، تاکہ پھر دونوں کا نام و نشان باقی نہ رہے۔" لابریتان نے کہا: "تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟" اس نے جواب دیا: "اس لیے تاکہ کسی انسان کے لیے اس کا موقعہ باقی نہ رہے کہ جنت کے لالچ اور جہنم کے ڈر سے نیک کام کرے۔ پھر وہ جو کچھ کریگا، صرف خدا کی محبت کے لیے کریگا!"
>
> (Memoires of the Crusades: 246)

اس روایت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ بجنسہٖ یہی عمل اور یہی قول حضرت رابعہ بصریہ[9] سے منقول ہے۔ اس وقت کتابیں یہاں موجود نہیں، لیکن حافظہ سے مدد لے کر کہہ سکتا ہوں کہ قشیری، ابوطالب مکی[11]، فرید الدین عطار[12]، صاحب عرائس المجالس، صاحب روح البیان اور شعرانی[13] سب نے یہ مقولہ نقل کیا ہے اور اسے رابعہ بصریہ کے فضائل مقامات میں سے قرار دیا ہے۔

رابعہ بصریہ پہلے طبقہ کی کبار صوفیہ میں شمار کی گئی ہیں۔ دوسری صدی ہجری یعنے آٹھویں صدی مسیحی میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ایک دن اس عالم میں گھر سے نکلیں کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن تھا، دوسرے میں پانی کا کوزہ۔ لوگوں نے پوچھا: "کہاں جا رہی ہو؟" جواب میں بجنسہٖ وہی بات کہی جو لا بریتاں نے دمشق کی عورت کی زبانی نقل کی ہے: "آگ سے جنّت کو جلا دینا چاہتی ہوں، پانی سے دوزخ کی آگ بجھا دینا چاہتی ہوں، تاکہ دونوں ختم ہو جائیں، اور پھر لوگ خدا کی عبادت صرف خدا کے لیے کریں؛ جنّت اور دوزخ کے طمع و خوف سے نہ کریں۔"

قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کی رابعہ بصریہ کا مقولہ کس طرح ساتویں صدی ہجری کی ایک عورت کی زبان پر طاری ہو گیا، جو دمشق کی سڑک سے گذر رہی تھی؟ یہ کیا بات ہے کہ تعبیر معارف کی ایک خاص تمثیل (پارٹ) جو پانچ سو برس سے پہلے بصرہ کے ایک کوچہ میں دکھائی گئی تھی، بعینہٖ اب دمشق کی ایک شاہراہ پر دہرائی جا رہی ہے؟ کیا یہ محض افکار و احوال کا توارد ہے یا تکرار اور نقالی ہے؟ یا پھر راوی کی ایک افسانہ تراشی؟

ہر توجیہ کے لیے قرائن موجود ہیں اور معاملہ مختلف بھیسوں میں سامنے آتا ہے:

۱۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب صلیبی جماعتوں کی قوت فلسطین میں پاش پاش ہو چکی تھی، ساحل کی ایک چھوٹی سی دھجّی کے سوا اُن کے قبضہ میں اور کچھ باقی نہیں رہا تھا؛ اور

وہاں بھی امن اور چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ رات دن کے لگاتار حملوں اور محاصروں سے پامال ہوتے رہتے تھے۔ لوئس ان کی اعانت کے لیے آیا، لیکن وہ خود اعانت کا محتاج ہو گیا۔ جنگی قوت کے افلاس سے کہیں زیادہ ان کا اخلاقی افلاس انھیں تباہ کر رہا تھا۔ ابتدائی عہد کا مجنونانہ مذہبی جوش و خروش جو تمام یورپ کو بہالے گیا تھا، اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا؛ اور اس کی جگہ ذاتی خودغرضیاں اور صلیبی حلقہ بندیوں کی باہمی رقابتیں کام کرنے لگی تھیں۔ پے در پے شکستوں اور ناکامیوں سے جب ہمتیں پست ہوئیں، تو اصل مقصد کی کشش بھی کمزور پڑ گئی اور بدعملیوں اور ہوس رانیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت امراء اور عوام سے بھی بدتر تھی۔ دینداری کے اخلاص کی جگہ ریاکاری اور نمایش اُن کا سرمایۂ پیشوائی تھا۔ ایسے افراد بہت کم تھے، جو واقعی مخلص اور پاک عمل ہوں۔

جب اس عہد کے مسلمانوں کی زندگی سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا جاتا تھا، تو مسیحی زندگی کی مذہبی اور اخلاقی پستی اور زیادہ نمایاں ہونے لگتی تھی۔ مسلمان اب صلیبیوں کے ہمسایہ میں تھے، اور التوائے جنگ کے بڑے بڑے وقفوں نے باہمی میل جول کے دروازے دونوں پر کھول دیے تھے۔ صلیبیوں میں جو لوگ پڑھے لکھے تھے، ان میں سے بعض نے شامی عیسائیوں کی مدد سے مسلمانوں کی زبان بھی سیکھ لی تھی، اور ان کے مذہبی اور اخلاقی افکار و عقائد سے واقفیت پیدا کرنے لگے تھے۔ کلیسائی واعظوں کے جو حلقے یہاں کام کر رہے تھے، ان میں بھی بعض متجسس طبیعتیں ایسی پیدا ہو گئی تھیں[۱۴]، جو مسلمان عالموں اور صوفیوں سے ملتیں اور دینی اور اخلاقی مسائل پر مذاکرے کرتیں۔ اس عہد کے متعدد عالموں اور صوفیوں کے حالات میں ایسی تصریحات ملتی ہیں کہ صلیبی قسیس اور رُہبان اُن کے پاس آئے اور باہم دگر سوال و جواب ہوئے۔ بعض مسلمان علماء نے جو صلیبیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے تھے، عرصہ تک اُن میں

رہے اور ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی مباحثے کیے۔ شیخ سعدی شیرازی کو اسی عہد میں صلیبیوں نے گرفتار کر لیا تھا، اور انھیں عرصے تک طرابلس میں گرفتاری کے دن کاٹنے پڑے تھے[۱۵]

اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صلیبیوں میں جو لوگ مخلص اور اثر پذیر طبیعتیں رکھتے تھے، وہ اپنے گروہ کی حالت کا مسلمانوں کی حالت سے مقابلہ کرتے۔ وہ مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی تفوّق دکھا کر عیسائیوں کو غیرت دلاتے کہ اپنی نفس پرستیوں اور بدعملیوں سے باز آئیں اور مسلمانوں کی دیندارانہ زندگی سے عبرت پکڑیں۔ چنانچہ خود ژواین ویل کی سرگزشت میں جابجا اس ذہنی انفعال کی جھلک ابھرتی رہتی ہے۔ متعدد مقام ایسے ملتے ہیں جہاں وہ مسلمانوں کی زبانی اس طرح کے اقوال نقل کرتا ہے، جن سے عیسائیوں کے لیے عبرت اور تنبّہ کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی دمشق کی سفارشات کے سلسلہ میں اس نے جان دی ارمینین (John The Armenian) کے سفرِ دمشق کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔[۱۶] یہ شخص دمشق اس لیے گیا تھا کہ کمانیں بنانے کے لیے سینگ اور سریش خرید کر لائے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دمشق میں ایک عمر رسیدہ مسلمان ملا، جس نے میری وضع قطع دیکھ کر پوچھا "کیا تم مسیحی ہو؟" میں نے کہا: "ہاں"۔ مسلمان شیخ نے کہا:

> تم مسیحی آپس میں ایک دوسرے سے اب زیادہ نفرت کرنے لگے ہو، اسی لیے ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں نے یروشلم کے صلیبی بادشاہ بالڈوین (Baldwin) کو دیکھا تھا۔ وہ کوڑھی تھا اور اس کے ساتھ مسلح آدمی صرف تین سو تھے۔ پھر بھی اس نے اپنے جوش و ہمت سے سالادین (صلاح الدین) کو پریشان کر دیا تھا۔ لیکن اب تم اپنے گناہوں کی بدولت اتنے گر چکے ہو کہ ہم جنگلی جانوروں کی طرح تمھیں رات دن شکار کرتے رہتے ہیں۔

پس ممکن ہے کہ لابریتان ایسے ہی لوگوں میں سے ہو جنھیں مسلمان صوفیوں کے اعمال و اقوال سے یکگونہ واقفیت حاصل ہوگئی ہو، اور وہ وقت کے ہر معاملہ کو عیسائیوں کی عبرت پذیری کے لیے کام میں لانا چاہتا ہو۔ لابریتان کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ مسیحی واعظوں کے حلقہ سے وابستگی رکھتا تھا اور عربی زبان سے واقف تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ اُسے اُن خیالات سے واقفیت کا موقعہ ملا ہو، جو اُس عہد کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ چونکہ رابعہ بصریہ کا یہ مقولہ عام طور پر مشہور تھا، اور مسلمانوں کے میل جول سے اُس کے علم میں آچکا تھا، اس لیے سفرِ دمشق کے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک عبرت انگیز کہانی گڑھ لی۔ مقصود یہ تھا کہ عیسائیوں کو دین کے اخلاصِ عمل کی ترغیب دلائی جائے اور دکھایا جائے کہ مسلمانوں میں ایک بڑھیا عورت کے اخلاصِ عمل کا جو درجہ ہے، وہ اُس تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ژواین ویل کے علم میں یہ مقولہ آیا ہو، اور اس نے لابریتان کی طرف منسوب کر کے اُسے دمشق کے ایک بروقت واقعہ کی شکل دے دی ہو۔

ہمیں معلوم ہے کہ انیسویں صدی کے نقّادوں نے ژواین ویل کو صلیبی عہد کا ایک ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بظاہر ایک دیندار اور مخلص مسیحی تھا، جیسا کہ اس کی تحریر سے جابجا مترشح ہوتا ہے؛ تاہم یہ ضروری نہیں کہ ایک دیندار راوی میں دینی اور اخلاقی اغراض سے مفیدِ مقصد روایتیں گڑھنے کی استعداد نہ رہی ہو۔ فنِ روایت کی گہرائیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ نیک سے نیک انسان بھی بعض اوقات جعل و صناعت کے تقاضوں سے اپنی نگرانی نہیں کرسکتے۔ وہ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر کسی نیک مقصد کے لیے ایک مصلحت آمیز جعلی روایت گڑھ لی جائے، تو کوئی برائی کی بات نہیں۔ مسیحی مذہب کے ابتدائی عہدوں میں جن لوگوں نے حواریوں کے نام سے طرح طرح کے نوشتے گڑھے تھے، اور جنھیں آگے

چل کر کلیسا نے غیر معروف و مدون (Apocrypha)[19] نوشتوں میں شمار کیا، وہ یقیناً بڑے ہی دینداراور مقدس آدمی تھے۔ تاہم یہ دینداری انھیں اس بات سے نہ روک سکی کہ حواریوں کے نام سے نوشتے تیار کرلیں۔

تاریخِ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جن لوگوں نے بیشمار جھوٹی حدیثیں بنائیں، ان میں ایک گروہ دیندار واعظوں اور مقدس زاہدوں کا بھی تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ لوگوں میں دینداری اور نیک عملی کا شوق پیدا کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں گڑھ کرسنانا کوئی برائی کی بات نہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل[20] کو کہنا پڑا کہ حدیث کے واعظوں میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ ایسے ہی لوگوں کا ہے۔[21]

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ زمانہ یعنی ساتویں صدی ہجری کا زمانہ صوفیانہ افکار و اعمال کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا۔ تمام عالمِ اسلامی خصوصاً بلادِ مصر و شام میں وقت کی مذہبی زندگی کا عام رُجحان تصوّف اور تصوّف آمیز خیالات کی طرف جارہا تھا۔ ہر جگہ کثرت کے ساتھ خانقاہیں بن گئی تھیں، اور عوام اور امرا دونوں کی عقیدت مندیاں انھیں حاصل تھیں۔ تصوّف کی اکثر متداول مصنّفات تقریباً اسی صدی اور اس کے بعد کی صدی میں مدوّن ہوئیں۔ حافظ ذہبی جنھوں نے اس زمانہ سے ساٹھ ستّر برس بعد اپنی مشہور تاریخ لکھی ہے لکھتے ہیں کہ اس عہد کے تمام ملوک اور امرائے اسلام صوفیوں کے زیرِ اثر تھے۔ مقریزی نے تاریخِ مصر میں جن خانقاہوں کا حال لکھا ہے، ان کی بڑی تعداد تقریباً اسی عہد کی پیداوار ہے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ جن صلیبیوں کو مسلمانوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہو، وہ مسلمانوں صوفیوں کے اقوال پر مطلع ہو گئے ہوں، کیونکہ وقت کا عام رنگ یہی تھا۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لابریتان ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں افسانہ سرائی اور

حکایت سازی کا ایک قدرتی تقاضا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بغیر کسی مقصد کے بھی محض سامعین کا ذوق و استعجاب حاصل کرنے کے لیے فرضی واقعات گڑھ لیا کرتے ہیں۔ دنیا میں فنِ روایت کی آدھی غلط بیانیاں راویوں کے اسی جذبۂ داستان سرائی[22] سے پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں میں وعّاظ و قصّاص کا گروہ یعنی واعظوں اور قصّہ گویوں کا گروہ محض سامعین کے استعجاب و توجّہ کی تحریک کے لیے سیکڑوں روایتیں برجستہ گڑھ لیا کرتا تھا اور پھر وہی روایتیں قیدِ کتابت میں آکر ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی نوعیت پیدا کر لیتی تھیں۔ مُلّا معین[23] واعظ کاشفی وغیرہ کی مصنّفات ایسے قصّوں سے بھری ہوئی ہیں۔

۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ صحیح ہو، اور اُس عہد میں ایک ایسی صوفی عورت موجود ہو جس نے رابعۂ بصریہ والی بات بطورِ نقل و اتّباع کے یا واقعی اپنے استغراقِ حال کی بنا پر دُہرادی ہو۔

افکار و احوال کے اشباہ و امثال ہمیشہ مختلف وقتوں اور مختلف شخصیّتوں میں سر اٹھاتے رہتے ہیں اور فکر و نظر کے میدان سے کہیں زیادہ احوال و واردات کا میدان اپنی یک رنگیاں اور ہم آہنگیاں رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ساتویں صدی کی ایک صاحبِ حال عورت کی زبانِ حال سے بھی اخلاصِ عمل اور عشقِ الٰہی کی وہی تعبیر نکل گئی ہو، جو دوسری صدی کی رابعۂ بصریہ کی زبان سے نکلی تھی۔ افسوس ہے کہ یہاں کتابیں موجود نہیں، ورنہ ممکن تھا کہ اس عہد کے صوفیاے دمشق کے حالات میں کوئی سُراغ مل جاتا۔ ساتویں صدی کا دمشق تصوّف و اصحابِ تصوّف کا دمشق تھا۔

یہ یاد رہے کہ تذکروں میں ایک رابعۂ شامیہ[24] کا بھی حال ملتا ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو جامی نے بھی نفحات کے آخر میں ان کا ترجمہ لکھا ہے، لیکن ان کا عہد اس سے بہت پیشتر کا ہے۔ اس عہد کے شام میں ان کی موجودگی تصوّر میں نہیں

لائی جاسکتی۔

۴۔ آخری امکانی صورت جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس عہد میں کوئی نمایش پسند عورت تھی، جو بطورِ نقالی کے صوفیوں کا پارٹ دکھایا کرتی تھی اور وہ لا بریستان سے دو چار ہو گئی، یا یہ سن کر کہ عکّہ کی مسیحی سفارت آرہی ہے، قصداً اُس کی راہ میں آ گئی۔ مگر یہ سب سے زیادہ بعید اور دور دراز قرائن صورت ہے، جو ذہن میں آسکتی ہے۔

ژواین ویل نے ایک دوسرا واقعہ "دی اولڈ مین آف دی ماؤنٹین" کی سفارت کا نقل کیا ہے[25]، یعنی کوہستانِ اَلمُوت[26] کے "شیخ الجبال" کی سفارت کا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، "شیخ الجبال" کے لقب سے پہلے حسن بن صبّاح[27] ملقّب ہوا تھا۔ پھر اس کا ہر جانشین اسی لقب سے پکارا جانے لگا۔ فرقۂ باطنیہ کی دعوت کا یہ عجیب و غریب نظام تاریخِ عالم کے غرائبِ حوادث میں سے ہے۔ یہ بغیر کسی بڑی فوجی طاقت کے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قائم رہا، اور مغربی ایشیا کی تمام طاقتوں کو اس کی ہولناکی کے آگے جھکنا پڑا۔ اُس نے یہ اقتدار فوج اور مملکت کے ذریعہ حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ صرف جانفروش فدائیوں کے بے پناہ قاتلانہ حملے تھے، جنھوں نے اُسے ایک ناقابلِ تسخیر طاقت کی حیثیت دے دی تھی۔ وقت کا کوئی بادشاہ، کوئی وزیر، کوئی امیر، کوئی سربرآوردہ انسان ایسا نہ تھا جس کے پاس اس کا مُرا سرار خنجر نہ پہنچ جاتا ہو۔ اس خنجر کا پہنچنا اس بات کی علامت تھی کہ اگر شیخ الجبال کی فرمایش کی تعمیل نہیں کی جائیگی، تو بلا تامّل قتل کر دیے جاؤ گے۔ یہ فدائی تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سایے کی طرح پیچھا کرتے، اور آسیب کی طرح محفوظ سے محفوظ گوشوں میں پہنچ جاتے۔

صلیبی جنگ آزماؤں کا بھی اُن سے سابقہ پڑا۔ کیئی ٹمپلر[28] (Templar) اور

ہاسپٹلر (Haspitaller)[29] فدائیوں کے خنجر کا نشانہ بنے، اور بالآخر مجبور ہو گئے کہ شیخ الجبال کی فرمایشوں کی تعمیل کریں۔ یروشلم (بیت المقدس) جب صلیبیوں نے فتح کیا تھا اور بالڈوین تخت نشین ہوا تھا تو اسے بھی ایک سالانہ رقم بطور نذر کے الموت بھیجنی پڑی تھی۔ فریڈرک ثانی[30] جب ۱۲۲۹ء میں سلطان مصر کی اجازت لے کر یروشلم کی زیارت کے لیے آیا تو اس نے بھی اپنا ایک سفیر گرانقدر تحفوں کے ساتھ شیخ الجبال کے پاس بھیجا تھا۔ یورپ میں قلعۂ الموت کے عجائب کی حکایتیں انہی صلیبیوں کے ذریعہ پھیلیں، جو بعد کی مصنّفات میں طرح طرح کے ناموں سے ملتی ہیں۔ انیسویں صدی کے افسانہ نگاروں نے اسی مواد سے اپنے افسانوں کی نقش آرائیاں کیں، اور بعض اس دھوکے میں پڑ گئے کہ شیخ الجبال سے مقصود کوہستانِ شام کا کوئی پُراسرار شیخ تھا، جس کا صدر مقام لبنان تھا!

ژوآین ویل[31] لکھتا ہے:

> عکّہ میں بادشاہ (لوئس) کے پاس کوہستان کے "اولڈ مین" کے ایلچی آئے۔ ایک امیر عمدہ لباس میں ملبوس آگے تھا، اور ایک خوش پوش نوجوان اس کے پیچھے۔ نوجوان کی مٹھی میں تین چھریاں تھیں جن کے پھل ایک دوسرے کے دستے میں پیوست تھے۔ یہ چھریاں اس غرض سے تھیں کہ اگر بادشاہ امیر کی پیش کردہ تجویز منظور نہ کرے، تو انھیں بطور مقابلہ کی علامت کے پیش کر دیا جائے۔ نوجوان کے پیچھے ایک دوسرا نوجوان تھا۔ اس کے بازو پر ایک چادر لپٹی ہوئی تھی۔ یہ اس غرض سے تھی کہ اگر بادشاہ سفارت کا مطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دے، تو یہ چادر اس کے کفن کے لیے پیش کر دی جائے یعنی اسے متنبّہ کر دیا جائے کہ اب اس کی موت ناگزیر ہے۔

امیر نے پادشاہ سے کہا، "میرے آقا نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں، آپ انھیں جانتے ہیں یا نہیں؟" پادشاہ نے کہا: "میں نے اُن کا ذکر سُنا ہے"۔ امیر نے کہا: "پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ نے اس وقت تک انھیں اپنے خزانے کے بہترین تحفے نہیں بھیجے، جس طرح جرمنی کے شہنشاہ، ہنگری کے پادشاہ، بابل کے سلدان (سلطان) اور دوسرے سلاطین انھیں سال بسال بھیجتے رہتے ہیں؟ ان تمام پادشاہوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی زندگیاں میرے آقا کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ جب چاہے، ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرا سکتا ہے"۔

اس مکالمہ میں شہنشاہِ جرمنی اور شاہِ ہنگری کے سال بسال تحائف وُنذُور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ایک ہی مرتبہ اپنے زمانۂ ورودِ فلسطین میں تحفے نہیں بھیجے تھے بلکہ ہر سال بھیجتے رہتے تھے۔ "سلدانِ بابل" سے مقصود سلطانِ مصر ہے، کیونکہ صلیبی زمانہ میں فرنگی عام طور پر قاہرہ کو "بابل" کے نام سے پکارتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ جس بابل کا ذکر کتبِ مقدسہ میں آیا ہے، وہ یہی شہر ہے۔ چنانچہ اس دور کی تمام رزمیہ نظموں میں بار بار "بابل" کا نام آتا ہے۔ ایک صلیبی نائٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کافروں کو رگیدتا ہوا ایسے مقام تک چلا گیا، جہاں سے بابل کے سر بفلک منارے صاف دکھائی دیتے تھے۔

اس کے بعد ژ دائن ویل لکھتا ہے[۳۲] کہ اس زمانے میں شیخ الجبال ٹمپل اور ہاسپٹل کو ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دیا کرتا تھا، کیونکہ ٹمپلر اور ہاسپٹلر اس کے قاتلانہ حملوں سے بالکل نڈر تھے، اور وہ انھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شیخ الجبال کے سفیر نے کہا: "اگر بادشاہ میرے آقا کی فرمایش کی تعمیل نہیں کرنا چاہتا، تو پھر یہی کرے کہ جو خراج ٹمپل کو ادا کیا جاتا ہے، اس سے میرے آقا کو بری الذمہ کرا دے"۔

بادشاہ نے یہ پورا معاملہ ٹمپلرس کے حوالہ کر دیا۔ ٹمپلرس نے دوسرے دن سفیر کو بلایا اور کہا:[۲۳] "تمھارے آقا نے یہ بڑی غلطی کی کہ اس طرح کا گستاخانہ پیغام بادشاہِ فرانس کو بھیجا۔ اگر بادشاہ کے احترام سے ہم مجبور نہ ہوتے، جس کی حفاظت تمھیں بحیثیت سفیر کے حاصل ہے تو ہم تمھیں پکڑ کے سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیتے۔ بہرحال اب ہم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً رخصت ہو جاؤ اور پھر پندرہ دن کے اندر اَلمُوت سے واپس آؤ۔ لیکن اس طرح واپس آؤ کہ ہمارے بادشاہ کے نام ایک دوستانہ خط اور قیمتی تحائف تمھارے ساتھ ہوں۔ اس صورت میں بادشاہ تمھارے آقا سے خوشنود ہو جائیگا اور ہمیشہ کے لیے اُس کی دوستی تمھیں حاصل ہو جائیگی"۔ چنانچہ سفیر اس حکم کی تعمیل میں فوراً رخصت ہو گئے اور ٹھیک پندرہ دن کے اندر شیخ کا دوستانہ خط اور قیمتی تحائف لے کر واپس ہوئے۔

ژوائن وِل کی روایت کا یہ حصّہ محلِّ نظر ہے، اور عرب مؤرخوں کی تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ صلیبی جماعتیں اپنے عروج و اقتدار کے زمانے میں مجبور ہوئی تھیں کہ اپنی جانوں کی سلامتی کے لیے شیخ الجبال کو نذرانے بھیجتی رہیں۔ حتیٰ کہ فریڈرک ثانی نے بھی ضروری سمجھا تھا کہ اس طرح کی رسم و راہ قائم رکھے۔ پھر یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ۱۲۵۱ء میں جب کہ صلیبیوں کی تمام طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور [وہ] فلسطین کے چند ساحلی مقامات میں ایک محصور و مقہور گروہ کی مایوس زندگی بسر کر رہے تھے، کیوں اچانک صورتِ حال منقلب ہو جائے، اور شیخ الجبال ٹمپلروں سے خراج لینے کی جگہ خراج دینے پر مجبور ہو جائے! اتنا ہی نہیں، بلکہ ان تباہ حال ٹمپلروں سے اس درجہ خوفزدہ ہو کہ ان کے حاکمانہ احکام کی بِلا چون و چرا تعمیل کر دے!

جو بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ٹمپلروں اور ہاسپٹلروں کے تعلقات شیخ الجبال سے قدیمی تھے، اور اس وابستگی کی وجہ سے ہر طرح کی سازباز اُس کے کارندوں کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ شیخ الجبال نے جب لوئس کی آمد کا حال سُنا اور یہ بھی سُنا کہ اس نے ایک گرانقدر فدیہ دے کر سلطانِ مصر کی قید سے رہائی حاصل کی ہے[۳۴]، تو حسبِ معمول اُسے مرعوب کرنا چاہا اور اپنے سفیر قاتلانہ حملوں کے مرموز پیاموں کے ساتھ بھیجے۔ لوئس کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹمپلروں سے شیخ کے پرانے تعلقات ہیں۔ اُس نے معاملہ ان کے سپرد کر دیا، اور انھوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں کے درمیان دوستانہ علاقہ قائم کرا دیا۔ پھر طرفین سے تحفہ تحائف ایک دوسرے کو بھیجے گئے اور دوستانہ خط و کتابت جاری ہو گئی۔ عرب مؤرخوں کی تصریحات سے بھی صورتِ حال کا ایسا ہی نقشہ سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ الجبال اور صلیبیوں کے باہمی تعلقات اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ صلیبیوں نے کئی بار اُس کے فدائیوں کے ذریعہ سلاطینِ اسلام کو قتل کرانا چاہا تھا۔

لیکن پھر ژوآین ویل کے بیان کی کیا توجیہ کی جائے؟

معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ ٹمپلروں نے حقیقتِ حال مخفی رکھی ہو، اور شیخ الجبال کے طرزِ عمل کی تبدیلی کو اپنے فرضی اقتدار و تحکّم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ اس لیے ژوآین ویل پر اصلیّت نہ کھل سکی اور جو کچھ اُس نے سُنا تھا، یادداشت میں لکھ دیا۔ یا پھر ماننا پڑے گا کہ خود ژوآین ویل کی دینی اور قومی عصبیّت بیانِ حقیقت میں حائل ہو گئی، اور اُس نے صلیبیوں کا غیر معمولی تفوّق اور اقتدار دکھانے کے لیے اصل واقعہ کو یک قلم اُلٹ دیا۔ ژوآین ویل نے صلیبیوں کی شکستوں کی سرگزشت جس بے لاگ صفائی کے

ساتھ قلمبند کی ہے، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے غالباً قرینِ ثواب پہلی ہی صورت ہوگی۔

اس روایت کی کمزوری اس بات سے بھی نکلتی ہے کہ ٹمپلروں کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے سفیروں سے کہا: پندرہ دن کے اندر شیخ کا جواب لے کر واپس ہو یعنی سات دن جانے میں صرف کرو، سات دن واپس آنے میں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عکّہ اور الموت کی باہمی مسافت سات دن کے اندر طے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مستوفی نے نزہتہ القلوب میں اس عہد کی منزلوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی ایران کے قافلے بیت المقدس تک کی مسافت دو ماہ سے کم میں طے نہیں کر سکتے تھے اور الموت تک پہنچنے کے لیے تو ایران سے بھی آگے کی مزید مسافت طے کرنی پڑتی ہوگی۔ ہاں برید یعنی گھوڑوں کی ڈاک کے ذریعہ کم مدت میں آمد و رفت ممکن ہوگی۔ لیکن سفیروں کا برید کے ذریعہ سفر کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

ژواین ویل لکھتا ہے کہ شیخ الجبال نے لوئس کو جو تحفے بھیجے تھے، ان میں بلّور کا تراشا ہوا ایک ہاتھی اور ایک جی راف (Giraffe) یعنی زرافہ بھی تھا۔ نیز بلّور کے سیب اور شطرنج کے مہرے تھے۔ یہ اسی طرح کی بلّوری مصنوعات ہونگی، جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ الموت کا باغِ بہشت ان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بلّوری مصنوعات مغربی ایشیا میں پہلے چین سے آتی تھیں، پھر عرب صنّاع بھی بنانے لگے تھے۔

اس کے بعد اس سفارت کا حال ملتا ہے، جو لوئس نے شیخ الجبال کے پاس بھیجی تھی۔ اس سفارت میں بھی ہمارا پرانا دوست لا بریتان بطور مترجم کے نمایاں ہوتا ہے اور اس کی زبانی شیخ کا ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے۔ لیکن پورا مکالمہ بعید از قیاس باتوں پر

مبنی ہے اور قابلِ اعتنا نہیں۔ بعض حصّے صریح بناوٹی معلوم ہوتے ہیں، یا سرتاسر غلط فہمیوں سے وجود پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ الجبال نے سینٹ پیٹر (پطرس) کی تقدیس کی اور کہا[۳۸]: "ہابیل کی روح نوح میں آئی، نوح کے بعد ابراہیم میں اور پھر ابراہیم سے پیٹر میں منتقل ہوئی، اس وقت جب کہ خدا زمین پر نازل ہوا تھا۔" (یعنی حضرت مسیح کا ظہور ہوا تھا)۔

ممکن ہے شیخ نے یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ حضرت مسیح کا منکر نہیں ہے، یہ کہا ہو کہ جس وحیِ الٰہی کا ظہور پچھلے نبیوں میں ہوا تھا، اسی کا ظہور حضرتِ مسیح میں ہوا، اور لابریتان نے اسے دوسرا رنگ دے دیا۔

ژوایں ویل شیعہ سنّی اختلاف سے واقف ہے، لیکن اس کی تشریح یوں کرتا ہے[۳۹]:

شیعہ محمدؐ کی شریعت پر نہیں چلتے، علی کی شریعت پر چلتے ہیں۔ علی، محمدؐ کا چچا تھا۔ اُسی نے محمدؐ کو عزت کی مسند پر بٹھایا، لیکن جب محمدؐ نے قوم کی سرداری حاصل کرلی، تو اپنے چچا کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا، اور اُس سے الگ ہوگیا۔ یہ حال دیکھ کر علی نے کوشش کی کہ جتنے آدمی اپنے گرد جمع کرسکتا ہے، جمع کرلے اور پھر انھیں محمدؐ کے دین کے علاوہ ایک دوسرے دین کی تعلیم دے۔ چنانچہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اب علی کی شریعت پر عامل ہیں، وہ محمدؐ کے ماننے والوں کو بے دین سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پیروانِ محمدؐ، پیروانِ علی کو بے دین کہتے ہیں۔

پھر لکھتا ہے[۴۰]: "جب لابریتان شیخ الجبال کے پاس گیا تو اسے معلوم ہوا کہ شیخ محمدؐ پر اعتقاد نہیں رکھتا، علی کی شریعت ماننے والا ہے۔"

ژوایں ویل کا یہ بیان تمام تر اُن خیالات سے ماخوذ ہیں جو اس عہد کے کلیسائی[۴۱] حلقوں میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور پھر صدیوں تک یورپ میں نسلاً بعد نسلٍ اُن کی اشاعت

ہوتی رہی۔ یہ بیانات کتنے ہی غلط ہوں، تاہم ان بیانات سے تو بہرحال غنیمت ہیں،
جو صلیبی حملہ کے ابتدائی دور میں ہر کلیسائی واعظ کی زبان پر تھے۔ مثلاً یہ بیان کہ
موہامت (Mohamet) ایک سونے کا خوفناک بُت ہے، جس کی مسلمان پوجا
کرتے ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی اور اٹلیانی (اٹالین) زبان کے قدیم ڈراموں میں تروا گانٹ
(Trivigante) اور ervagant، مسلمانوں کے ایک ہولناک بُت کی حیثیت
سے پیش کیا جاتا تھا۔ یہی لفظ قدیم انگریزی میں آکر ٹروے گینٹ (Tervagant)
بن گیا اور اب ٹرمے گینٹ (Termagant) ایسی عورت کے لیے بولنے لگے ہیں جو
وحشیانہ اور بے لگام مزاج رکھتی ہو۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیخ الجبال کون تھا؟ یہ زمانہ تقریباً ۶۹۹ھ کا زمانہ
تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد تاتاریوں کی طاقت مغربی ایشیا میں پھیلی اور انھوں
نے ہمیشہ کے لیے اس پُراسرار مرکز کا خاتمہ کر دیا۔ پس غالباً یہ آخری شیخ الجبال خورشاہ[41]
ہوگا۔ یہاں کتابیں موجود نہیں اس لیے قطعی طور پر نہیں لکھ سکتا۔

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرقِ وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔
یورپ اس عہد کے مسیحی دماغ کی نمایندگی کرتا تھا، مشرقِ وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ
کی؛ اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہوگئی تھیں۔
یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا عَلَم بردار تھا، مسلمان علم و دانش کے عَلَم بردار
تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے
ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا
خدا کی مدد پر بھی تھا، لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف
روحانی قوتوں کا معتقد تھا، دوسرا روحانی اور مادّی، دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں
کے ظہور کا انتظار کیا، دوسرے نے نتائجِ عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے،

لیکن نتائجِ عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔
ژوآین ویل کی سرگزشت میں بھی یہ متضاد تقابل ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب مصری فوج نے منجنیقوں (Petrary) کے ذریعہ آگ کے بان پھینکنے شروع کیے، تو فرانسیسی جن کے پاس پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، بالکل بے بس ہو گئے — ژوآین ویل اس سلسلے میں لکھتا ہے[۴۲]:

ایک رات جب ہم ان بُرجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے، تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے پٹریری (یعنی منجنیق) کہتے ہیں، لا کر نصب کر دیا، اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر میرے لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا، ہمیں یوں مخاطب کیا: "اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے، کیونکہ اگر ہم نے ان بُرجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگا دی، تو ہم بھی بُرجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم بُرجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں، تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہہ نہیں، کیونکہ ہم ان کی حفاظت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں، اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔" چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے ہیں، جیسے شراب کے پیپے، اور آگ کا جو شعلہ ان سے

نکلتا تھا، اُس کی دُم اتنی لمبی ہوتی تھی، جیسے ایک بہت بڑا نیزہ، جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی، جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی، جیسے ایک آتشین اژدہا ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اس کی روشنی نہایت تیز تھی۔ چھاؤنی کے تمام حصے اس طرح اُجالے میں آجاتے، جیسے دن نکل آیا ہو۔

اس کے بعد خود لوئش کی نسبت لکھتا ہے:[43]

ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا دلی صفت پادشاہ سنتا تھا، تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا: مہربان مولیٰ! میرے آدمیوں کی حفاظت کر! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے پادشاہ کی ان دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا۔

لیکن فائدہ کا یہ یقین خوش اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا، کیونکہ بالآخر کوئی دعا بھی سُودمند نہ ہوئی، اور آگ کے بانوں نے تمام بُرجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ حال تو تیرھویں صدی مسیحی کا تھا، لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہوا، تو اب صورتِ حال یکسر اُلٹ چکی تھی۔ اب دونوں جماعتوں کے متضاد خصائص اسی طرح نمایاں تھے، جس طرح صلیبی جنگ کے عہد میں رہے تھے؛ اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی، اُسے اب یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین[44] نے مصر پر حملہ کیا[45] تو مراد بک نے جامع ازہر کے علما کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ علمائے ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے کہ انجاحِ مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[46] لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم، ختم نہیں ہوا

تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی[۴۷] نے اس عہد کے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں، اور یہ بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان پڑھا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، اِدھر لوگ ختمِ خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے یا مقلب القلوب، یا محوّل الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا، جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان! دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہی کو پہنچاتی ہیں، جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔

ژواین ویل نے اس آتش فشانی کو "یونانی آگ" (Greek Fire) سے تعبیر کیا ہے، اور اسی نام سے اس کی یورپ میں شہرت ہوئی۔ غالباً اس تسمیہ کی وجہ یہ تھی کہ جس مواد سے یہ آگ بھڑکتی تھی، وہ قسطنطنیہ میں صلیبیوں نے دیکھا تھا، اور اس لیے اسے یونانی آگ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

آتش فشانی کے لیے روغنِ نفط یعنی مٹی کا تیل کام میں لایا جاتا تھا۔ مٹی کے تیل کا یہ پہلا استعمال ہے، جو عربوں نے کیا۔ آذربائیجان کے تیل کے چشمے اس زمانے میں بھی مشہور تھے، وہیں سے یہ تیل شام اور مصر میں لایا جاتا تھا۔ ابن فضل اللہ اور نویری نے اس کے استعمال کا مفصل حال لکھا ہے۔

آتش فشانی کے لیے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں: ایک تو منجنیق کی قسم کی تھی، جو پتھروں کے پھینکنے کے لیے ایجاد ہوئی تھی؛ دوسری ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بڑیوں کی طرح زمین میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی تھی۔ ژواین ویل نے پہلے کو (Petrary) اور

دورِ ے کو (Swivel Crossbow) سے موسوم کیا ہے۔ "منجنیق" کا لفظ اُسی یونانی لفظ کی تعریب ہے جس سے انگریزی کا (Mechanic) فرانسیسی کا (Mechanicus) اور جرمن کا (Mechanikus) نکلا ہے۔ یہ آلہ عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا، لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد ہے۔ چنانچہ اُسے عربی میں "مدفع" کہتے تھے۔ یعنی پھینکنے والا آلہ۔ یہی "مدفع" بعد کو توپ کے لیے بولا جانے لگا۔
عربی میں مٹی کے تیل کے لیے "نفط" کا لفظ مستعمل ہوا۔ یہ یہی 'نفط' ہے، جس نے یورپ کی زبانوں میں (Naphtha) اور (Naphthlene) وغیرہا کی شکل اختیار کرلی ہے۔

ابوالکلام

(۱۵)

قلعۂ احمد نگر

۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چاے نہیں ہے، جو طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے[1]

وہ چینی چاے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے، ختم ہوگئی؛ اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں،

یک نالۂ مستانہ ز جائے نہ شنیدم
ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد![2]

مجبوراً ہندوستان کی اُسی سیاہ پتّی کا جوشاندہ پی رہا ہوں، جسے تعبیر و تسمیۃ کے اس قاعدے کے بموجب کہ:

برعکس نہند نامِ زنگی کافور[3]

لوگ چاے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں:

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر
زیں رسمہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند[4]

اس کارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زُلالِ صافی کا کوئی جام نہیں بھر اگیا کہ دُردِ کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا، اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے: فرحے ثمر نہ شد کہ تہی نہ کردند، وصفحہ تمام نہ شد کہ ورق بر نہ گردید!

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال
چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد[۵]

اُمید ہے کہ آپ کی "عنبریں" چائے کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا، اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا:

امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نہ باشی
مَے خوردنِ ہر روزہ زعاداتِ کرام است[۶]

معلوم نہیں، کبھی اس مسئلہ کے دقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی ہے یا نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں! واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی طبیعت کبھی سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی، زمانے کی بیراہ رویوں کا ہمیشہ ماتم گسار رہنا پڑا۔

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفت است[۷]

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی، بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے[۸]

سب سے پہلا سوال چاے کے بارے میں خود چاے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چاے کو چاے کے لیے پیتا ہوں، لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی، ان کے لیے وسائل میں۔ غور فرمایئے، میرا رُخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے!

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست!

چاے چین کی پیداوار ہے، اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جا رہی ہے، لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں گذری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہِ راست گئی، مثلاً روس، ترکستان، ایران۔ وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گذرا۔ مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے، تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی، اور چونکہ ہندوستان میں چاے کا رواج انھیں کے ذریعہ ہوا، اس لیے یہ بدعتِ سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چاے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چاے ڈالنے لگے۔ بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر کہ آمد، بر آں مزید کرد! اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے، لیکن ان کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیے ہیں، انھیں کون چھانٹ سکتا ہے! لوگ چاے کی جگہ ایک طرح کا سیّال حلوہ بناتے ہیں، کھانے کی جگہ پیتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چاے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ:

ہاے کمبخت! تو نے پی ہی نہیں!

پھر ایک بنیادی سوال چاے کی نوعیّت کا بھی ہے اور اس بارے میں بھی ایک عجیب

عالمگیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیے اور کس کس کو سمجھائیے:

روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد[12]

عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے سمجھتے ہیں، چاے ہے اور پھر اس کی مختلف قسمیں کر کے ایک کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے بارے میں باہم ردّ و کد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے: سیلون کی چاے بہتر ہے؛ دوسرا کہتا ہے: دارجلنگ کی بہتر ہے۔ گویا یہ بھی وہ معاملہ ہوا کہ:

در رہِ عشق نشُد کس بیقیں محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد[13]

حال آنکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چاے ہے ہی نہیں،

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند[14]

دراصل یہ عالمگیر غلطی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چاے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چاے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انھوں نے چین سے چاے کے پودے منگوائے، اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چاے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا، مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چاے رکھ دیا، اور اس غرض سے کہ اصلی چاے سے ممتاز رہے، اسے کالی چاے کے نام سے پکارنے لگے:

غلطی ہاے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں[15]

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کمیاب ارزاں ہو، بے سمجھے بوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی، اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب آپ ہزار سر پیٹیے، سنتا کون ہے:

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں [16]

معاملہ کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالمگیر فریب کی لپیٹ میں آ گئے اور اسی پتی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لال پتھر کو لعل سمجھا، اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھاس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کر دیں:

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی [17]

نوعِ انسان کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے۔ جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اِکّا دُکّا ہوگا، بھیڑ بیوقوفوں ہی کی رہیگی۔ ماننے پر آئینگے تو گائے کو خدا مان لینگے؛ انکار پر آئینگے، تو مسیح کو سولی پر چڑھا دینگے۔ حکیم سنائی زندگی بھر ماتم کرتا رہا۔

گاؤ را دارند باور در خدائی عامیاں
نوح را باور ندارند از پے پیغمبری [18]

اسی لیے عرفائے طریق کو کہنا پڑا:

انکاری خلق باش، تصدیق اینست ۔۔۔ مشغول بہ خویش باش، توفیق اینست
تبعیت خلق از حقت باطل کرد ۔۔۔ ترکِ تقلید گیر، تحقیق اینست [19]

یہ تو اصول کی بحث ہوئی؛ اب فروع میں آئیے۔ یہاں بھی کوئی گوشہ نہیں، جہاں زمین ہموار ملے۔ سب سے اہم مسئلہ شکر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اور نوعیت کے

لحاظ سے بھی:

دردا کہ طبیب صبر می فرماید [20] وین نفسِ حریص شکر می باید

جہاں تک مقدار کا تعلق ہے، اسے میری محرومی سمجھیے، یا تلخکامی کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصّہ ملا ہے، نہ صرف چائے میں، بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں کر سکتا۔ دنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی، وہی میرے لیے بد مزگی ہوگئی۔ کھاتا ہوں تو منھ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذّت مٹھاس میں ملتی ہے، مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہوا ہے، مگر میں اوپر سے چھڑک دوں گا۔ میں صباحت کا نہیں، ملاحت کا قتیل ہوں:

وللنّاس فی ما یعشقون مذاھب [21]

گویا کہہ سکتا ہوں کہ "اخی یوسف اصبح و انا املح منہ" [22]، کے مقام کا لذّت شناس ہوں:

گر نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو ایں حکایت [23]

اس حدیث کے تذکرہ نے یارانِ قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلائی کہ الایمان حلوٌ والمومن یحب الحلویٰ [ل] لیکن اگر مدارجِ ایمانی کے حصول اور مراتبِ ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا، تو نہیں معلوم، ان تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے، جن کی محبتِ حلاوت کی ساری پونجی چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی اور پھر اس کم شکری پر بھی "تاسف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔" ہا، مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آگیا:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبیست سالک را

خجل ہستم زکفرِ خود کہ دارد بوے ایماں ہم [24]

بچّوں کا مٹھاس کا شوق ضرب المثل ہے، مگر آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں بچپنے میں

ل یعنی ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے، وہ مٹھاس کو محبوب رکھےگا۔ [25]

بھی مٹھاس کا شائق نہ تھا۔ میرے ساتھی مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ تجھے نیم کی پتّیاں چبانی چاہییں اور ایک مرتبہ پسی ہوئی پتّیاں کھلا بھی دی تھیں:

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے [26]

میں نے یہ دیکھ کر کہ مٹھاس کا شائق نہ ہونا نقص سمجھا جاتا ہے، کئی بار بہ تکلّف کوشش کی کہ اپنے آپ کو شائق بناؤں، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ گویا وہی چندر بھان والی بات ہوئی کہ:

مرا دلے ست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم [27]

بہرحال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا، مگر معاملہ اس پر کہاں ختم ہوتا ہے!

کوتہ نظر ببیں کہ سخن مختصر گرفت [28]

ایک دقیق سوال اس کی نوعیت کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جا سکتی ہے، وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیے؛ اس کے لیے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دانوں کی دوبارہ شکر جو پہلے جاوا اور موریشس سے آتی تھی، اور اب ہندوستان میں بننے لگی ہے، چائے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے، حال آنکہ چائے کا معاملہ دوسری چیزوں سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے اسے حلوے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا مزاج اس قدر لطیف اور بے میل ہے کہ کوئی بھی چیز جو خود اسی کی طرح صاف اور لطیف نہ ہوگی، فوراً اسے مکدّر کر دیگی گویا چائے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ:

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا [29]

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کیے ہوئے رس سے بنتی ہے، مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چاے میں ڈالیے، معاً اس کا ذائقہ متاثر او رلطافت آلودہ ہو جائیگی۔ اگرچہ یہ اثر ہر حال میں پڑتا ہے، تاہم دودھ کے ساتھ پیجیے، تو چنداں محسوس نہیں ہوتا، کیونکہ دودھ کے ذائقہ کی گرانی چاے کے ذائقہ پر غالب آجاتی ہے اور کام چل جاتا ہے؛ لیکن سادہ چاے پیجیے تو فوراً بول اُٹھیگی۔ اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلّور کی طرح بے مَیل اور برف کی طرح شفّاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے اور بڑے بڑے دانوں کی شکل میں بھی۔ میں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفّاف شکر کام میں لاتا ہوں اور اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالبؔ گلاب سے لیا کرتے تھے:

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوے اُوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را[۳۰]

میرے لیے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا، جیسے شربت پینے والوں کے لیے قند اور گڑ کا فرق ہوا۔ لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کراسکتا۔ جس کسی سے کہا، اُس نے یا تو اسے مبالغہ پر محمول کیا، یا میرا وہم وتخیّل سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو میرے ہی مُنھ کا مزہ بگڑ گیا ہے، یا دنیا میں کسی کے مُنھ کا مزہ درست نہیں۔ یہ نہ سمجھ لیے کہ بحث چاے کے تکلّفات میں نہیں ہے، اس کی لطافت وکیفیت کے ذوق و احساس میں ہے۔ بہت سے لوگ چاے کے لیے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں ہی کا رواج ہے؛ مگر یہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ چاے کے ذائقہ کے لیے یہ کوئی ضروری چیز ہوئی، بلکہ محض تکلّف کے خیال سے، کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتہً قیمتی ہوتی ہے۔ آپ انھیں معمولی شکر ڈال کر چاے دے دیجیے، بے غل وغش پی جائینگے اور ذائقہ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرینگے۔

شکر کے معاملہ میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا، تو وہ ایرانی ہیں؛ اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں، مگر یہ نکتہ انھوں نے پالیا ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے اور اسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے، کیونکہ قند صاف ہوتی ہے، اور وہی کام دیتی ہے، جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کا کیا حال ہے!

اور اگر "تعرف الاشیاء باضدادہا" کی بنا پر پوچھیے کہ چائے کے معاملہ میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہوا؟ تو میں بلا تامّل انگریزوں کا نام لونگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منّت پذیر رہا ہے؛ تاہم یہ نزدیکانِ بے بصر حقیقتِ حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انھیں چھو بھی نہیں گیا۔ جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلّدوں کا جو حال ہوگا، معلوم ہے:

آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانۂ[۳۱]

انھوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا، مگر اور کچھ سیکھ نہ سکے۔ اوّل تو ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتّی ان کے ذوقِ چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے یک قلم گندہ کر دینگے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اس گندے مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرینِ فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔ کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے مقصود انہی پتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے، تو اس کے لیے ماہرینِ فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے! جو پتّی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے، اور ایک تیز بو پیدا ہو جائے، چائے ہے؛ اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی

مقدار میں گندگی پیدا کردی جا سکتی ہے ۔ چاے کا ایک ماہرِ فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائیگا!

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اور کیا کہنے کو ہیں؟[۴۲]

اگرچہ فرانس اور برِّاعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہوا، تاہم اعلیٰ طبقہ کے لوگ چاے کا بھی شوق رکھتے ہیں، اور ان کا ذوق بہرحال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چاے پییں گے، اور اگر سیاہ چاے پییں گے بھی، تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے یا لیموں کی ایک قاش کے ساتھ، جو چاے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی، بلکہ اور نکھار دیتی ہے ۔ یہ لیموں کی ترکیب دراصل روس، ترکستان اور ایران سے چلی۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چاے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا۔ بعض ایرانی بھی دَور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے:

سرِ ایں فتنہ ز جائیست کہ من می دانم![۴۳]

اب اِدھر اک اور نئی مصیبت پیش آگئی ہے۔ اب تک تو صرف شکر کی عام قسم ہی کے استعمال کا رونا تھا، لیکن اب معاملہ صاف صاف گڑ تک پہنچنے والا ہے۔ ہندوستانِ قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا، تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کرکے لال شکر بنانے لگے تھے ۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دور تھی، مگر ناصاف گڑ سے[۴۴] ایک قدم آگے نکل آئی تھی ۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی، تو اس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا؛ لیکن اب پھر دنیا اپنی ترقیِ معکوس میں اُسی طرف لوٹ رہی ہے، جہاں سے سیکڑوں برس پہلے آگے بڑھی تھی، چنانچہ آج کل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے ۔ وہاں کے اہلِ ذوق کہتے ہیں، کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی اور جیسا کہ قاعدہ مقررہ ہے

اب اُن کی تقلید میں یہاں کے اصحابِ ذوق بھی "براؤن شوگر" کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشینگوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ براؤن شکر کا ہلکا سا پردہ بھی اُٹھ جائیگا، اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائیگی۔ یارانِ ذوقِ جدید کہینگے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے، نہ کافی۔ فرمائیے، اب اس کے بعد باقی کیا رہ گیا ہے، جس کا انتظار کیا جائے؟

وائے، گر درپسِ امروز بود فردائے![۳۵]

شکر اور گڑ کی دنیائیں اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں، اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس درجہ نمایاں ہے، انھیں بھی محسوس کراؤں، لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کے رہ گیا۔

بہر حال زمانہ کی خفیفت فراموشیوں پر کہاں تک ماتم کیا جائے:

کوتہ نتواں کرد کہ ایں قصہ دراز ست![۳۶]

آئیے، آپ کو کچھ اپنا حال سناؤں۔ اصحابِ نظر کا قول ہے کہ حسن اور فن کے معاملہ میں حبُ الوطنی کے جذبہ کو دخل نہیں دینا چاہیے:

متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد

پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی چائے کے باب میں شاہدانِ ہند کا نہیں، خوبانِ چین کا معتقد ہوں:

دوائے دردِ دلِ خود ازاں مفرح جوے
کہ در صراحیِ چینی و شیشۂ حلبی ست[۳۷]

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل چنگ کائی شک [38] اور میڈم چنگ [39] وہاں سے آئے تھے، بلکہ اس لیے کہ چاے وہیں سے آتی ہے:

مَے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما ندانیم کہ بسطامے و بغدادے ہست [40]

ایک مدت سے جس چینی چاے کا عادی ہوں، وہ "وھائٹ جیسمین" (White Jasmine) کہلاتی ہے۔ یعنی "یاسمنِ سفید" یا ٹھیٹ اردو میں یوں کہیے کہ "گوری چنبیلی":

کسے کہ محرمِ رازِ صباست، مے داند
کہ باوجودِ خزاں بُوے یاسمن باقی ست [41]

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اُتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں! لوگوں نے آتشِ سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے:

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند [42]

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چاے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کرکے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔ ملا محمد مازندرانی صاحبِ بت خانہ نے اگر یہ چاے پی ہوتی، تو خانخاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا:

نہ می ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب
تو گویی کہ حل کردہ اند آفتاب

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہوئی، تو اس کا اثر چاے پر بھی پڑا۔ میں

کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے منگوایا کرتا تھا، اس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبّے مل گئے تھے، اور بعض چینی دوستوں نے بطور تحفہ کے بھی بھیج کر چارہ سازی کی تھی جب کلکتہ سے نکلا، تو ایک ڈبّہ ساتھ تھا، ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئی سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا، تو سامان کے ساتھ وہ بھی آگیا اور پھر قبل اس کے کہ ختم ہو، گھر والا ڈبّہ بھی پہنچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی ہو، لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی، تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی؛

حافظ! دگر چہ می طلبی از نعیم دہر؟
مے می خوری و طرّۂ دلدار می کشی[۴۳]

اس کی فکر کبھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبّہ چلیگا کب تک! کیونکہ خواجۂ شیراز کی موعظت ہمیشہ پیشِ نظر رہتی ہے:

تا ساغرت پُرست، بنوشان و نوش کن![۴۴]

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں، اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دُور واقع ہوئی ہے! عمریں گزر جائیں، پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوقِ لطیف کا شہرستانِ کیف و سُرور اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں![۴۵]

جواہر لال بلاشبہہ چائے کے عادی ہیں، اور چائے پیتے بھی ہیں، خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی۔ لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے،

شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی لپیچو و پینچو ہی کی قسموں پر قانع رہتے[46] ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بیسود تھا، بلکہ "وضع الشئ فی غیر محلہ" کے حکم میں داخل تھا:

مے یہ زہّاد مکن عرضہ کہ ایں جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد[47]

ان حضرات میں سے صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی، اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے، مگر اچھی ہے یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا، جو وہ روز پیا کرتے ہیں، مگر یہ بھی چنداں بُری نہیں۔ زمانے کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے، یہ ان کی صرف "اچھی ہے" کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انھیں بُلا لیا کرتا تھا کہ آیئے، ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجیے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت ست!

ان کے لیے یہ صرف "اچھی" ہوئی۔ یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے، اگر یہ "اچھی ہے" ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشمِ کم مبیں
ہیں، نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم![48]

مگر ایک ڈبّہ کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہو جانے پر آیا۔ چیتہ خان نے یہاں دریافت کرایا، پونا بھی لکھا، لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے۔ دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے! ایک ہفتہ سے وہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پر جی رہا ہوں:

نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل![49]

آج کل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوران[50] کھل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے، اس لیے یہاں بھی ایک چینی رسٹوران کھل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چاے ضرور ہوگی۔ اُس نے خالی ڈبّہ بھیج کر دریافت کرایا۔ انھوں نے ڈبّہ دیکھتے ہی کہا کہ یہ چاے اب کہاں مل سکتی ہے! لیکن تمھیں یہ ڈبّہ کہاں سے ملا؟ اور اس چاے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آرہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا، اُس نے ہر چند باتیں بنائیں، مگر اُن کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چنگ کائی شیک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آرہی ہے اور اُس کے لیے چینی چاے کا اہتمام کیا جارہا ہے:

ببیں کہ نقشِ مُعمّا چہ باطل افتادست[51]

چاے کے ڈبّے کی تہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتّوں کا چُورا بیٹھ جایا کرتا ہے، اور اُسے ڈبّے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبّہ ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا اُس کی تہ میں بھی جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں! لیکن چیتہ خان نے دیکھا، تو کہا، آج کل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے۔ یہ چُورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے؟ میں نے بھی سوچا کہ

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست، دم درکش

کہ ہر چہ ساقیِ ما ریخت، عینِ الطاف است[52]

چنانچہ یہ چُورا بھی کام میں لایا گیا اور اس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر پتیا رہا۔ جب فنجان میں چاے ڈالتا تھا، تو ان ذرّوں کی زبانِ حال پکارتی تھی:

ہر چند کہ نیست رنگ و بُویم

آخر نہ گیاہِ باغ اُویم[53]

اس تخیّل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف وسرور کا جام لے رہا ہوں، توسنِ فکر کی جولانیوں کے لیے "تازیانہ" کا کام دیا، اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ ہا، مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا:

اگر دماغم دریں شبستاں، خمارِ شرمِ عدم نگیرد
زچشمکِ ذرّہ جام گیرم، بآں شکوہے کہ جم نگیرد
دریں قلمرو کفِ غبارم، بہ ہیچ کس ہمسری ندارم
کمالِ میزانِ اعتبارم، ہمیں بس است، کز ذرّہ کم نگیرد [54]

اس تجربے کے بعد بے اختیار خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سرجوشِ خُم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں، تو کاش، اس تہ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں، غالب نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
یوں ہے کہ، مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے [55]

شکر کے مسئلہ نے بھی یہاں آتے ہی سر اٹھایا تھا، مگر مجھے فوراً اس کا حل مل گیا، اور اب اس طرف سے مطمئن ہوں۔ موٹے دانوں کی شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ جب ختم ہو گئی، تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مل جائیگی۔ نہیں ملی، تو ڈبیوں کے بکس تو ضرور مل جائینگے۔ لیکن جب بازار میں دریافت کرایا، تو معلوم ہوا، امن کے وقتوں میں بھی یہاں اِن چیزوں کی مانگ نہ تھی، اور اب کہ جنگ کی رکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں، اُن کا سراغ کہاں مل سکتا ہے! مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اسے کُٹوا کر شکر کی طرح کام میں لاؤں، لیکن کُوٹنے کے لیے ہاون کی ضرورت ہوئی، جیلر سے کہا، ایک ہاون اور ہاون دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون

ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کبھی کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں!

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر
بسر نہ کوفتہ باشد درِ سرائے را [56]

مجبوراً میں نے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں اور بہت سا ردّی کاغذ اوپر تلے دَھر دیا۔ پھر ایک پتھر اٹھا کر ایک قیدی کے حوالہ کیا جو یہاں کام کاج کے لیے لایا گیا ہے کہ اپنے سر کی جگہ اِسے پیٹ:

دریں کہ کوہکن از ذوق داد جاں چہ سخن
ہمیں کہ تیشہ بسر دیر زد، سخن باقی ست [57]

لیکن یہ گرفتارِ آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا! [58]

کہ ایک چوٹ بھی قرینہ کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کٹنے سے رہی، البتّہ کاغذ کے پُرزے پُرزے اڑ گئے اور کپڑے نے بھی اس کے رُوئے صبیح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا!

چلی تھی برچھی کسی پر، کسی کے آن لگی! [59]

بہر حال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا۔ "زشت" اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا انگھڑ ظرفِ نظر سے نہیں گزرا تھا۔ آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسطِ ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں، یہ ہاون بھی اُسی قبیلے کی دست کاریوں کا بقیّہ ہو، اور اس انتظار میں گردشِ لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعۂ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے، اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انھیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت

پیش آتی ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں[60]

خیر کچھ ہو، مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی؛ لیکن اب کُٹی ہوئی مصری موجود ہے، تو وہ چیز موجود نہیں، جس میں مصری ڈالی جائے:

اگر دستِ کنم پیدا، نمی یابم گریباں را[61]

دیکھیے، صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہوگئی، مگر بائیس صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی:

یک حرف بیش نیست سراسر حدیثِ شوق
ایں طرفہ تر کہ ہیچ بہ پایاں نمی رسد!![62]

ابوالکلام

(۱۶)

قلعۂ احمد نگر

۷ جنوری ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ سردی اپنے پورے عروج پر ہے، کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے۔ ہوا کے برفانی جھونکے دمبدم آرہے ہیں۔ چاے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ چھے منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجہ پر آجائے، تو دَور شروع کروں۔ دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اُٹھ چکی ہے، مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے۔ خواجہ شیرازی کا ترانۂ صبحگاہی دل و دماغ میں گونج رہا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں، مگر ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں دیتا؛ ناچار نوکِ قلم کے حوالہ کرتا ہوں!

صبح ست ژالہ می چکد از ابرِ بہمنی　　برگِ صبوح ساز و بزن جامِ یک منی
گر صبحدم خمار ترا دردِ سر دہد　　پیشانیٔ خمار ہماں بہ کہ بشکنی
ساقی! بہوش باش، کہ غم در کمین ماست　　مطرب! نگاہ دار ہمیں رہ کہ مے زنی
ساقی، بہ بے نیازیٔ یزداں کہ مے بیار　　تا بشنوی ز صوتِ مغنی: ہو الغنی

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، کبھی اِس طرف بھی آپ کا گزر ہوا ہے یا نہیں! اور اگر ہوا ہے، تو کس موسم میں! لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہونگے۔ ڈسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے بھی یاد ہے، جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے

موقع پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی ۔ پونا یہاں سے[2] صرف اسّی میل کی مسافت پر واقع ہے، اور دکن کا یہ تمام حصّہ ایک ہی سطح مرتفع ہے ۔ اس لیے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجیے ۔ علاوہ بریں وقت کے زندانی کچھ پونا میں رکھے گئے ہیں، کچھ یہاں ، اس لیے ویسے بھی اہلِ قیاس کے نزدیک بقولِ عرفی دونوں کا حکم ایک ہی ہوا :

یکے ست نسبتِ شیرازی و بدخشانی[3]

فیضی[4] کو اکبر نے جب سفارت پر یہاں بھیجا تھا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اُسے دو سال تک ہلنے نہیں دیا اور یہاں کے ہر موسم کے تجربے کا موقعہ ملا ۔ اس نے اپنے مکاتیب میں احمد نگر کی آب و ہوا کے اعتدال کی بہت تعریف کی تھی فیضیؔ سے بہت پہلے کا یہ واقعہ ہے کہ ملک التجار شیرازی نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اس ملک میں بارہ مہینے ہوا ے معتدل کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے ۔ خیر، بارہ مہینا کہنا تو صریح مبالغہ تھا ؛ مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں گرمی کے دن بہت کم ہوتے ہیں اور یہاں کی برسات مالوہ کی برسات کی طرح بہت ہی پُر لطف ہوتی ہے ۔ غالباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ بمبئی میں مرزا فرصتؔ شیرازی[5] صاحبِ آثار العجم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ وہ برسات کا موسم پونا میں بسر کر کے لوٹے تھے اور کہتے تھے ، پونا کی ہوا کے اعتدال نے ہواے شیراز کی یاد تازہ کر دی :

اے دل بتو خبر رسندم، تو بُوے کسے داری[6]

میرا ذاتی تجربہ معاملہ کو یہاں تک نہیں لے جاتا ؛ لیکن بہر حال میں شیراز میں مسافر تھا ، اور مرزاے موصوف صاحب البیت تھے ۔ وصاحب البیت ادری بما فیھا![7]

اورنگ زیب جب دکن آیا تھا تو یہاں کے برشکال کا اعتدال اس کی طبع خشک کو بھی ترکیے بغیر نہ رہا تھا۔ آپ نے تاریخ خوافی خان اور مآثر الامراء وغیرہ میں جابجا پڑھا ہوگا کہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا پونا میں بسر کرتا تھا۔ پونا کا نام اس نے "محی نگر" رکھا تھا، مگر زبانوں پر نہیں چڑھا۔ اُس کا انتقال احمد نگر ہی میں ہوا تھا۔[9] جہاں تک اس اعتدال کا تعلق گرمی اور برسات کے موسم سے ہے، اس کے حسن و خوبی میں کلام نہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا سردی کا موسم بھی معتدل ہوتا ہے، حالانکہ سردی کا موسم ایک ایسا موسم ہوا کہ اس میں جس قدر بھی زیادتی ہو، موسم کا حسن اور زندگی کا عیش ہے۔ اس کی کمی نقص و فتور کا حکم رکھتی ہے؛ اسے اعتدال کہہ کر سراہا نہیں جا سکتا۔

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر
زیں رسمہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند![10]

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اوائلِ عمر سے میری طبیعت کا اس بارے میں کچھ عجیب حال رہا ہے۔ گرمی کتنی ہی معتدل ہو، مگر مجھے بہت جلد پریشان کر دیتی ہے، اور ہمیشہ سرد موسم کا خواستگار رہتا ہے۔ موسم کی خنکی میرے لیے زندگی کا اصلی سرمایہ ہے؛ یہ پونجی ختم ہوئی اور گویا زندگی کی ساری کیفیتیں ختم ہو گئیں۔ چونکہ زندگی بہرحال بسر کرنی ہے، اس لیے کوشش کرتا رہتا ہوں کہ ہر موسم سے سازگار رہوں۔ لیکن طبیعت کے اصلی تقاضہ پر غالب نہیں آ سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کا موسمِ سرما اس درجہ تنک مایہ ہے کہ ابھی آیا نہیں کہ جانا شروع کر دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ میری طبع سراسیمہ کے لیے اس صورتِ حال میں صبر و شکیب کی ایک عجیب آزمائش پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک وہ آتا نہیں، اس کے انتظار میں دن کاٹتا ہوں جب آتا ہے، تو اس کی آمد کی خوشیوں میں محو ہو جاتا ہوں؛ لیکن اس کا قیام اتنا مختصر ہوتا

ہے کہ ابھی اس کی پذیرائیوں کے سروبرگ سے فارغ نہیں ہوا کہ اچانک ہجران ووداع کا ماتم سر پر آکھڑا ہوتا ہے:

ہمچو عیدے کہ در ایامِ بہار آمد و رفت![11]

میں آپ کو بتلاؤں، میرے تخیّل میں عیشِ زندگی کا سب سے بہتر تصوّر کیا ہو سکتا ہے! جاڑے کا موسم ہو، اور جاڑا بھی قریب قریب درجۂ انجماد کا؛ رات کا وقت ہو، آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں، اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں، اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں:

من ایں مقام بہ دنیا و عاقبت ندہم
اگرچہ در پیَم افتند خلق انجمنے![12]

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا! وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سننے میں آیا ہے، ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو!

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو![13]

عجیب معاملہ ہے میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصوّر میں آتشدان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے! لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتشدان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا، اگر آتشدان نہ سُلگ رہا ہو۔ پھر آتشدان بھی وہی پرانی روش کا ہونا چاہیے، جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے جلائے جا سکیں؛ بجلی کے ہیٹر[14] سے میری تسکین نہیں ہوتی، بلکہ اسے دیکھ کر طبیعت چڑ سی جاتی ہے۔ ہاں! گیس کے آتشدان کی ترکیب اتنی بے معنی محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ پتھر کے ٹکڑے رکھ کر انگاروں کے ڈھیر کی سی شکل بنا دیتے ہیں، اور اس کے نیچے سے شعلے نکلتے رہتے ہیں؛

کم از کم شعلوں کی نوعیت باقی رہتی ہے۔ پھر بھی میں اسے ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں۔
دراصل میں صرف گرمی ہی کے لیے آتش دان کا شیدائی نہیں ہوں، مجھے شعلوں کا منظر
چاہیے۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں، دل کی پیاس نہیں بجھتی۔ بے دردوں کو
جو دل کی جگہ برف کی سِل سینہ میں چھپائے پھرتے ہیں، ان معاملات کی کیا خبر!

سینۂ گرم نداری، مطلبِ صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرِ ات، عُود مخر! [15]

آپ سن کر ہنسیں گے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ
احساس پیدا کروں، جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر صبح کی چاے پیتا رہا؛
اور اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے:

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم [16]

میری طبیعت کا بھی عجیب حال ہے، دوسروں سے پہلے خود اپنی حالت پر ہنستا ہوں۔
بچپنے میں چند مہینے چنسورہ میں بسر کیے تھے۔ کیونکہ کلکتہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔
یہ جگہ عین دریاے ہوگلی پر واقع [17] ہے۔ میں نے یہیں سب سے پہلے تیرنا سیکھا۔ صبح و شام
گھنٹوں دریا میں تیرتا رہتا، پھر بھی جی سیر نہ ہوتا۔ اب بھی تیراکی کے لیے طبیعت ہمیشہ
ترستی رہتی ہے۔ سبحان اللہ، طبعِ بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھیے! ایک طرف دریا
سے ہمعنانی کا یہ ذوق و شوق، دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی
یہ تشنگی! شاید یہ اس لیے ہو کہ اقلیمِ زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے، تہ میں آگ بھڑکتی
رہتی ہے۔ اسی لیے نکتہ سرایانِ حقیقت کو کہنا پڑا کہ:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
رُوے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست [18]

لوگ گرمیوں میں پہاڑ جاتے ہیں کہ وہاں گرمیوں کا موسم بسر کریں میں نے کئی بار جاڑوں میں پہاڑوں کی راہ لی کہ وہاں جانے کا اصلی موسم یہی ہے۔ متنبیّ بھی کیسا بدذوق تھا کہ لبنان کے موسم کی قدر نہ کر سکا۔ میری زندگی کے چند بہترین ہفتے لبنان میں بسر ہوئے ہیں۔

وجبالُ لُبنانَ، وکیفَ بقطعھا
وھی الشتاءُ، وصیفھن شتاءُ[19]

زندگی کا ایک جاڑا جو موصل میں بسر ہوا تھا مجھے نہیں بھولتا۔ موصل اگرچہ جغرافیہ کی لکیروں میں معتدل خطّہ سے باہر نہیں ہے، لیکن گرد و پیش نے اسے سردسیر حدود میں داخل کر دیا ہے اور کبھی کبھی تو دیار بکر میں ایسی سخت برف پڑتی ہے کہ جب تک سڑکوں کی کھدائی نہ ہو لے، گھروں کے کواڑ نہیں کھل سکتے۔ جس سال میں گیا تھا، غیر معمولی برف پڑی تھی۔ برفباری کے بعد جب آسمان کھلتا اور آرمینیا کے پہاڑوں کی ہوائیں چلتیں تو کیا عرض کروں، ٹھنڈک کا کیا عالم ہوتا! مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی سردی کی شدّت کا یہ عالم ہوتا کہ مٹکوں کا ڈھکنا ہٹاتے، تو پانی کی جگہ برف کی سِل دکھائی دیتی، لیکن میں پھر بھی سردی کی بے اعتدالیوں کا گلہ مند نہ تھا۔ جس شیخ کے گھر مہمان تھا اس کے بچّے دن بھر برف کے گولوں سے کھیلتے رہتے اور کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی گولی منھ میں بھی ڈال لیتے۔ ستّی کبیرہ[21] یعنی شیخ کی ماں کا لونڈیوں کو حکم تھا کہ میرا آتشدان چوبیس گھنٹے روشن رکھیں، خود بھی دن میں دو تین مرتبہ پکار کے مجھ سے پوچھ لیا کرتیں کہ مجمرہ[22] کا کیا حال ہے؟ ایک لوہے کی کیتلی آتشدان کی محراب میں زنجیر سے لٹکتی رہتی اور پانی ہر وقت جوش کھاتا رہتا۔ جس وقت چاہو، قہوہ بنا کر گرم گرم پی لو۔ چونکہ دیر تک جوش کھائے ہوئے پانی میں چاے یا کافی بنانا ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں اسے اُتار کر رکھ دیا کرتا، لیکن لونڈی پھر لٹکا دیتی اور کہتی کہ ستّی کا حکم ایسا ہی ہے چاے بنانے کا یہی

طریقہ میں نے شمالی ایران کے عام گھروں میں بھی دیکھا۔ آتشدان کی آگ صرف کمرہ گرم کرنے ہی کے کام میں نہیں لائی جاتی، بلکہ باورچی خانہ کا بھی آدھا کام دے دیتی ہے۔ لوگ آتشدان کی آگ پر چاے کا پانی بھی گرم کر لیتے ہیں، اور کھانا بھی پکا لیتے ہیں۔ اگر شمالی ایران کے لوگ ایسا نہ کریں، تو اتنا ایندھن کہاں سے لائیں کہ کمروں کو بھی گرم رکھیں اور باورچی خانہ کا چولھا بھی سلگتا رہے! وہاں کے مکانوں میں آتشدان اتنے کشادہ ہوتے ہیں کہ کئی کئی دیگچیاں اُن میں بیک وقت لٹک سکتی ہیں۔ آتشدان کی محراب میں تعمیر کے وقت حلقے ڈال دیے جاتے ہیں، ٹھیک اُسی طرح کے جیسے ہمارے مکانوں کی چھتوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ انہی حلقوں میں زنجیر ڈال دی، اور کیتلی یا دیگچی لٹکا دی۔ بعض شہروں میں سرایوں کے ہر کمرہ میں آتشدان بنا ہے۔ جاڑوں میں سرایچی[۲۳] اسی آتشدان پر پلاؤ دم کر کے آپ کو کھلا دیگا اور کہیگا: "چاے گرم مگذارید و بخورید!"

اگست کے مہینے میں جب ہم یہاں لائے گئے، تو بارش کا موسم عروج پر تھا، اور ہوا خوشگوار تھی۔ بالکل ایسی فضا بنی تھی، جیسی آپ نے جولائی اور اگست میں پُونا کی دیکھی ہوگی۔ پانی یہاں عام طور پر بیس پچیس انچ سے زیادہ نہیں برستا، لیکن پانی کی دو چار بوندیں بھی کافی خوشگواری پیدا کر دیتی ہیں۔ اُمس بہت کم ہوتی ہے، ہوا برابر چلتی رہتی ہے۔

ستمبر اور اکتوبر اسی عالم میں گزرا۔ لیکن جب نومبر شروع ہوا تو طبیعت اس خیال سے افسردہ رہنے لگی کہ یہاں کی سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر جو پچھلا جاڑا یہاں بسر کر چکا ہے، کہتا تھا کہ پُونا سے کچھ زیادہ سردی تھی، لیکن وہ بھی بمشکل دس بارہ دن تک رہی ہوگی۔ عام طور پر ڈسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے، جیسا دلی اور پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دنوں کا ہوتا ہے۔ ان خبروں نے

طبیعت کو بالکل مایوس کر دیا تھا، لیکن جونہی ڈسمبر شروع ہوا موسم نے اچانک کروٹ لی۔ دو دن تک بادل چھایا رہا اور پھر جو مطلع کھلا، تو کچھ نہ پوچھیے، موسم کی قیا ضیوں کا کیا عالم ہوا! دہلی اور لاہور کے چلّہ کا مزہ یاد آ گیا۔ یہاں کے کمروں میں بھلا آتشدان کہاں! لیکن اگر ہوتا، تو موسم ایسا ضرور ہو گیا تھا کہ میں لکڑیاں چننی شروع کر دیتا۔ چیتہ خان جو ہر وقت خاکی تخفیفہ (یعنے شارٹ[24]) پہنے رہتا تھا، یکایک گرم سوٹ پہن کر آنے لگا اور کہنے لگا کہ سردی سے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ چھاؤنی سے خبر آئی کہ ایک انگریز سپاہی جو رات کے پہرہ پر تھا، صبح نمونیا میں مبتلا پایا گیا، اور شام ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ ہمارے قافلہ کے زندانیوں کا یہ حال ہوا کہ دوپہر کے وقت بھی چادر جسم سے کھچی رہنے لگی۔ جسے دیکھو، سردی کی بیجا ستانیوں کا شاکی ہے، اور دھوپ میں بیٹھ کر تیل کی مالش کرا رہا ہے کہ تمام جسم پھٹ کر چھلنی ہو گیا۔ حتیٰ کہ جو صاحب دہلی اور یو۔ پی کے رہنے والے ہیں، اور نینی تال کے موسم کے عادی رہ چکے ہیں، وہ بھی یہاں کے جاڑے کے قائل ہو گئے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق[25]

ضلع کا کلکٹر اسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ وہ آیا، تو کہنے لگا کہ سالہا سال گزر گئے، میں نے ایسا جاڑا اس علاقہ میں نہیں دیکھا۔ پارا چالیس درجہ سے بھی نیچے اتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں کہ اس سال کونسی نئی بات ہو گئی ہے کہ اچانک پنجاب کی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا، ان بیخبروں کو کیا معلوم کہ ہم زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں۔ رُبَّ اَشعثَ مَدفوعٍ بالاَبوابِ، لَواَقسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَأَبَرَّہٗ۔[26]

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار
بعذر خواہیِ رندانِ بادہ نوش آمد![27]

یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کررہے ہیں، اور میرے دلِ آرزو مند سے اب بھی صدائے ہَل مِن مَزِید[28] اٹھ رہی ہے۔ کلکتہ سے گرم کپڑے آئے پڑے ہیں، میں نے ابھی تک انھیں چھوا بھی نہیں۔ اس ڈر سے کہ اگر گرم کپڑے پہنونگا، تو سردی کا احساس کم ہوجائیگا اور تخیل کو جولانیوں کا موقع نہیں ملیگا، ابھی تک گرمیوں ہی کے لباس میں وقت نکال رہا ہوں۔ البتہ صبح اٹھتا ہوں، تو اونی چادر دُہری کرکے کاندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اور سردی کے موسم کا معاملہ تو وہ ہوگیا، جو نظیری نیشاپوری کو پیش آیا تھا:

اُو در وداع و من بجزع، کز تِے وبہار
رَطلے سہ چار ماندہ درونے سہ چار خوش [29]

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خیال ہوا، تمہید ہی میں گیارہ صفحے سیاہ ہوگئے اور ابھی تک حرفِ مدّعا زبانِ قلم پر نہیں آیا: تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی و انتظار کے بعد پرسوں چیتہ خان نے مژدۂ کامرانی سنایا کہ بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہائٹ جیسمین چاے کہیں سے ڈھونڈھ نکالی ہے اور ایک پونڈ کا پارسل وی پی کردیا ہے۔ چنانچہ کل پارسل پہنچا۔ چیتہ خان نے اُس کی قیمت کا گلہ کرنا شروع کردیا کہ تھیں ایک پونڈ چاے کے لیے اتنی قیمت دینی پڑی۔ حال آنکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کی ارزانی نے حیران کردیا ہے۔ اس نایابی کے زمانے میں اگر اسٹور اس سے دوگنی رقم کا بھی طلبگار ہوتا، جب بھی یہ جنسِ گرانمایہ ارزاں تھی:

اے کہ می گوئی: "چرا جامے بجانے می خری"؟
ایں سخن با ساقیِ ما گو کہ ارزاں کردہ است [30]

حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ اِدھر یہ پارسل پہنچا، اُدھر بمبئی سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبّے چینی دوستوں سے لے کر بھجوا دیے۔ اب گرفتاری کا زمانہ جتنا بھی طول کھینچے چاے کی کمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

بہرحال جو بات کہنی چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس ایک واقعہ نے صبح کے معاملہ کی پوری فضا بدل دی اور رُجوئے طبعِ افسردہ کا آبِ رفتہ پھر واپس آگیا۔ اب پھر وہی صبح کی مجلسِ طرب آراستہ ہے، وہی طبعِ سیہ مست کی عالم فراموشیاں ہیں اور وہی فکرِ درماندۂ کار کی آسماں پیمائیاں:

گوہرِ مخزنِ اسرار ہماں است کہ بود
حقّۂ مہر بداں مُہر و نشاں است کہ بود
حافظا، باز نما قصّۂ خونابۂ[31] چشم
کہ دریں چشمہ ہماں آب رواں است کہ بود[32]

اُبوالکلام

(۱۷)

قلعۂ احمد نگر
۹ جنوری ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

انانیتی ادبیات (Egotistic Literature) کی نسبت زمانۂ حال کے بعض نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ یا تو بہت زیادہ دلپذیر ہوگی، یا بہت زیادہ ناگوار، کسی درمیانی درجہ کی یہاں گنجایش نہیں۔ "انانیتی ادبیات" سے مقصود تمام اس طرح کی خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا ایغو (Ego) یعنی "میں" نمایاں طور پر سر اٹھاتا ہے۔ شلاً خود نوشتہ سوانح عمریاں، ذاتی واردات و تاثرات، مشاہدات و تجارب، شخصی اسلوب نظر و فکر۔ میں نے "نمایاں طور" کی قید اس لیے لگائی کہ اگر نہ لگائی جائے، تو دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جائیگا کیونکہ غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنّفات میں مصنّف کی انانیت اُبھر سکتی ہے اور ابھرتی رہتی ہے۔ اگر اس اعتبار سے صورتِ حال پر نظر ڈالیے، تو ہماری درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچالے جا سکتے ہیں، مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیرِ غائب اور ضمیرِ مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں، لیکن ضمیرِ متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہیگی۔ ہم جہاں جاتے ہیں، ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے۔ ہماری کتنی ہی خود فراموشیاں ہیں جو دراصل ہماری خود پرستیوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نکتہ شناسِ حقیقت کو کہنا پڑا تھا:

فقلت لھا: "ما اذنبتُ؟" قالت مُجیبۃً
"وجودُكَ ذنبٌ لا یُقاسُ بہ ذنبُ!"[2]

کل ایک زیرِ تسوید کتاب کا ایک خاص مقام لکھ رہا تھا کہ بحث کی مناسبت سے قولِ مندرجۂ صدر ذہن میں تازہ ہوگیا اور اس وقت حسبِ معمول صبح کو لکھنے بیٹھا، تو بے اختیار سامنے آگیا۔ آیئے آج تھوڑی دیر کے لیے رُک کر اس معاملہ پر غور کرلیں۔
ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مصوّر، ایک اہلِ قلم کی "انانیت" (Egotism) کیا ہے؟
ابھی نہ تو فلسفۂ اخلاق کے مذہبِ انا (Egoism) کا رُخ کیجیے، نہ خودی (I-amness) مصطلحۂ تصوّف میں جایئے۔ صرف ایک عام تحلیلی زاویۂ نگاہ سے معاملہ کو دیکھیے۔ آپ کو صاف دکھائی دیگا کہ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کی فنکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اگر دبانا چاہتا ہے، تو اور زیادہ اُبھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے! ابوالعلاء معرّی نے جب اپنا مشہور لامیّہ کہا تھا:[3]

اَلا فی سبیلِ المجدِ ما انا فاعلُ
عَفافٌ وَاِقدامٌ وَحَزمٌ وَنائلُ

یا جب ابو فراس حمدانی نے اپنا لافانی رائیۃ کہا:[4]

أراكَ عصیَّ الدّمعِ شیمتُكَ الصّبرُ
امّا للھویٰ نَھیٌ علیكَ وَلا أمرُ

یا جب ابنِ سناء الملک نے اپنے زمانہ کو مخاطب کیا تھا:[5]

وَاِنكَ عبدی یا زمانُ، وَاِنّنی ... علی الرّغمِ منّی ان اری لكَ سیّدًا
وَما اَنا راضٍ اِنّنی واطئُ الثّریٰ ... وَلی ھمۃٌ، لاترتضی الاُفقَ مقعدًا

یا جب فردوسی کے قلم سے نکلا تھا:

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی[۶]

یا مثلاً جب فیضی نے نل دمن نظم کرتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

امروز نہ شاعرم، حکیم
دانندۂ حادث و قدیم
ہر موے زمن تمام گوش ست
خاموشیِ من بصد خروش ست
ایں بادہ کہ جوش زد از ایاغم
خونے ست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بورطۂ دل افتاد
کیں موج گہر بساحل افتاد
بگداختہ آبگینۂ دل
آئینہ دہم بدستِ محفل
آنم کہ بسحر کاریِ ژرف
از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگِ قلم دریں شبِ تار
بس معنیِ خفتہ کردہ بیدار
می ریخت ز سحر کاری ژرف
از صبح ستارہ و زمن حرف
ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار
ناقوس نہفتہ ام بہ زنّار
ایں گل کہ بہ بوستاں نثاری ست
از من بہ بہار یادگاری ست

یا جب ہمارے میر انیس نے کہا تھا:[۸]

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تو یہ محض شاعرانہ تعلّیاں نہ تھیں؛ یہ اُن کی پُرجوش انفرادیت تھی، جو بے اختیار چیخ رہی تھی!

لیکن ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں، انانیّت کا یہ شعور کچھ اس نوعیت کا واقع ہوا ہے کہ ہر انفرادی انانیّت اپنے اندرونی آئینہ میں جو عکس ڈالتی ہے، بیرونی آئینوں میں اُس سے بالکل اُلٹا عکس پڑنے لگتا ہے۔ اندر کے آئینہ میں ایک بڑا وجود دکھائی دیتا ہے،

باہر کے تمام آیینوں میں ایک چھوٹی سے چھوٹی شکل اُبھرنے لگتی ہے:

خودی آیینۂ دارد کہ محروم ست اظہارش [9]

یہی صورت حال ہے، جہاں سے ہر مصنّف کی جو خود اپنی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہے، ساری مشکلیں اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ جب کہ خود اپنے عکس کو جو اُس کے اندرونی آیینہ میں پڑ رہا ہے، جھٹلا نہیں سکتا، تو اچانک کیا دیکھتا ہے کہ باہر کے تمام آیینے اُسے جھٹلا رہے ہیں۔ جو "میں" خود اس کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے، وہی دوسروں کی نگاہوں میں یکسر غیر اہم ہو رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے، جیسے ایک مصوّر تصویر کھینچنے کے لیے مُوقلم اٹھائے مگر اُسے یقین ہو کہ میں کتنی ہی مصوّرانہ قوّت کام میں لاؤں، میری نگاہ کے سوا اور کوئی نگاہ اس مرقّع کی دلآویزی نہیں دیکھ سکیگی:

آیینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما [10]

اس مشکل سے صرف خال خال مصنّف ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی "انانیت" کو بغیر کسی نمایشی وضع میں سجائے، دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دنیا کے سامنے اُن کی "انانیت" آئی، مگر اس طرح آئی، جیسے ایک بےتکلف آدمی بغیر سج دھج بنانے سامنے آکھڑا ہو۔ یہ بات کہ ایک آدمی بغیر کسی بناوٹ کے اپنی واقعی صورت میں سامنے آگیا، نمودِ حقیقت کی ایک خاص دلکشی رکھتی ہے، اور اسی لیے دنیا کی نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ جو خاص خاص ادیب ایسا کر سکے، اُن کی "میں" خود اُن کے لیے کتنی ہی بڑی اور دوسروں کے لیے کتنی ہی چھوٹی واقع ہوئی ہو، لیکن دنیا اُس کی دلپذیری سے انکار نہ کر سکی۔ دنیا کو ان کی انانیّت کی مقدار ناپنے کی مہلت ہی نہیں

ملی، وہ اُس کی بےتکلّفانہ واقعیّت دیکھ کر بے خود ہو گئی۔

ایک آدمی جب اپنی تصویر اُتروانی چاہتا ہے، تو خود اُسے اِس کا شعور ہو یا نہ ہو لیکن اس خواہش کی تہ میں اس کی انانیت کی ایک دھیمی آواز ضرور بولنے لگتی ہے۔ تصویر اُتروانے کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت وہ ہے، جسے مصوّرانہ وضع (Pose) سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی تصویر اُتروانے کے لیے ایک خاص طرح کا انداز بہ تکلّف اختیار کر لینا۔ ایک ماہرِ فن مصوّر جانتا ہے کہ کس چہرے اور جسم کی مصوّرانہ وضع کیسی ہونی چاہیے! وہ جب تک نشست و وضع کی نوک پلک درست نہیں کر لیگا، تصویر نہیں اُتاریگا۔ سو میں ننانوے آدمیوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ نشست اور ڈھنگ سجا کے تصویر اُتروائیں۔ لیکن فرض کرو، ایک آدمی بغیر کسی تیّاری اور وضعی انداز کے آلۂ انعکاس کے سامنے آ گیا، اور اسی عالم میں اُس کی تصویر اتر آئی، تو ایسی تصویر کس نگاہ سے دیکھی جائیگی؟ ایسی تصویر محض اس لیے کہ بیساختگی اور واقعیّت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر پیش کرتی ہے، یقیناً ایک خاص قدر و قیمت پیدا کریگی، اور جس صاحبِ نظر کے سامنے جائیگی، اس کی توجّہ اپنی طرف کھینچ لیگی۔ وہ یہ نہیں دیکھیگا کہ جس کی تصویر ہے، وہ خود کیسا ہے؛ وہ اس میں محو ہو جائیگا کہ خود تصویر کتنی بیساختہ ہے!

بعینہٖ یہی مثال اس صورتِ حال کی بھی سمجھ لیجیے۔ جو مصنّف اپنی انانیت کی بیساختہ تصویر کھینچ دے سکتے ہیں، وہ اس معاملہ کی ساری مشکلوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچی، لیکن یہ بات اس کی دلآویزی میں کچھ مخل نہ ہو سکی کیونکہ تصویر بےتکلّف اور بیساختہ کھینچی۔ وہ لوگوں کو باعظمت دکھائی دے یا نہ دے، لیکن اس کی بیساختگی کی گیرائی سب کی نگاہوں کو تھا لیگی۔ ایسے ہی مصنّف ہیں جو اپنی انانیّت کو لافانی دلپذیری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہے۔ کبھی وہ سوتی رہتی ہے کبھی جاگ اٹھتی ہے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اور پھر کبھی زور شور سے اُچھلنے لگتی ہے۔ انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی نشو ونما کی محتاج ہوئی جس طرح ہر انسان کا ذہن وادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا، اُسی طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتا۔ مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں، شاعروں، مصوّروں اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں۔ اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے، مگر دھیمے سُروں میں بولتی ہے۔ بعضوں کی انفرادیت اتنی پُر جوش ہوتی ہے کہ جب کبھی بولیگی، سارا گردوپیش گونج اُٹھیگا:

یک بار نالہ کردہ ام از درد اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدا می تواں شنید ۱۱

اسی لیے ایک عرب شاعر کو کہنا پڑا تھا:

وما الدّھر الّا من رُواۃ قصائدی
اذا قلتُ شعراً أصبح الدّھر مُنشداً ۱۲

ایسے افراد اپنی "میں" کا سر جوش کسی طرح نہیں دبا سکتے۔ ان کی خاموشی بھی چیخنے والی، اور ان کا سکون بھی تڑپنے والا ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت دبانے سے اور زیادہ اُچھلنے لگیگی۔ ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں، تو اس میں قصد، بناوٹ، اور نمایش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سرتا سر حقیقتِ حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے۔ فیضی کی ایک ایسی ہی چیخ تھی جو اِس وقت تک ہمارے سامعہ سے ٹکرا رہی ہے:

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما
جوشِ آتش بود امروز بہ فوّارۂ ما ۱۳

لیکن ہر قانون کی طرح یہاں بھی مستثنیات ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے مسرحِ (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی اَنانیّت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی، بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے، یعنی خود انھیں ان کی انانیّت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے، اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی اَنانیت کی پرچھائیں جب کبھی پڑیگی، تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا، اس کے ابعادِ ثلاثہ (Dimensions) ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہونگے!

ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑیگا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جاسکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین انھیں اپنے کلّیوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کرلینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں، "میں"، بولتے رہیں۔ ان کی ہر "میں" اُن کی ہر "وہ" اور "تم" سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوتی ہے!

انانیتی ادبیات کی کوئی خاص قسم لے لیجیے۔ مثلاً خود نوشتہ سوانح و واردات، اور پھر مثال کے لیے بغیر کاوش کے چند شخصیتیں چُن لیجیے مثلاً سینٹ آگسٹائن[14] (St Augustine) رؤسو[15] (Rousseau) اسٹرنڈبرگ[16] (Strindberg) ٹالسٹائی[17]، اناطول فرانس[18]، آندرے ژید[19] (Andre' Gide)۔ ان کے خود نوشتہ سوانح چھ مختلف نوعیتوں کی چھ مختلف تصویریں ہیں، لیکن سب نے یکساں طور پر ادبیاتِ عالم میں دائمی جگہ حاصل کرلی، کیونکہ تصویریں بیساختہ اور واقعی ہیں۔ مشرقی ادبیات میں مثلاً غزالی[20]، ابن خلدون[21]، بابر[22]، جہانگیر[23] اور ملّا عبد القادر بدایونی[24] کے خود نوشتہ حالات سامنے لائیے۔ ہم کتنی ہی مخالفانہ نگاہوں سے انھیں پڑھیں، لیکن اُن کی دلآویزی کے مطالبے سے انکار نہیں کرسکتے۔ غزالی نے اپنے فکری انفعالات کی سرگزشت سُنائی۔ ابنِ خلدون نے اپنے تعلیمی اور سیاسی علائق کی داستان سرائی کی۔ بابر نے جنگ

اور امن کے واقعات و واردات قلم بند کیے۔ جہانگیر نے تختِ شہنشاہی پر بیٹھ کر وقائع نگاری کا قلمدان طلب کیا۔ ان سب میں ان کی انانیتیں بے پردہ بول رہی ہیں۔ ہم انھیں خود ان کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ تاہم دیکھتے ہیں اور ان کی لافانی دلآویزی سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بغیر کسی بناوٹ کے سامنے آگئی ہیں۔

بدایونی کا معاملہ اوروں سے الگ ہے؛ طبقۂ عوام کا ایک فرد جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کر کے علماء کے حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کرلی۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز ابھرتی ہے، تو وہ اس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب، اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے، بلکہ قدم قدم پر انکار و تبرّی کی دعوت دیتی ہے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ اس پر بھی ہم اپنی نگاہوں کو اس کی طرف اٹھنے سے روک نہیں سکتے! ہم اسے پسند نہیں کرتے، پھر بھی اسے پڑھتے ہیں اور جی لگا کر پڑھتے ہیں۔ غور کیجیے، یہ وہی بات ہوئی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم سوچ رہے تھے: جس شخص کی یہ تصویر ہے، وہ خود خوبصورت نہیں ہے، لیکن تصویر بحیثیت ایک تصویر کے خوبصورت ہے۔ اس لیے ہماری نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ صاحبِ تصویر نہیں تھا جس نے ہماری نگاہوں کو کھینچا؛ یہ تصویر کی بیساختگی تھی، جس کے بلاوے کی کشش سے ہم اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔

ٹالسٹائی غالباً ان خاص شخصوں میں سے تھا جن کی انانیت کی مقدار اضافی ہونے کی جگہ ایک مطلق نوعیت رکھتی تھی۔ اس کی انانیت خود اسے جتنی بڑی دکھائی دی، دنیا نے بھی اسے اتنا ہی بڑا دیکھا۔ پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں شاید ہی وقت کا کوئی مصنف اس خود اعتمادی کے ساتھ "میں" بول سکا جس طرح یہ عجیب و غریب روسی بولتا رہا۔ اس کے خود نوشتہ حالات، اس کے شخصی واردات و تاثرات؛

اس کے مختلف وقتوں کے مکالمے اور روزنامچے، اس کے ادبی اور فنی مباحث، سب میں اس کی انانیت بغیر کسی نقاب کے دنیا کے سامنے آئی اور دنیا اسے عالمگیر نوشتوں کے ساتھ جمع کرتی رہی۔ اس کے خود نوشتہ سوانح جو ایک بے رنگ سادگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس کی "وار اینڈ پیس" اور "اینا کارنینا" سے کم دلپذیر نہیں ہیں، اور در اصل ان دونوں افسانوں میں بھی اس کی انانیت ہی کی صدائیں ہم سُن رہے ہیں۔ زمانہ اس کی قلم کاریوں کا رنگ و روغن ابھی تک مدّھم نہیں کرسکا پچھلی جنگ کے زمانہ میں لوگ "وار اینڈ پیس" از سرِ نو ڈھونڈھنے لگے تھے اور اب پھر ڈھونڈھ رہے ہیں!

موجودہ عہد میں ٹالسٹائی کی عظمت بحیثیت ایک مفکّر کے بہت کم[۲۵] دماغوں کو متوجہ کر سکیگی۔ یورپ اور امریکہ کے دماغی طبقوں میں بہت کم لوگ ایسے نکلینگے، جو اُس کے معاشرتی، فلسفی اور جمالیاتی (Aesthetics) افکار کو اس نظر سے دیکھنے کے لیے تیار ہوں جس نظر سے اس صدی کے ابتدائی دَور کے لوگ دیکھا کرتے تھے؛ تاہم اس کی انانیتی ادبیات کی دلپذیری سے اب بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اس کی عجیب زندگی کا معمّہ اب بھی بحث و نظر کا ایک دل پسند موضوع ہے، ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی نئی کتاب نکلتی رہتی ہے۔

پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دَور میں بکثرت خود نوشتہ سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے ہر چوتھے مصنّف نے ضروری سمجھا کہ اپنی گذری ہوئی زندگی کو آخری عمر میں پھر ایک مرتبہ دہرالے۔ دنیا کے کتب خانوں نے ان سب کو اپنی الماریوں میں جگہ دی ہے، لیکن دنیا کے دماغوں میں بہت کم کے لیے جگہ نکل سکی۔

میں نے ابتدائی سطور میں "ایغو"[۲۶] کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی یونانی (Ego) کی تعریب[۲۷] ہے، جو ارسطو کے عربی مترجموں نے ابتدا ہی میں اختیار کرلی تھی اور پھر فارابی اور

ابنِ رُشد[28] وغیرہما برابر استعمال کرتے رہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فلسفیانہ مباحث میں "اُنا" کی جگہ "ایغو" کا استعمال زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ براہِ راست فلسفیانہ[29] اصطلاح کو رُونما کردیتا ہے، اور ٹھیک وہی کام دیتا ہے جو یورپ کی زبانوں میں "ایگو" دے رہا ہے۔ یہ اُس اشتباہ کو بھی دور کردیگا جو "انا" مصطلحۂ فلسفہ اور "انا" مصطلحۂ تصوف میں باہم دگر پیدا ہوجا سکتا ہے۔ اُردو میں ہم "ایگو" بجنسہٖ لے سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں گاف سے احتراز کرنے کی ضرورت نہیں۔

ابُوالکلام

(۱۸)

حکایتِ زاغ و بلبل

قلعۂ احمد نگر

۲ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

کل عالمِ تصوّر میں حکایتِ زاغ و بلبل ترتیب دے رہا تھا:

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا[1]

اِس وقت خیال ہوا، ایک فصل آپ کو بھی سنا دوں:

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم

آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم[2]

ایک دن صبح چاے پیتے ہوئے، نہیں معلوم سید محمود صاحب[3] کو کیا سوجھی، ایک طشتری میں تھوڑی سی شکر لے کر نکلے، اور صحن میں جابجا کچھ ڈھونڈھنے سے لگے۔

گو یی، ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند[4]

جب اُن کا تعاقب کیا گیا، تو معلوم ہوا چیونٹیوں کے بِل ڈھونڈھ رہے ہیں، جہاں کوئی سوراخ دکھائی دیا، شکر کی ایک چٹکی ڈال دی۔ میں نے جو یہ حال دیکھا تو یہ کہ کر ان کے سمندِ سعی پر ایک اور تازیانہ لگا دیا کہ:

وَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاسِ الْکِرَامِ نَصِیْبُ[5]

کہنے لگے، اس کا ترجمہ کیجیے۔ میں نے کہا، خواجہ شیراز مع اضافہ کے کر چکے ہیں:

اگر شراب خوری، جُرعۂ فشاں بر خاک

ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر، چہ باک[6]

یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریّاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں، دن بھر اُن کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا، ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیے۔ ممکن ہے گوریّاؤں کی زبانِ حال نے انھیں توجّہ دلائی ہو کہ،

نگاہِ لطف کے اُمیدوار ہم بھی ہیں!

چھترہ میں ایک مرتبہ انھوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ، آ کرتے، تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا، لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے، عجیب معاملہ ہے، دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں، اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں؛ گویا دانہ کی پیشکش بھی ایک جرم ہوا؛

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے!
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے [8]

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے، تو عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لیے صبر و شکیب پیدا کیجیے۔ نیازِ عشق کے دعووں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں:

بہ نازکی نہ بری پَے بمنزلِ مقصود
مگر طریقِ رہش از سرِ نیاز کنی
اگر بناز براند، مَرَو کہ آخرِ کار
بصد نیاز بخواند ترا و ناز کنی!

یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی مَیناؤں کے بھی دو تین جوڑے آنکلتے ہیں اور اپنی غُر غُر اور چیو چیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریّاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا، مگر ان آہوانِ ہوائی کے لیے دامِ ضیافت بچھا دیا:

من و آہوے صحرائی کہ دایم می رمید از من [9]

روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے، اور صحن میں جا کھڑے ہوتے۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا، آآ، آآ کرتے جاتے، اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلاے عام مَیناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی، البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوّوں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کوّوں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لیے کہا کہ کبھی انھیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے؛ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے، صدائیں لگائیں اور چل دیے:

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے[10]

بہرحال محمود صاحب آ، آ کے تسلسل سے تھک کر جونہی مڑتے، یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے۔

اے کوتہ آستیناں! تا کے دراز دستی[11]

صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے۔ اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا کہ:

صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے![12]

تو فوراً لبیک لبیک اور "زرحمتِ عالی زیاد" کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں۔

یاراں! صلاے عام ست گر میکنید کارے[13]

کوّوں کی دراز دستیوں سے جو کچھ بچتا، ان کوتاہ دستوں کی کامجوئیوں کا کھاجا بن جاتا۔ پہلے روٹی کے ٹکڑوں پر منھ مارتیں، پھر فوراً گردن اٹھا لیتیں، ٹکڑا چباتی جاتیں، اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے بھی کرتی جاتیں؛ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے

ہوئے بہ طریقِ حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ

گرچہ خوب ست، ولیکن قدرے بہتر ازیں![14]

خیر، بیچاری گلہریوں کا شمار تو اُس سُفرۂ کرم کے ریزہ چینوں میں ہوا؛ لیکن کوّے جنھیں طفیلی سمجھ کر میزبانِ عالی ہمّت نے چنداں تعرّض نہیں کیا تھا، اچانک اس قدر بڑھ گئے کہ معلوم ہونے لگا، پورے احمد نگر کو اس بخششِ عام کی خبر مل گئی ہے اور علاقہ کے سارے کوّوں نے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر یہیں دھونی رمانے کی ٹھان لی ہے۔ بیچاری مَیناؤں کو جو اس اہتمامِ ضیافت کی اصلی مہمان تھیں، ابھی تک خبر بھی نہیں پہنچی تھی؛ اور اب اگر پہنچ بھی جاتی، تو بھلا طفیلیوں کے اس ہجوم میں ان کے لیے جگہ کہاں نکلنے والی تھی:

طفیلی جمع شد چنداں کہ جاے میہماں گُم شد[15]

محمود صاحب کے صلاے عام سے پہلے ہی یہاں کوّوں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب جو اُن کا دسترخوانِ کرم بچھا، تو نقّاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا، آخر اُن سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رُک نہیں سکتیں، تو کم از کم چند دنوں کے لیے ملتوی ہی کر دیجیے، ورنہ اِن تُرکانِ یغماِ دوست کی تُرکتازیاں کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوّوں کو خبر ملی ہے؛ اگر فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں تمام دکن کے کوّے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں، اور آپ کو صائب کا شعر یاد دلائیں کہ

دُوردستاں را باحساں یاد کردن ہمّت ست
ورنہ ہر نخلے بہ پاے خود ثمری افگند[16]

ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا۔

ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی مُنڈیر پر دو معمّر و مشیّن گِدھ بھی تشریف لے آئے ہیں :

پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورتِ مجسّم ! [17]

اور گردن اُٹھائے صلائے سُفرہ کے منتظر ہیں :

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی [18]

معلوم ہوتا ہے، ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد محمود صاحب پر بھی، با ایں ہمہ جُود و سخائے عام، گراں گزری۔ کہنے لگے، بزرگوں نے کہا ہے، گِدھوں کا آنا منحوس ہوتا ہے۔ بہرحال ان حضرات کے بارے میں بزرگانِ سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن کی تشریف آوری ہمارے لیے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ اِدھر اُن کا مبارک قدم آیا، اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لیے اپنا سُفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملے پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ اُن کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھیے، کیا موقعہ سے مومن خان کا قصیدہ یاد آگیا :

شیخ جی! آپ کے آتے ہی ہوا دَیر خراب
قصدِ کعبہ کا نہ کیجے گا باِیں یُمنِ قُدوم! [19]

خیر چند دنوں کے بعد بات آئی گذری ہوئی۔ لیکن کوّوں کے غولوں سے اب نجات کہاں ملنے والی تھی! دریوزہ گروں نے کریم کی چوکھٹ پہچان لی، وہ روز معیّن وقت پر آتے اور اپنے فراموش کار میزبان کو پکار پکار کے دعائیں دیتے :

میاں، خوش رہو، ہم دعا کر چلے! [20]

اسی اثنا میں موسم نے پلٹا کھایا۔ جاڑے نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔ اگرچہ ابھی تک :

اُڑتی سی اک خبر تھی زبانی طیور کی[21]

ہم جب گزشتہ سال اگست میں یہاں آئے تھے، تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔ بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں، لیکن مٹی نے بہت کم ساتھ دیا۔ اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اکتا گئی تھیں اور سبزہ و گل کے لیے ترسنے لگی تھیں۔ خیال ہوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ مشغلہ کا مشغلہ ہوتا ہے، اور اصحابِ صورت اور اصحابِ معنیٰ، دونوں کے لیے سامان ذوق بہم پہنچاتا ہے؛

بہ بُو اصحابِ معنیٰ را، بہ رنگ اصحابِ صورت را[22]

جواہرلال جن کا جوہرِ مستعدی ہمیشہ ایسی تجویزوں کی راہ تکتا رہتا ہے، فوراً کمربستہ ہوگئے۔ اور اس خرابے میں رنگ و بُو کی تعمیر کا سروسامان شروع ہوگیا:

دل کے ویرانے میں بھی، ہو جائے دم بھر چاندنی[23]

اس کارخانۂ رنگ و بُو کے ہر گوشے میں وجود کی پیدایش اور جامۂ ہستی کی آرایش کے لیے دو باتوں کی درستگی ضروری ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ بیج درست ہو:

گر جاں بدہد، سنگِ سیہ لعل نہ گردد
با طینتِ اصلی چہ کند، بدگہر افتاد[24]

دوسری یہ کہ زمین مستعد ہو:

جوہرِ طینتِ آدم زخمیرِ دگر ست
تو توقع زگِلِ کوزہ گراں میداری[25]

چنانچہ یہاں بھی سب سے پہلے انہی دو باتوں کی فکر کی گئی۔ بیج کے لیے چھیتہ خان کو کہہ کر پونا لکھوایا گیا کہ وہاں کے بعض باغوں کے ذخیرے بیجوں کی خوبی و صلاحیت کے لیے مشہور ہیں، لیکن زمین کی درستگی کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ احاطہ کی پوری زمین دراصل قلعہ کی پرانی عمارتوں کا ملبہ ہے۔ ذرا کھودیے اور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے

اور چونے اور ریت کا بُرادہ ہر جگہ نکلنے لگتا ہے۔ درمیانی حصّہ تو گویا گنبدوں اور مقبروں کا مدفن ہے۔ نہیں معلوم، کن کن فرمانرداؤں اور کیسے کیسے پری چہروں کی ہڈیوں سے اس خرابے کی مٹی گوندھی گئی ہے، اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

قدح بشرطِ ادب گیر، زاں کہ ترکیبش
زکاسۂ سرِ جمشید و بہمن ست و قباد [26]

ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین تین فٹ زمین کھود دی گئی، اور باہر سے مٹی اور کھاد منگوا کر انھیں بھرا گیا۔ کئی ہفتے اس میں نکل گئے، جواہر لال صبح و شام پھاوڑا اور کُدال ہاتھ میں لیے کوہ کندن اور کاہ بر آوردن میں لگے رہتے تھے،

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم [28]

اس کے بعد آب پاشی کا مرحلہ پیش آیا، اور اس پر غور کیا گیا کہ کیمسٹری کے حقائق سے فنِ زراعت کے اعمال میں کہاں تک مدد لی جا سکتی ہے! اس موضوع پر اربابِ فن نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کیں، ہمارے قافلہ میں ایک صاحب بنگال کے ہیں۔ جن کی سائینٹفک معلومات ہر موقع پر، ضرورت ہو یا نہ ہو، اپنی جلوہ طرازیوں کا فیاضانہ اسراف کرتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ دقیق نکتہ سُنایا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی خون سے سینچا جائے، تو اُن میں نباتاتی درجہ سے بلند ہو کر حیوانی درجہ میں قدم رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائیگا، اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرنے لگینگے۔ لیکن آج کل جب کہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آ گئی ہے اور اس کے بینک کھل رہے ہیں، بھلا درختوں کے لیے کون اپنا خون دینے کے لیے تیار ہو گا! ایک دوسرے صاحب نے کہا، یہاں قلعہ کے فوجی میس [20] میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں، ان کا خون جڑوں میں کیوں نہ ڈالا جائے! اس پر مجھے ارتجالاً ایک شعر

سوجھ گیا۔ حالآنکہ شعر کہنے کی عادت مدتیں ہوئیں، بھلا چکا ہوں:

کلیوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو مرغی کے خون سے [30]

اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیجیے، تو خیال بندوں کی طرز کا اچھا خاصا شعر ہو جائیگا:

غنچوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے [30]

شوسن کر آصف علی صاحب کے[31] شاعرانہ ولولے جاگ اٹھے۔ انھوں نے اس زمین میں غزل کہنی شروع کردی۔ لیکن پھر شکایت کرنے لگے کہ قافیہ تنگ ہے۔ میں نے کہا 'ویسے بھی یہاں قافیہ تنگ ہی ہو رہا ہے۔

دیکھیے، سمندِ فکر کی وحشت خرامی بار بار جادۂ سخن سے ہٹنا چاہتی ہے اور میں چونک چونک کر باگ کھینچنے لگتا ہوں۔ جو بات کہنی چاہتا تھا، وہ یہ ہے کہ ستمبر اور اکتوبر میں بیج ڈالے گئے، دسمبر[32] کے شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی، اور جنوری آئی، تو اس عالم میں آئی کہ ہر گوشہ مالن کی جھولی تھا، ہر تختہ گل فروش کا ہاتھ تھا: گویا

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود
بیا! باغ تازہ کن آیینِ دینِ زردشتی
کنوں کہ لالہ برافروخت آتشِ نمرود
ز دستِ شاہدِ سیمیں عذارِ عیسیٰ دم
شراب نوش و رہا کن حدیثِ عاد و ثمود [33]

کا عالم طاری ہوگیا۔ لیکن آیینِ زردشتی کے تازہ کرنے کا سامان یہاں کہاں تھا! اور

شاہدِ سیمیں عذار کے انفاسِ عیسوی کی اعجاز فرمائیاں کہاں میسّر آسکتی تھیں! سواس کی کمی عالمِ تصور کی جولانیوں سے پوری کی گئی۔ زمانہ کی تنگ مایگی جس قدر کوتاہیاں کرتی رہتی ہے، فکرِ فراخ حوصلہ کی آسودگیاں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں:

چوں دستِ ما بدامنِ وصلش نمی رسد [۳۴]

پائے طلب شکستہ بداماں نشستہ ایم

وقت کی رعایت سے اکثر پھول موسمی تھے۔ چالیس سے زیادہ قسمیں گنی جاسکتی تھیں۔ سب سے پہلے مارننگ گلوری (Morning Glory) نے اس خرابۂ بیرنگ کو اپنی گل شگفتگیوں سے رنگین کیا۔ جب صبح کے وقت آسمان پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں، تو زمین پر مارننگ گلوری کی کلیاں کھل کھلا کر ہنسنا شروع کردیتیں۔ ابو طالب کلیم کو کیا خوب تمثیل سوجھی تھی: [۳۵]

شیرینیٔ تبسمِ ہر غنچہ را مپرس

در شیرِ صبح خندۂ گلہا شکر گزاشت

کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا، کوئی نیلم کی پیالی تھی۔ کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلم کاری کی گئی تھی، کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔ بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑگئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا، صنّاعِ قدرت کے مُوقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا، صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا، اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑگئیں:

تکلّف سے بَری ہے حُسنِ ذاتی

قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے [۳۶]

"گلوری" کا اُردو میں ترجمہ کیجیے تو بات بنتی نہیں۔ "اجلالِ صبح" وغیرہ کہہ سکتے ہیں، لیکن ذوقِ سلیم حرف گیری کرتا ہے! اس لیے میں "مارننگ گلوری" کو "بہارِ صبح" کے

نام سے پکارتا ہوں ۔

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہاے ناز کا [۳۷]

"بہارِ صبح" کی بیلیں برآمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں۔ چند دنوں کے بعد نظر اٹھائی، تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں۔ لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور اپنی کروٹوں سے اُسے پامال کرتے رہتے ہیں؛ ہمارے حصّے میں کانٹوں کا فرش آیا، تو ہم نے اپنی پھولوں کی سیج بستر سے اٹھا کر چھت پر اُلٹ دی۔ تلووں کے کانٹے چُبتے رہتے ہیں، مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتی ہے:

گذر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی [۳۸]

سامنے دو تختوں میں زینیا (Zinnia) کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہوگئے۔ زینیا کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں، یہ بڑے زینیا کے پھول تھے۔ ان کے صافوں کی لپیٹ اتنی مرتب اور مدوّر واقع ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی مشّاق دستار بند نے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی ایک ایک سلوٹ نکال دی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی؛ اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے پہرہ داروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں، اور زندانیانِ قلعہ کی طرح اس باغِ نورستہ کی بھی پاسبانی ہو رہی ہے:

کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا! [۳۹]

ان تختوں کے درمیان گلِ خطمی یعنی (Hollyhock) کا حلقہ تھا یہ رنگ برنگ کے وائن گلاس[۱] ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔ ہر شاخ اتنے گلاس سنبھالے ہوئی تھی کہ دل اندیشہ ناک

[۱] قدیم ایرانی ظروف میں "پیمانہ" اسی قسم کا ظرف تھا جس طرح کا آج کل "وائن گلاس" ہوتا ہے، لیکن اگر پیمانہ کہیے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیگا۔ ناچار وائن گلاس کہنا پڑتا ہے۔

رہتا، کہیں ایسا نہ ہو، ہوا کے جھونکوں کی ٹھوکر لگے اور گلاس گِر کر چُور چُور ہو جائیں۔ دانش مشہدی نے غالباً انہی پھولوں کی ایک شاخ دیکھ کر کہا تھا:[۴۰]

دیدہ ام شاخ گلے، بر خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

تخیل دراصل امیر خسرو سے ماخوذ ہے جس نے اسی زمین میں کہا تھا:[۴۱]

ہست صحرا چوں کف دستے برو از لالہ جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جامِ صہبا بر گرفت

گُلِ خطمی کے پھولوں کی تشبیہ کتنی ہی دلکش ہو، مگر یہ ماننا پڑیگا کہ حُسنِ نزاکت کی ادائیں یہاں نہیں مل سکتیں۔ گلاس خوشنما ہیں، مگر نازک نہیں ہیں۔ پٹونیا (Petunia) نے بھی میدان کے ہر گوشے کو دامنِ رنگین بنا دیا تھا، لیکن اُس کی رنگتوں کی سادگی سے تخیل کی پیاس کہاں بجھ سکتی تھی! میدان کے وسط میں جھنڈے کے چبوترے کے دونوں طرف اسٹر (Aster) کارن فلاور (Cornflawer) سویٹ پیس (Sweet peas)، کوکنار (Poppy)، فلاکس (Phlex) کلیوپسیس (Calliopsis) اور کاسمس (Cosmos) کے چھوٹے چھوٹے جُھنڈ نکل آئے تھے۔ گویا میدان کی کمر میں بوقلموں رنگوں کا ایک پٹکہ بندھ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی چشمِ تماشائی کا سامانِ دید تھا، اہلِ بنیش کے لیے ذوقِ نظر کا سامان نہ تھا، حال آنکہ:

بزم میں اہلِ نظر بھی تھے تماشائی بھی[۴۲]

اس غرض کے لیے پینکس (P[illegible])، سلویا ([illegible]lvia)، اور پینزی (Pansy) وغیرہ کے تختوں کا رُخ کرنا پڑتا تھا، جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدہ و دل کو دعوتِ نظارہ دیتی رہتی تھیں۔ قدرت کے قلمِ صنعت کی یہ بھی ایک عجیب کرشمہ سنجی ہے

کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی موقلم سے مینا کاری کر دی اور ایک ہی رنگ کی دواتیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجیے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے بڑے پھولوں کی کترن سے کچھ کاغذ بچ رہا تھا، اسے بھی ضائع نہیں کیا گیا، اور قینچی سے تراش تراش کر ننھے ننھے پھولوں کے ورق بنا لیے۔ اگر ایک چیز نازک اور خوبصورت ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں، یہ پھول ہے۔ لیکن اگر خود پھولوں کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو انھیں کس چیز سے تشبیہہ دیں! حقیقت یہ ہے کہ زبانِ درماندہ کو یہاں یارائے سخن نہیں، اور خاموشی کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ حُسن کی جلوہ طرازیاں محویت کا پیام ہوتی ہیں، خامہ فرسائی اور سخن آرائی کا تقاضا نہیں ہوتا:

ازنگہِ چشم تہی گشت و تماشا ماندہ ست
در زباں حرف نماندہ ست و سخنہا ماندہ ست [۴۳]

ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے۔ اِدھر موسم ختم ہوا، اُدھر انھوں نے بھی دنیا کو خیر باد کہہ دیا، گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن اُن کے حصّے میں آیا تھا، وہی کفن کا بھی کام دے گیا:

ہمچو ماہی غیر داغم پوشش دیگر نہ بود
تا کفن آمد، ہمیں یک جامہ برتن داشتم [۴۴]

میر مبارک اللہ واضح عالمگیری کو یہی خیال پانی کا بلبلہ دیکھ کر ہوا تھا۔ دیکھیے کیا خوب کہہ گیا ہے![۴۵]

رشک فرمائے دلم نیست بجز عیشِ حباب
بافت یک پیرہنِ ہستی و آں ہم کفن ست

بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں، خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر

جونہی موسم کا دَور پلٹتا ہے، دوبارہ آموجود ہوتے ہیں۔ مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوۂ یک رنگی و یک ساختگی دیکھیے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی، تو پھر دوبارہ مُڑ کے دیکھنا نہیں چاہتے۔ گویا ابوطالب کلیم کا اشارہ انہی کی طرف تھا:[۴۶]

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نکرد، ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

پھولوں کے جمالیاتی (Aesthetics) منظر سے اگر نظر ہٹائیے، تو پھر ایک اور گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ اُن کی عجائب آفرینیوں کا گوشہ ہے۔ روحِ نباتی بھی روحِ حیوانی کی طرح قسم قسم کے جسموں میں اُبھرتی ہے اور طرح طرح کے افعال و خواص کی نمایش کرتی رہتی ہے۔ یہ کہیں سوئی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کہیں کروٹ بدلنے لگتی ہے اور پھر کہیں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گوشۂ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے، جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں میں سے شمار کیا جاسکتا ہے، یعنی گلوری اوس سپوپربا (Gloriosa Superba)۔ اس کی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں، چار بارآور ہوئیں۔ اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اِن کا پھول پہلے غنچے کی طرح کھلیگا؛ پھر پیالہ[۴۷] کی طرح اُلٹ جائیگا؛ پھر فانوس کی طرح مدوّر ہونے لگیگا؛ پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رُک جائیگا اور پھر دیکھیے، تو جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا، انہی منزلوں سے گزرتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگیگا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائینگی، پھر اچانک یہ پیالہ[۴۷] الٹ جائیگا، گویا زندگی کے جامِ واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا:

لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی[۴۸]

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافرت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے، چھ دن آنے میں لگتے ہیں، چھ واپسی میں؛ اور دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لیے ہوتا ہے:

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی[49]

رنگت کے اعتبار سے بھی اس کی بوقلمونیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ کلیاں جب نمودار ہونگی تو ہلکے سبز رنگ کی ہونگی، پھر جوں جوں کھلنے کا وقت آنے لگیگا، زردی اُبھرنے لگیگی۔ اور پھر زردی بتدریج سُرخی مائل ہونا شروع ہو جائیگی۔ پہلے آدھا سُرخ آدھا زرد رہیگا۔ پھر زردی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگیگی اور پورا پھول سُرخ ہو کر مرغ کی کلیوں کی طرح چمکنے لگیگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی نسل ہندوستان کی طرف منسوب کی جاتی ہے، مگر یہاں اس کی شہرت نہیں:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ[51]

یہ پھول نباتات کی اُس قسم میں داخل ہے، جسے اتحادِ تناسلی کے لیے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے؛ اور کبھی ہوا کے جھونکوں سے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے، اس پھول کا جُزِ رجولیت اس کے انوثیت کے جُز سے اس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادۂ تلقیح کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نہ پہنچا دے، تلقیح کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔ جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے، وہ باردار ہو جاتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں؛ جنھیں نہیں ملتی، بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔ ان پودوں کے لیے تتلیوں کا ایک گروہ بروقت پہنچ گیا تھا، چنانچہ اکثر پھول باردار ہو گئے۔

خیر، یہ چمن آرائی کا ذکر تو ایک جملۂ معترضہ تھا، جو بلا قصد اتنا طولانی ہو گیا؛ اب اصل حکایت کی طرف واپس ہونا چاہیے۔ فروری میں ابر و باد کی آمد و رفت سے موسم کا اتار چڑھاؤ جاری رہا، مگر جونہی مہینہ ختم ہونے پر آیا، موسمِ بہار کا پیش خیمہ پہنچ گیا،

یعنی معتدل ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے۔ پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ خراماں خراماں چلتی ہوئی خود بہار بھی آموجود ہوئی ہے، اور جوانانِ چمن نے اس کی خوش آمدید کا جشن منانا شروع کر دیا ہے:

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دگر بار جوان خواہد شد[52]

اُسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن دوپہر کے وقت کمرہ میں بیٹھا تھا کہ اچانک کیا سُنتا ہوں کہ بلبل کی نواؤں کی صدائیں آرہی ہیں:

باز نوائے بلبلاں، عشقِ تو یاد می دہد
ہر کہ زعشق نیست خوش عمر بباد می دہد

باہر نکل کر دیکھا تو خطمی کے شگفتہ پھولوں کے ہجوم میں ایک جوڑا بیٹھا ہے، اور گردن اٹھائے نغمہ سنجی کر رہا ہے۔ بے اختیار خواجۂ شیراز کی غزل یاد آگئی:[53]

صفیرِ مرغ برآمد، بطِ شراب کجاست
فغاں فتاد ز بلبل، نقابِ گل کہ درید

یہ علاقہ اگرچہ سردسیر نہیں ہے، لیکن چونکہ بلند سطح پر واقع ہوا ہے، اس لیے پہاڑی بلبلوں سے خالی نہیں ہے۔ یہ بلبلیں اگرچہ سردسیر ایران کی بلبلوں کی طرح ہزار داستاں نہیں ہوتیں، لیکن رسیلے گلے کی ایک تان بھی کیا کم ہے! دوپہر کی چائے کا جو قیلولہ کے بعد پیتا ہوں، آخری فنجان باقی تھا، میں نے اُٹھایا اور اس نغمۂ عندلیب پر خالی کر دیا۔

تو نیز بادہ بہ چنگ آرو راہِ صحرا گیر
کہ مرغِ نغمہ سرا سازِ خوش نوا آورد[54]

دوسرے دن صبح برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ بلبل کے ترانے کی آواز پھر اٹھی میں نے ایک

صاحب کو توجّہ دلائی کہ سنئا بُلبل کی آواز آرہی ہے۔ ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے، کچھ دیر کے لیے رُک گئے اور کان لگا کر سنتے رہے۔ پھر بولے کہ ہاں قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے، اس کے پہیّوں کی آواز آرہی ہے۔ سبحان اللہ! ذوقِ سماع کی دقتِ امتیاز دیکھیے؛ بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیّوں کی رِیں رِیں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا!

ہمائے گو، مفگن سایۂ شرف ہرگز ۵۵
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد

خدارا انصاف کیجیے، اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دیے جائیں کہ ایک میں تو بلبل کی نوائیں بسی ہوں، دوسرے میں چھکڑے کے پہیّوں کی رِیں رِیں، تو آپ اسے کیا کہیں گے!

نوائے بُلبلت اے گل! کجا پسند افتد
کہ گوشِ ہوش بہ مُرغانِ ہرزہ گو داری ۵۶

اصل یہ ہے کہ ہر ملک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کر دیا کرتی ہے۔ ہندوستان کا عام طبعی ذوق بلبل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ملک کی فضا دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کے پرندوں کی شہرت طوطا اور مینا کے پَروں سے اُڑی اور دنیا کے عجائب میں سے شمار کی گئی:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود ۵۷

بلبل کی جگہ یہاں کوئل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس کی کُوک دردآشنا دلوں کو غم و الم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔[58]
بُلبل کی نواؤں کا ذوق تو ایران کے حصّے میں آیا ہے۔ موسمِ بہار میں باغ و صحرا ہی نہیں

بلکہ ہر گھر کا پائین باغ ان کی نواؤں سے گونج اُٹھتا ہے۔ بچے جھولے میں اُن کی لوریاں سنتے سنتے سو جائینگے، اور مائیں اشارہ کر کے بتلائینگی کہ دیکھ یہ بُلبل ہے، جو تجھے اپنی کہانی سنا رہی ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف جس قدر بڑھتے جائیں، یہ افسونِ فطرت بھی زیادہ عام اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک شخص نے شیراز یا قزوین کے گل گشتوں کی سیر نہ کی ہو، وہ سمجھ نہیں سکتا کہ حافظ کی زبان سے یہ شعر کس عالم میں ٹپکے تھے:[59]

بلبل بہ شاخِ سرو بہ گل بانگِ پہلوی	میخواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی
یعنی بیا کہ آتشِ موسیٰ نمود گل	تا از درخت نکتۂ تحقیق بشنوی
مرغانِ باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو	تا خواجہ مَے خورد بہ غزلہائے پہلوی

یہ جو کہا کہ مُرغانِ باغ قافیہ سنجی کرتے ہیں، تو یہ مبالغہ نہیں ہے، واقعہ ہے۔ میں نے ایران کے چمن زاروں میں ہزار کو قافیہ سنجی کرتے ہوئے خود سنا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کے لَے بدلتی جائیگی، اور ہر لَے ایک ہی طرح کے اُتار پر ختم ہو گی، جو سننے میں ٹھیک ٹھیک شعروں کے قوافی کی طرح متوازن اور متجانس محسوس ہونگے۔ گھنٹوں سنتے رہیے ان قافیوں کا تسلسل ٹوٹنے والا نہیں؛ آواز جب ٹوٹیگی، ایک ہی قافیہ پر ٹوٹیگی!

حقیقت یہ ہے کہ نوائے بُلبل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے۔ جو ملک اس بہشت سے محروم ہے، وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر! زمستان کی برفباری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رُخ پلٹنے لگتا ہے، اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے، تو اُس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہو گئی۔ انسان اپنے جسم کے

اندر دیکھتا ہے، تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر اُبلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے، تو فضا کا ایک ایک ذرّہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولیے، تو حسن کی عشوہ طرازی ہے۔ کان لگائیے، تو نغمہ کی جان نوازی ہے۔ سونگھیے، تو سرتا سر بُو کی عطر بیزی ہے:

صبا بہ تہنیتِ پیر مے فروش آمد — کہ موسمِ طرب و عیش و ناے و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ گشا — درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنورِ لالہ چناں بر فروخت بادِ بہار — کہ غنچہ غرقِ عرق گشت و گل بجوش آمد[60]

عین جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اس وقت انسانی احساسات میں جو تہلکہ[61] مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صوت سے اُن کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے، جب نہیں کھینچ سکیگا، تو پھر خود اُس کی تصویر بن جائیگا۔ وہ رنگ و بو اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھیگا، پھر کود پڑیگا، اور خود اپنی ہستی کو بھی اُسی کی ایک موج بنا دیگا:

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نَو در اندازیم
چو در دست ست رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم[62]

ہندوستان میں صرف کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس عالم کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لیے فیضی کو کہنا پڑا تھا:

ہزار قافلۂ شوق میکشد شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر [63]

لیکن افسوس ہے لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا، عالم بہار کی جنّت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائینگے بھی، تو بہار کے موسم میں نہیں، بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں۔ معلوم نہیں، دنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہوگئی ہے، حال آنکہ انسان کو معدہ کے ساتھ دل و دماغ بھی دیا گیا تھا!

ہندوستان کے پہاڑوں میں پہاڑی بلبل کا ترنّم نینی تال اور کانگڑہ میں زیادہ سُنا جا سکتا ہے؛ مسوری اور شملہ کی چٹانی فضا اس کے لیے کافی کشش پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بلبلیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوشنوا قسم وہ ہے جس کے چہرے کے دونوں طرف سفید بُوٹے ہوتے ہیں، اور اس لیے آج کل نیچرل ہسٹری کی تقسیم میں اسے وہائٹ چیکڈ (White Cheeked) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شاما کو اگرچہ عام طور پر بلبل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسے بھی میدانی سرزمینوں کا بلبل ہی تصوّر کرنا چاہیے؛ مغربی یوپی اور پنجاب میں اس کی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔

اس وقت تک بلبل کے تین جوڑے یہاں دکھائی دیے ہیں۔ تینوں معمولی پہاڑی قسم کے ہیں، جنھیں انگریزی میں (White Whiskered) کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایک نے تو پھول کی ایک بیل میں آشیانہ بھی بنالیا ہے۔ دوپہر کو پہلے بالکل خاموشی رہیگی، پھر جونہی میں کچھ دیر لیٹنے کے بعد اٹھونگا، اور لکھنے کے لیے بیٹھونگا، معاً اُن کی نوائیں شروع ہوجائینگی، گویا اُنھیں معلوم ہوگیا ہے کہ یہی وقت ہے، جب ایک ہمصفیر اپنے دل و جگر کے زخموں کی پٹیاں کھولتا ہے، اس لیے نالہ و فریاد کے پیہم چرکے لگانا شروع کردیں۔ میرا وہی حال ہوا، جو عربی کے

ایک شاعر کا ہوا تھا:

وَمِمَّا شَجَانِی اِنَّنِی کُنْتُ نَائِمًا

اُعَلَّلُ مِنْ بَرْدِ طِیْبِ التَّنَسُّمِ

اِلیٰ اَنْ دَعَتْ وَرْقَاءُ مِنْ غُصْنِ اَیْکَۃٍ

تُغَرِّدُ مُبْکَاھَا بِحُسْنِ التَّرَنُّمِ

فَلَوْ قَبْلَ مُبْکَاھَا بَکَیْتُ صَبَابَۃً

بِسُعْدیٰ، شَفَیْتُ النَّفْسَ قَبْلَ التَّنَدُّمِ

وَلٰکِنْ بَکَتْ قَبْلِی، فَھَیَّجَ لِیَ الْبُکَاءُ

بُکَاھَا، فَقُلْتُ اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ" [۱]

---

[۱] اور جس بات نے مجھے غمگین کیا، وہ یہ ہے کہ جب میں سو رہا تھا اور میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا، تو اچانک ایک خوش آواز پرند نے درختوں کے جھنڈ میں ترانہ سنجی شروع کردی۔ اس کی رونے کی آواز اپنے ترنم کی خوبی میں آپ ہی اپنی مثال تھی۔ اگر اس کے رونے سے پہلے میں نے سُعدیٰ کے عشق میں چند آنسو بہا دیے ہوتے، تو میرے حصے میں شرمندگی نہ آتی۔ مگر واقع یہ ہے کہ میں ایسا نہ کرسکا، اور یہ اس پرند کا رونا تھا، جس سے میرے اندر بھی گریہ وزاری کا جوش اُمنڈ آیا۔ پس مجھے شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑا کہ بلاشبہ یہاں فضیلت اسی کے لیے ہوئی، جس نے پہلا قدم اُٹھایا۔

(۱۹)

چڑیا چڑے کی کہانی

قلعۂ احمد نگر

۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی ہو

ہے آج جو سرگزشت اپنی کل اس کی کہانیاں بنیں گی[1]

آئیے، آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

دگر ہا شنیدستی، ایں ہم شنو[2]

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جابجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے، اور گوریاؤں[3] کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامۂ تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے، اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں؛ یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آ گئی:

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ!

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے[4]

گذشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منھ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اُس کے اُوپر، نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلا تعمیر پاچکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چُن چُن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے۔ اِدھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہوگئی۔ پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی، اُس کے اُوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ اِن چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے، اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں، لیکن طلب و سعی کا جوش اس بَلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کر دینگی۔ حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے (Dos moi pau sto kai ten gen kineso) مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دو، میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دونگا۔ اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنا لینگی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اُس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کر دینگی، اور اس زور سے چلائینگی کہ سارا جسم سُکڑ سُکڑ کر کانپنے لگیگا؛ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے، تو کئی انچ کلفات اُڑ چکی ہوگی۔ مکان چونکہ پرانا ہے، اس لیے نہیں معلوم، کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ اب مل ملا کر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دَل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے؛ اور کپڑوں کو دیکھیے، تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا، یعنی مکان کی از سرِ نو مرمّت کر دی جائے، اور تمام گھونسلے بند کر دیے جائیں، لیکن مرمّت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بلائے جائیں،

اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم رکھ نہیں سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا، لیکن جب تک ایک انگریز فوجی انجنیر کمانڈنگ آفیسر کا پروانۂ راہداری لے کر نہیں آیا، اُن کی مرمّت نہ ہو سکی۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا، لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا، اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں:

من و گرز و میدان و افراسیاب[8]

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے؛ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آگیا:[9]

خیالِ قدِّ بلندِ تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتۂ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اُسے اُٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رَن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اُٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے:

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم[10]

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا، اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا:

بیک تاختن تا کجا تاختم　　　　چہ گردن کشاں را سر انداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتحمندانہ نظر ڈالی! اور مطمئن ہو کر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہونگے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہواپیمائیوں کی آوازیں پھر اٹھ رہی ہیں۔ سر اٹھا کے جو دیکھا، تو چھت کا ہر گوشہ اُن کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اٹھا اور بانس لاکر پھر معرکۂ کارزار گرم کر دیا:

بر آرم دیار از ہمہ لشکرش　　　　بہ آتش بسوزم ہمہ کشورش

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے، تو دوسرے میں ڈٹ جاتے، لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرہ سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنا لاؤ لشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا۔ اور اس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہوگیا تھا۔ اب دشمن کی فوج تتر بتر ہوگئی تھی، مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رُخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزہ کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھاگئی ہے۔ جس طرف رُخ کرتا تھا، اسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اسے کمرہ میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اِکّا دُکّا حریف نے رُخ کرنے کی جرأت بھی کی، تو یہ سر بفلک نیزہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے بڑا نا گھونسلا منھ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، "تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سر و سامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ تمیر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے،" تاہم موقعہ کا تقاضہ ٹال

بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر!
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا! [12]

اب گیارہ بج رہے تھے؛ میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا، تو کمرہ میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ[13] سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ میں ہے، اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں، جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں[14]۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا، گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے۔ تنکے چُن چُن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینانِ تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں کہ:

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد [15]

اپنی وہمی فتحمندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمّت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آگیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے، مگر اُن کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں؛ اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا:

بیا کہ، ماسپر انداختیم، اگر جنگ ست! [16]

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم و راہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی؛ پرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سر و سامان سے جس قدر

گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اِسی پر گرتا۔ اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زَد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرہ کی شکل ضرور بگڑ گئی، لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا! جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا، تو پھر شکل و ترتیب کی آرایشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی! البتّہ مُنھ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا، صرف وہی جگہ اس کے لیے نکل سکتی تھی؛ ذرا بھی اِدھر اُدھر کرنے کی گنجایش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انھیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا۔ لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔ ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ، کبھی تین مرتبہ، کبھی اس سے بھی زیادہ، اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا، اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیے۔ دیکھیے ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کتنی تنگ کرنی پڑی:

عشق از یں بسیار کردست و کند![17]

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہو گئی، تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا۔ اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں، اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھڑک

دیے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا، جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے'
دیکھیے، عرفی کا شعر صورتِ حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے:[18]

فتادم دام بر کنجشک و شادم، یاد آں ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد میکردم!

کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی؛ اگر ہوئی بھی، تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آ گیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے:

حور و جنّت جلوہ بر زاہد دہد، در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را[19]

پہلے ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:[20]

چہ لطفہا کہ دریں شیوۂ نہانی نیست
عنایتے کہ تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے؛ اور کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحّص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھیگی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگیگی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اُٹھائیگی، اور چہرے پر تفحّص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائیگا، جیسے ایک

آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متحقق نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر اُبھر رہی تھیں:

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست [21]

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہِ راست، دانوں کی طرف نہیں۔ آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جارہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغِ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر ظہوری کا شعر یاد آگیا: [22]

بگو حدیثِ وفا، از تو باور ست، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست ماند ست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں، جونہی اُن کے قدموں کا رُخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کرلیں اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنا لیا، گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے، کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائیگا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں از و بہ رُخش داشتم تماشائے
نظر بہ جانب ما کرد و شرمسار شدم [23]

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک نبت ظنّانہ نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا۔ مگر یہ رُخ بھی کیا قیامت کا رُخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجا ناز سر برآرد، نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا [۲۴]

ایک قدم آگے بڑھتا تھا، تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جاسکتی؛ دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برَو، صد ہزار بار بیا [۲۵]

التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اکتا کر بیباکانہ قدم اٹھا دیا، اور زبانِ حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رندان و ہرچہ بادا باد! [۲۶]

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا، جیسے اچانک تمام رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب؛ مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا، اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ حجاب و تامّل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی، یا یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے، تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں؛ یہ اٹھا، اور گویا ساری دنیا اچانک اٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد! [۲۷]

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ

انھیں کے حصّے میں آیا، جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:[28]

یہ بزم مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بیباکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا، کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی، اس مردِ کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا، کیونکہ بیدماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا، اور اس کی وضعِ قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا:

رہے ایک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ ابرو پرادائے کجکلاہی کو

دو تین دن تک اِسی طرح اُن کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے، اور ایک ایک دانہ چُن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی، تو قلندر آ کر چُوں چُوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقتِ معہود گزر رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے اب اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اُٹھ چکا، وہ وقت دُور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے:

اور کھُل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں[29]

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا، اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آ کر منھ مارنے لگا، کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیّتِ خاطر کے ساتھ چُگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّ و کد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریقِ ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں، تو دوسرے دن ڈھکنا

دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قُرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے، بُعدِ قُرب کے معاملہ نے عُلَیّہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلا دیا۔[30]

وَجَنِّب، فَاِنَّ الحُبَ دَاعِیَۃُ الحُبِ
وَکَم مِن بَعِیدِ الدَّارِ مُستَوجِبُ القُربِ

اتنا قُرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامّل ہوا۔ دری کے پاس آگئے، مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا۔ لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا آ پہنچا، اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دُور ہو گئی، گویا اس راہ میں سب قلندر ہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا، سب کے اُٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا، پھر سر اُٹھا کے اور سینہ تان کے زبانِ حال سے مترنم ہوتا:

وَمَا الدَّھرُ اِلَّا مِن رُوَاۃِ قَصَائِدِی
اِذَا قُلتُ شِعرًا، اَصبَحَ الدَّھرُ مُنشِدًا [31]

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا، اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے، اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خُوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے اور تپائی کے چکّر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا، اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھُل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔

جب اس قدر نزدیک آجانے کے خُوگر ہو گئے، تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا، گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر بر چپ و راست
تا نہ دانند رقیبان کہ تو منظورِ منی! [۳۲]

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے کنکھیوں سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے، اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لیے اُس کی دُم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے؛ اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقۂ بے تکلّف [۳۳] میری بغل میں اُچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چُوں چُوں کر کے پھر واپس آجاتا۔ بے تکلّفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست و خیز کا نشانہ بنانا چاہا، لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے، یا پنجوں سے اُسے چھوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اُس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے:

ہنوز عاشقی و دلرُبائیے نہ شدہ است
ہنوز زوری و مردآزمائیے نہ شدہ است
ہمیں تواضعِ عام ست حسن را با عشق
میانِ ناز و نیاز آشنائیے نہ شدہ است [۳۴]

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے، محبّت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے:

درسِ وفا اگر بُوَد زمزمۂ محبّتے
جُمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را [۳۵]

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُرکیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا مُنہ سے "ہا" نکل گیا' اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھُرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے!

(۲۰)

قلعۂ احمد نگر

۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

کل جو کہانی شروع ہوئی تھی، وہ ابھی ختم کہاں ہوئی! آئیے، آج آپ کو اس "مطق الطیر" کا ایک دوسرا باب سناؤں۔ معلوم نہیں اگر آپ سنتے ہوتے، تو شوق ظاہر کرتے یا اکتا جاتے؟ لیکن اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی ہو۔ داستانیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں، ذوقِ داستان‌سرائی بھی اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

ان یاران سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا ایک ہلکا سا پردہ حائل رہ گیا تھا، چند دنوں میں وہ بھی اٹھ گیا۔

انھیں چھت سے صوفے پر اترنے کے لیے چند درمیانی منزلوں کی ضرورت تھی۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلی منزل کا کام پنکھے کے دستوں سے لیتے، اور دوسری کا میرے سر اور کاندھوں سے۔ باہر سے اڑتے ہوئے کمرے میں آئے اور سیدھے اپنے گھونسلے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے سر نکال کر ہر طرف نظر دوڑائی اور پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ پھر وہاں سے اڑے اور سیدھے پنکھے کے دستے پر پہنچ گئے۔ پھر دستے سے جو کودے، تو کبھی میرے سر کو

اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا، کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزت بخشی۔ دیکھیے، ان چڑیوں نے نہیں معلوم کتنے برسوں کے بعد مومن خان کا ترکیب بند یاد دلا دیا:

جولاں کو ہے اس کی قصدِ پامال
اے خاک! نویدِ سر فرازی [2]

پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزولِ اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر ہل گیا تھا۔ قدرتی طور پر ان آشنایانِ زود گسل پر یہ ناقدر شناسی گراں گزری ہوگی! لیکن یہ جو کچھ ہوا محض ایک اضطراری سہو تھا۔ طبیعت فوراً متنبہ ہو گئی، اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بے حس ہو کر رہ گیا کہ منارہ کی چھتری کی جگہ بالاخانے کا کام دینے لگا۔ پنکھے سے اُتر کر سیدھے کاندھے پر پہنچتے، کچھ دیر چہچہاتے اور پھر کود کر صوفے پر پہنچ جاتے کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کاندھے سے جست لگائی اور سر پر جا بیٹھے، آپ کو معلوم ہے کہ آتشی قندھاری نے اپنی آنکھوں کی کشتی بنائی تھی؛ بدایونی نے اُس کا یہ شعر نقل کیا ہے: [3]

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد، تماشا کن
بیا، در کشتیِ چشمم نشین و سیرِ دریا کن

اور ہمارے سودا کو تامل ہوا تھا! [4]

آنکھوں میں دوں اُس آئینہ رُو کو جگہ ولے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر، نم بہت ہے، یاں

لیکن میری زبانِ حال کو شیخ شیراز کی التجائے نیاز مستعار لینی پڑی: [5]

گر بر سرو چشمِ من نشینی   نازت بکشم کہ نازنینی

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو خیال ہوا، اب ایک اور تجربہ بھی کیوں نہ کر لیا جائے! ایک دن صبح میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر تک نہیں رکھا۔ "مہمانانِ باصفا بادآئے"

اور جب سُفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا، تو اِدھر اُدھر چکّر لگانے اور شور مچانے لگے۔ اب میں نے برتن نکال کے ہتھیلی پر رکھ لیا اور ہتھیلی صوفے پر رکھ دی۔ جونہی قلندر کی نظر پڑی، معاً جست لگائی، اور ایک چکّر لگا کے انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا، اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا۔ اس تیزی میں کچھ تو طبعِ قلندرانہ کا قدرتی تقاضا تھا، اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اُڑ اُڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا، اس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ مار دی، اور ایسی خارا شگاف ماری کہ کیا کہوں! اگر ان ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہو چکا ہوتا، تو یقین کیجیے، بے اختیار منھ سے چیخ نکل جاتی:

من کُشتۂ کرشمۂ مژگاں کہ ہر جگہ
خنجر زد آں چناں کہ نگہ را خبر نہ شد![6]

اب میں نے ہتھیلی برتن سمیت اوپر اٹھا لی اور ہوا میں معلّق کر دی۔ تھوڑی دیر نہیں گذری تھی کہ ایک دوسری چڑیا آئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا نام موتی ہے۔ موتی نے ہتھیلی کے اوپر ایک دو چکّر لگائے اور نکل گئی۔ گویا اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اس جزیرے پر اُترنے کے لیے محفوظ جگہ کونسی ہوگی۔ پھر دوبارہ آئی اور کہنی کے پاس اُتر کر سیدھی پہنچے تک پہنچ گئی، اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنارے پر اُتر کر بے تکان "منقار درازیاں" شروع کر دیں۔ اس میں کوئی دانہ قاب کے باہر گر گیا، تو چونچ کا ایک نشتر اس پر بھی لگا دیا۔ دیکھیے "دست درازی" کی ترکیب میں تصرّف کر کے مجھے "منقار درازی" کی ترکیب وضع کرنی پڑی۔ جانتا ہوں کہ محاورات میں تصرّفات کی گنجایش نہیں ہوتی، مگر کیا کیا جائے، سابقہ ایسے یارانِ کوتہ آستین سے آپڑا، جو ہاتھ کی جگہ منھ سے "درازدستیاں" کرتے ہیں۔

درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں![7]

لیکن اس آخری تجربے نے طبعِ کاوش پسند کو ایک دوسری ہی فکر میں ڈال دیا۔ ذوقِ عشق کی اس کوتاہی پر شرم آئی کہ ہتھیلی موجود ہے اور میں نامرادٹین کے ڈھکنے پر ان منقاروں کی نشتر زنی ضائع کر رہا ہوں میں نے دوسرے دن ٹین کا ڈھکنا ہٹا دیا جاول کے دانے ہتھیلی پر رکھے، اور ہتھیلی پھیلا کر صوفے پر رکھ دی۔ سب سے پہلے موتی آئی، اور گردن اُٹھا اُٹھا کے دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا! یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوبصورت چڑیا ہے۔ آج کل حسن کی نمائشوں میں خوبردئی اور دلاویزی کا جو فتنہ گر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے، اسے پورے ملک کی نسبت سے موسوم کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے مس انگلینڈ، یا دی موازیل (Mademoiselle) فرانس۔ گویا ایک حسین چہرے کے چمکنے سے سارے ملک و قوم کا چہرہ دمک اٹھتا ہے:

کنند خویش و تبار از تو نازومی زیبد
بہ حُسنِ یک تن اگر صد قبیلہ ناز کنند[۸]

اگر یہ طریقہ موتی کے لیے کام میں لایا جائے، تو اُسے مادام[۹] قلعۂ احمد نگر سے موسوم کر سکتے ہیں:

این نگاہیست کہ شایستۂ دیدارے ہست[۱۰]

چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دُم، اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولا پن۔ جب دانہ چُگنے کے لیے آئیگی، تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائیگی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں، مگر نگاہیں گویا ہو گئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے، میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ ہادی یزدی نے ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہا ہے:[۱۱]

کرشمہ گرمِ سوال ست، لب مکن رنجہ کہ احتیاج بہ پرسیدنِ زبانی نیست

بہرحال اس موقع پر بھی اس کی بیساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا، اور پھر بغیر کسی جھجک کے جَست لگا کے انگوٹھے کی جڑ پر آ کھڑی ہوئی، اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کر دیا۔ یہ چونچ نہیں تھی، نشتر کی نوک تھی، جو اگر چاہتی، تو ہتھیلی کے آر پار ہو جاتی، مگر صرف چُھو کے لگا لگا کے رُک جاتی تھی:

یک ناوکِ کاری زکمانِ تو نخوردم
ہر زخمِ تو محتاج بہ زخمِ دگرم کرد [12]

ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی تھی۔ گویا پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں ہو رہا؟ بھلا، میں جاں باختۂ لذتِ الم اس کا کیا جواب دیتا:

ایں سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی [13]

مرزا صائب کا یہ شعر آپ کی نگاہوں سے گزرا ہوگا:

خویش را بر نوکِ مژگانِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست، در خنجر نہ بود [14]

مجھے اس میں اس قدر تصرف کرنا پڑا کہ مژگاں کی جگہ "منقار" کر دیا:

خویش را بر نوکِ منقارِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست، در خنجر نہ بود

درد کا حال تو معلوم نہیں، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی، ہتھیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کے اٹھتی تھی:

رسیدن ہائے منقارِ ہما بر استخوانِ غالب
پس از عمرے بیادم داد رسم و راہِ یکاں را [15]

اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطع نظر کر لی جائے، تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قلندر اور مُوتی سے آپ کی تقریب ہو چکی ہے، اب مختصراً ملا آدر

صوفی کا حال بھی سن لیجیے۔ ایک چڑا ابڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے، اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آجائے، دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہیگا۔ کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلّہ کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمّت دکھائی، لیکن پہلے ہی مقابلے میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے، تو یہ سروِ سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور داہنے بائیں[16] نظر ڈالتا ہوا فوراً آموجود ہوتا ہے، اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں، چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظکِ جامع کا نقشہ[17] آنکھوں میں پھر جاتا ہے:

وی واعظکے آمد در مسجدِ جامع	چوں برف ہمہ جامہ سپید از پا تا سر
چشمش بسوے چپ و چشمش بسوے راست	تا خود کے سلامے کند از منعم و مضطر
زانساں کہ خرامد بہ رَسَن مردِ رَسَن باز	آہستہ خرامیدی و موزدن و موقر
فارغ نہ شدہ خلق ز تسلیم و تشہد	بر جست چو بوزینہ و بنشست بہ منبر
وانگہ بہ سر و گردن و ریش و لب و بینی	بس عشوہ بیاورد، سخن کرد چنیں سر

فرمائیے، اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا: ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے تعرف الاشیاء باضدادہا۔ اُسے جب دیکھیے، اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے:

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

بہت کیا، تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے، جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو، اور کبھی کبھی سر اٹھا کے "ہا" کر دیتا ہو:

"تا تو بیدار شوی، نالہ کشیدم، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند[19]

دوسرے جوڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں، گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آ گئے ہیں پھر بھی اس کی زبان کُھلتی نہیں۔ البتہ نگاہوں پر کان لگائیے، تو ان کی صدائے خاموشی سنی جا سکتی ہے:

تو نظر باز نۂ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نۂ، ورنہ خموشی سخن ست [20]

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تلقب،

جامۂ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود! [21]

صبح جب اس بستی کے تمام باشندے باہر نکلتے ہیں، تو برآمدہ اور میدان میں عجیب چہل پہل ہونے لگتی ہے۔ کوئی پھول کے گملوں پر کودتا پھرتا ہے۔ کوئی کروٹین کی شاخوں میں جھولا جھولنے لگتا ہے۔ ایک جوڑے نے غسل کا تہیّہ کیا اور اس انتظار میں رہا کہ کب پھولوں کے تختوں پر پانی ڈالا جاتا ہے۔ جونہی پانی ڈالا گیا، فوراً حوض میں اُتر گیا اور پَروں کو تیزی کے ساتھ کھولنے اور بند کرنے لگا۔ ایک دوسرے جوڑے کو آس پاس پانی نہیں ملا تو فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا [22] پڑھتا ہوا مٹی ہی میں نہانا شروع کر دیا۔ پہلے چونچ مار مار کے اتنی مٹی کھود ڈالی کہ سینے تک ڈوب سکے۔ پھر اس گڑھے میں بیٹھ کر اس طرح پاکوبیاں اور پَرافشانیاں شروع کر دیں کہ گرد و خاک کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلے پر مُلّا حسب معمول کسی حریف سے کُشتی لڑنے میں مشغول ہے۔ اُن کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی عجیب حال ہوتا ہے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں [23]

یعنے ہاتھ کو دیکھیے تو ہتھیار سے یک قلم خالی ہے، بلکہ سرے سے ہاتھ ہی نہیں:

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے [24]

مگر چونچ کو دیکھیے، تو سارے ہتھیاروں کی کمی پوری کر رہی ہے۔ جوشِ غضب میں آ کر اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائینگے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا۔ گویا

"جدالِ سعدی با مدّعی در بیانِ توانگری و درویشی"[25] کا منظر آنکھوں میں پھر جائیگا:

او در من و من در وفتادہ![26]

ہوا میں جب کُشتی لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں، تو انھیں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ کہاں گر رہے ہیں کئی مرتبہ میرے سر پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹھیک میری گود میں آکر پڑ گئے میں نے ایک کو ایک ہاتھ سے، دوسرے کو دوسرے سے پکڑ لیا:

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے[27]

سارا جسم مٹھی میں بند تھا۔ صرف گردنیں نکلی ہوئی تھیں۔ دل اس زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اب پھٹا اب پھٹا۔ لیکن اس پر بھی ایک دوسرے کو چونچ مارنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے مٹھیاں کھول دیں، تو پھر سے اڑ کر پنکھے کے دستے پر جا بیٹھے، اور دیر تک چوں چوں کرتے رہے۔ غالباً ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ

رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گذشت[28]

موتی کے گھونسلے سے ایک بچّے کی آواز عرصے سے آرہی تھی۔ وہ جب دانوں پر چونچ مارتی، تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی، اور فوراً گھونسلے کا رُخ کرتی۔ وہاں اس کے پہنچتے ہی بچّے کا شور شروع ہوجاتا۔ ایک دو سکنڈ کے بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اُڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا، تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی۔

جن علمائے علم الحیوان نے اس جنس کے پرندوں کے خصائص کا مطالعہ کیا ہے، اُن کا بیان ہے کہ ایک چڑیا دن بھر کے اندر ڈھائی سو سے تین سو مرتبہ تک بچّے کو غذا دیتی ہے اور اگر دن بھر کی مجموعی مقدارِ غذا بچّے کے جسم کے مقابلہ میں رکھی جائے تو اس کا حجم (Mass) کسی طرح بھی بچّے کے جسمانی حجم سے کم نہ ہوگا۔ مگر بچّوں کی قوتِ ہاضمہ اس تیزی سے کام کرتی رہتی ہے کہ اِدھر دانہ اُن کے اندر گیا اور اُدھر تحلیل ہونا شروع ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ

پرندوں کے بچّوں کے نشو ونما کا اوسط چارپایوں کے بچّوں کے اوسط سے بہت زیادہ تیز ہوتا ہے، اور بہت تھوڑی مدّت کے اندر وہ بلوغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ موتی کی رفتارِ عمل سے مجھے اس بیان کی پوری تصدیق مل گئی۔

پھر جوں جوں بچّوں کے پَر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے، اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انھیں اُڑنے کا سبق سکھانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے، موتی کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی۔ ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں، گھونسلے سے اُڑتی ہوئی اُتری، تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچّہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اُڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اڑنے لگتی۔ لیکن بچّے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی؛ وہ پَر پھیلائے آنکھیں بند کیے، بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا، ابھی پَر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں۔ گرنے کی چوٹ کا اثر بھی تازہ ہے، اور اس نے بے حال کر دیا ہے۔ بے اختیار نظیری کا شعر یاد آ گیا:[29]

بہ وصلش تا رسیم، صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

بہر حال اسے اُٹھا کے دری پر رکھ دیا۔ موتی چاول کے ٹکڑے چُن چُن کر منہ میں لیتی اور اُسے کھلا دیتی۔ وہ منھ کھولتے ہی چُوں چُوں کی ایک مدّھم اور رُکھڑی سی آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود، آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ پورا دن اسی حالت میں نکل گیا۔ دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی۔ ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اُڑنے کی تلقین کرتی رہی، مگر اُس پر کچھ ایسی مُردنی سی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب بچیگا نہیں۔

لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دُور تک چلی گئی تھی، یہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا؛ پَر گِرے ہوئے، پاؤں مُڑے ہوئے،

آنکھیں حسبِ معمول بند تھیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جُھرجُھری سی لے رہا ہے۔ پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا، بند کیا؛ اور پھر جو ایک مرتبہ جَست لگا کر اڑا، تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اُڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہہ ہونے لگا، کہیں کسی دوسری چڑیا کو اڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ گیا ہوں، لیکن ایک واقعہ جو ظہور میں آ چکا تھا، اب اس میں شبہہ کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی! کہاں تو بیچالی اور درماندگی کی یہ حالت کہ دو دن تک ماں سر کھپاتی رہی، مگر زمین سے بالشت بھر بھی اونچا نہ ہو سکا، اور کہاں آسمان پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اُڑان میں عالمِ حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضائے لا متناہی کی ناپید اکنار وسعتوں میں گم ہو گیا! کیا کہوں، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی تھی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا تھا، اور اس جوش و خروش کے ساتھ آیا تھا کہ ہمسایے چونک اُٹھے تھے:

نیروے عشق بیں کہ دریں دشتِ بیکراں
گامے نرفتہ ایم و بپایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا، جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے، مگر ہم اُسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اِس چڑیا کے بچّے میں اُڑنے کی استعداد اُبھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنجِ نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، مگر ابھی تک اُس کی "خود شناسی" کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے بےخبر تھا۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پَروں کو چھوتی ہوئی گذر جاتی تھیں، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آ کر بڑھاوے دیتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کا چولھا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے

گرم نہیں کر سکتی تھی:

کلیمؔ شکوہ ز توفیق چند، شرمت باد!
تو چوں برہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند [30]

لیکن جونہی اُس کی سوئی ہوئی "خود شناسی" جاگ اٹھی، اور اُسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اُڑنے والا پرند ہوں"۔ اچانک قالب بیجان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی۔ وہی جسم زار جو بیطاقتی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اب سرو قد کھڑا اٹھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے، اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے۔ وہی گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی، اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوشِ پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلا کر اُچھال دیا۔ اور پھر جو دیکھا، تو درماندگی اور بیجالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے، اور مُرغِ ہمت، عقاب وار فضائے لاانتہا ہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ وﷲ درّ ما قال:

بال بکشا و صفیر از شجرِ طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی! [31]

گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی، اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہو گیا۔ غور کیجیے، تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے:

طے میشود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے
ما بیخبراں منتظرِ شمع و چراغیم [32]

اڑنے کے سروسامان میں سے کونسی چیز تھی جو اس لوگرفتارِ قفسِ حیات کے حصّے میں نہیں آئی تھی؛ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اُسے بھیجا تھا، اور رہاں کے اشارے دمبدم

گرم پروازی کے لیے اُبھار رہے تھے۔ لیکن جب تک اس کے اندر کی "خود شناسی" بیدار نہیں ہوئی، اور اس حقیقت کا عرفان نہیں ہوا کہ وہ طائرِ بلند پرواز ہے، اس کے بال و پر کا سارا سر و سامان بیکار رہا۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی "خود شناسی" بھی جب تک سوئی رہتی ہے، باہر کا کوئی ہنگامۂ سعی اُسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی اُس کے اندر کا عرفان جاگ اُٹھا، اور اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس کی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے، تو پھر چشمِ زدن کے اندر سارا انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے اور ایک ہی جست میں حضیضِ خاک سے اڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔ خواجۂ شیراز نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:[۲۳]

چہ گویمت کہ بمے خانہ دوش مست و خراب ‏ ‏ سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہا داد است
کہ "اے بلند نظر، شاہبازِ سدرہ نشیں! ‏ ‏ نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد است
ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر ‏ ‏ ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است

ابوالکلام

(۲۱)

قلعۂ احمد نگر
۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء

آنچہ دل از فکرِ آں میسوخت، بیم ہجر بود
آخر از بے مہریِ گردوں بآں ہم ساختیم[1]

صدیقِ مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں، بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا، لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرہ میں آیا، روشنی کی، اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا، قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ اِن آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے؛ اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزرینگی:

دماغ بر فلک و دل بپائے مہر بتاں
چگونہ حرف زنم؛ دل کجا، دماغ کجا![2]

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ اُن میں ساری باتیں ہوتی تھیں، لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا، تو اُن سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی

ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی، تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آرہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہوگئی:

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست[۳]

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاسِ بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا، مگر طوفانی آثار ہر طرف اُمنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائیگا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائیگا[۵]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ اُن سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اُس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے

۵ گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لیے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی، اور بالآخر طے پایا کہ قلعۂ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا، وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

درمیان بسر کیے، میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی؛ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے، اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی۔ لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے، اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا، تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی، تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا:

خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی! میں نے اُس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں، تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا؛ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اُس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب کا اظہار ہوگا، تو مجھے سخت ناگوار گزریگا، اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہیگی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری

پیش آئی تھی، تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی، اور بہت عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اُس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا، اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا، بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی، اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہوگئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۷ ستمبر کو مجھے اُس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کریگی، اس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اُس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورتِ حال دریافت کی، تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۲ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اُسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم، جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا، وہ کس تاریخ کا تھا، اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے، اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جا سکتا ہے، نہ باہر سے کوئی آسکتا

ہے، کیونکہ اگر آئیگا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئیگا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائیگا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو، تو اُسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجیگا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اُسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط وکتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے، اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا؛ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا، وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا؛ اس لیے پورا دن اُس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے، تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا، ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا، اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، تو وہ اُسے فوراً بمبئی بھیج دیگا، اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑیگی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا، اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے

اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا ۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی ۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اُن سے بھی وہی بات کہہ دی، جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی ۔

جونہی خطرناک صورتِ حال کی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے ۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمّہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گذری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا، ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی؛

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم [۱]

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے، اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدّ و جہد کرنی پڑے گی ۔ یہ جدّ و جہد دماغ کو نہیں، مگر جسم کو تھکا دیتی ہے؛ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے ۔

اِس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا ۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرلوں ۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا، لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے، جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے ۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں،

ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چاے اور کھانے کے چار وقت ہیں، جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں، اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی، اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اُتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی، اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا، اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملیگی، لیکن پھر فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لیے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا، تو میں حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں، جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا، اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبّہ نہ لگ جائے؛

بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

بالآخر ۹ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فَإِنَّ مَا تَحْذَرِيْنَ، قَدْ وَقَعْ![8]

دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا، جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا، لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا، اُس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں، تو قدرتی طور پر اُنھیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں؛ لیکن جونہی اُنھیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی، اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس[9] برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اُسی دیوار کی اُوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں:

غافل نیم نہ زراہ، و لے آہ چارہ نیست

زیں رہزناں کہ بر دل آگاہ میزنند[10]

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم، کس کی ہے! جب سے آیا ہوں، سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اُسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اُس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا، اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت

پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آگیا:

"لَقَد لَامَنی عند القُبُورِ عَلی البُکا ، رَفِیقی لِتَذرافِ الدُّموعِ السَّوافِکِ

فَقالَ" أتبکی کُلَّ قبرٍ رَأیتَہٗ لِقَبرٍ ثَوَی بَینَ اللّوی فالدکادکِ"

فقلتُ لہٗ اِنّ الشَّجا یبعثُ الشَّجا فَدَعنی، فھٰذا کُلُّہٗ قَبرُ مالکِ"[۱۲]

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے، تو بول اُٹھتے:

سوداؔ! خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی، تیرے فسانے میں [۱۳]

(۲۲)

قلعۂ احمد نگر
۱۴ جون ۱۹۴۳ء
صدیقِ مکرم

حسب حالے ننوشتیم و شد ایامے چند
قاصدے کو کہ فرستم بتو پیغامے چند [1]

گزشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے، تو برسات کا موسم تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور جاڑے کی راتیں شروع ہو گئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رخت سفر باندھا اور گرمی اپنا ساز و سامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے، جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف سے امڈنے لگے ہیں۔ دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکیں، مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے، جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں۔ سرمد کی رباعی کتنی پامال ہو چکی ہے۔ پھر بھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

سرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
گرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرمِ عالم
بر ما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں [2]

یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے، ایک وارڈر [3] نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام

میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا جس ٹہنی کو دیکھو، ہرے ہرے پتّوں اور سفید سفید پھولوں سے لد رہی ہے۔ لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لیے کوئی انقلابِ حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سُوکھی کی سُوکھی پڑی ہے۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

ہمچو ماہی غیر داغم پوششِ دیگر نبود
تا کفن آمد ہمیں یک جامہ بر تن داشتم [۴]

یہ بھی اُسی درخت کی ایک شاخ ہے، جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت، سب اس کے لیے یکساں ہو گئے!

کل دوپہر کو اُس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس شاخِ بُریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا۔ میں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حسنِ تعلیل یاد آگئی:

قطعِ اُمید کردہ نہ خواہد نعیمِ دہر
شاخِ بُریدہ را نظرے بر بہار نیست [۵]

میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی اُمید و طلب کے بیشمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں، لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی، اُن کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں، کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا!

خزاں کیا! فصلِ گل کہتے ہیں کس کو! کوئی موسم ہو!
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے [۶]

موسمی پھولوں کے جو درخت یہاں اکتوبر میں لگائے گئے تھے۔ انھوں نے اپریل کے آخر تک

دن نکالے، مگر پھر انھیں جگہ خالی کرنی پڑی۔ مئی میں خیال ہوا کہ بارش کے موسم کی تیاریاں شروع کر دینی چاہییں۔ چنانچہ نئے سرے سے تختوں کی درستگی ہوئی، نئے بیج منگوائے گئے، اور اب نئے پودے لگ رہے ہیں۔ چند دنوں میں نئے پھولوں سے نیا چمن آراستہ ہو جائیگا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، مگر میرے سامنے رہ رہ کر ایک دوسری ہی بات آ رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے! جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے، دوسرے موسم کے پھول کھلتے نہیں۔ گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی؛ اب اسی میں اَدل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک جگہ کا سامان اُٹھایا، دوسری جگہ سجا دیا، مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کھِلنا پسند نہیں آیا تھا۔ اُسے اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ کا پھول کھلیگا، تو اس کے دل کی کلی بند کی بند رہ جائیگی:

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل ست
کاش گل غنچہ شود، تا دلِ ما بکشاید!

غور کیجیے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ در اصل ایک نئی بناوٹ ہے:

بگڑنے میں بھی زُلف اُس کی بنا کی

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں، مگر اینٹوں کا پژاوہ بھر جاتا ہے۔ درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں، مگر جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں، لیکن ملک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پاؤں تک بہا دیا، مگر سرمایہ دار کی راحت و عیش کا سر و سامان درست ہو گیا۔ ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں، مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی ہوگی، جبھی تو یہ جھولی معمور ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرفی نے اپنے دامن میں

پھول دیکھے تھے، تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا:

زمانہ گلشنِ عیشِ کرا بہ یغما داد؟ ۱۰
کہ گل بداماں مادستہ دستہ می آید!

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں۔ صبح و شام کئی کئی گھنٹے اُن کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے۔ مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی پلٹا کھایا، اور پھر وہ وقت آگیا کہ ان کی رکھوالی کرنا ایک طرف، کوئی اِس کا بھی رَوادار نہ رہا کہ ان اجل رسیدوں کو چند دن اور اُن کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ ایک ایک کر کے تمام کیاریاں اُکھاڑ ڈالی گئیں۔ وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہو ہو کر ان کے سرو سینہ پر پانی بہاتے تھے، اب بیرحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی کو توڑ مروڑ کر پھینک رہے تھے۔ جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حُسن کا مُرقع اور رعنائی کا پیکر تھا، اب جھلسی ہوئی جھاڑیوں اور روندی ہوئی گھانس کی طرح میدان کے ایک کونے میں ڈھیر ہو رہا تھا اور صرف اِسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس بے سرو سامان کو جلانے کے لیے لکڑیاں میسّر نہ آئیں، وہ اُنھی کو چولھے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کر لے:

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو ۱۱
اے خوں شدہ دل! تو تو کسی کام نہ آیا

زندگی اور وجود کے جس گوشہ کو دیکھیے، قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئینگے:

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست ۱۲
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست

انسانی زندگی کا بھی بعینہٖ یہی حال ہوا۔ سعی و عمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے،

اس کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو جاتا ہے، اسے چھانٹ دیا جاتا ہے: فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۱۳

---

۱۳ یہ قرآن کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے، جس میں کارخانۂ ہستی کی اس اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو چیز نافع ہوتی ہے، وہ باقی رکھی جاتی ہے؛ جو بیکار ہو گئی، وہ چھانٹ دی جاتی ہے۔

(۲۳)

قلعۂ احمد نگر

۱۵ جون ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

عرب کے فلسفی ابوالعلاء معرّی نے زمانہ کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا: کل جو گذر چکا؛ آج جو گذر رہا ہے؛ کل جو آنے والا ہے:

ثَلَاثَۃُ اَیَّامٍ ھِیَ الدَّھرُ کُلُّہٗ   وَمَا ھُنَّ اِلَّا الْاَمسُ وَالیَومُ وَالغَدُ!

وَمَا القَمَرُ اِلَّا وَاحِدٌ غَیرَ اَنَّہٗ   یُغِیبُ وَیَأتِی بِالضِّیَاءِ المُجَدَّدِ!

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں، وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسّر ہے، وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے، یا "مستقبل" کی؛ اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے، جسے ہم "حال" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "ماضی" اور "مستقبل" کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے، لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اُسے پکڑ نہیں سکتے۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن اِدھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا، اور اُدھر اُس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں۔ لیکن خود "حال" کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دیتا۔ جس وقت کا ہم نے پیچھا کرنا چاہا تھا، وہ "حال" تھا، اور ہماری پکڑ میں آیا ہے، وہ "ماضی" ہے:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے[۲]

شاید یہی وجہ ہے کہ ابوطالب کلیم کو انسانی زندگی کی پوری مدت دو دن سے زیادہ نظر

نہیں آئی؛

بدنامیِ حیات دو روزے نبود بیش | واں ہم کلیم! باتو چگویم، چساں گزشت[3]
یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین و آں | روزے دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت

ایک عرب شاعر نے یہی مطلب زیادہ ایجاز و بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

وَمَتیٰ تُباعِدُنا الوِصالُ وَدَهرُنا
يَومانِ، يَومُ نَوىً وَيَومُ صُدودُ.

اور اگر حقیقتِ حال کو اور زیادہ نزدیک ہو کر دیکھیے، تو واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی پوری مدّت ایک صبح شام سے زیادہ نہیں۔ صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر اُمید و بیم میں گزری، رات آئی تو پھر آنکھیں بند تھیں۔ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا[4]

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ، غنودیم[5]

لیکن پھر غور کیجیے؛ اسی ایک صبح شام کے بسر کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے! کتنے صحراؤں کو طے کرنا پڑتا ہے! کتنے سمندروں کو لانگھنا پڑتا ہے؛ کتنی چوٹیوں پر سے کودنا پڑتا ہے! پھر آتش و پنبہ کا افسانہ ہے، برق و خرمن کی کہانی ہے:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرایی ست
تسلّیے بہزار اضطراب می بافند[6]

(۲۴)

قلعۂ احمد نگر
۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

بچّے ربڑ کے رنگین غبّاروں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مجھے بھی بچپنے میں ان کا بڑا شوق تھا۔ والدِ مرحوم کے مُریدوں میں ایک شخص غلام رحمٰن تھا، جو انگریزی ٹوپیوں کے بنانے کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ مجھے یہ غبّارے لادیا کرتا؛ اور میں اُس سے بہت ہل گیا تھا۔ یہ غبّارے ویسے ہی ہوتے ہیں، جیسے منھ سے پھونکنے کے ہوتے ہیں؛ لیکن ان میں گیس بھر دی جاتی ہے اور وہ انھیں اوپر کی طرف اڑائے رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ مجھے خیال ہوا؛ اسے چھید کے دیکھنا چاہیے اندر سے کیا نکلتا ہے! سہسرام کی ایک مغلانی "امانی" نام ہمارے گھر میں سلائی کا کام کرتی تھی۔ میں نے امانی کے سلائی کے بکس سے ایک سوئی نکالی اور غبّارے میں چبھو دی۔ اس واقعہ پر سینتالیس برس گزر چکے ___ لیکن اس وقت بھی خیال کرتا ہوں تو اس سنسنی کا اثر صاف صاف دماغ میں محسوس ہونے لگتا ہے جو اس وقت اچانک گیس کے نکلنے اور ایک لمبی سی سی کی سی آواز پیدا ہونے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ گیس باہر نکلنے کے لیے کچھ ایسی بیتاب تھی کہ سوئی کا ذرا سا چھید پاتے ہی فوراً فوارہ کی طرح مضطربانہ اچھلی اور دو تین سکنڈ بھی ابھی نہیں گذرے تھے کہ غبّارہ خالی ہو کے سکڑ گیا اور زمین پر گر گیا۔

یقین کیجیے، آج کل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینہ کا بھی محسوس کر رہا ہوں۔ غبّارے کی طرح اس میں بھی کوئی پُرجوش عنصر ہے جو بھر گیا ہے، اور نکلنے کے لیے بیتاب ہے۔ اگر کوئی ہاتھ ایک سوئی اٹھا کر چبھو دے، تو مجھے یقین ہے، اس میں سے بھی ویسا ہی جوش اُمنڈ کر اچھلیگا،

جیسا غبارہ سے ایک مضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا:

شد آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا
کہ از نہفتنِ آں دیگِ سینہ می زد جوش[1]

کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سوئی چُبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے۔ لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا، جو آیا اور گزر گیا اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہ نہ سکی!

ضعف سے، گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا[2]

میرے ساتھ لاسلکی کا ایک سفری (پورٹیبل) سٹ سفر میں رہا کرتا تھا۔ جب بمبئی میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا، تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا۔ لیکن جب سامان قلعہ کے اندر لایا گیا، تو اس میں سٹ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ باہر روک لیا گیا ہے۔ جیلر سے پوچھا تو اس نے کہا، کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے روکا گیا ہے اور اب گورنمنٹ سے اس بارے میں دریافت کیا جائیگا۔ بہر حال جب یہاں اخباروں کا آنا روک دیا گیا تھا، تو ظاہر ہے کہ لاسلکی کے سٹ کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی! تین ہفتہ کے بعد اخبار کی روک تو اُٹھ گئی مگر سٹ پھر بھی نہیں دیا گیا! وہ چیتہ خان کے آفس میں مقفل پڑا رہا۔ اب میں نے چیتہ خان کو دے دیا ہے کہ اپنے بنگلہ میں لگا کر کام میں لائے، کیونکہ اب وہ جس بنگلہ میں منتقل ہوا ہے، اس میں لاسلکی سٹ نہیں ہے۔

لیکن آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فروکش ہے؛ اس کے پاس لاسلکی

کاسٹ ہے، کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آنکلتی ہے۔ کل رات بہت صاف آنے لگی تھی۔ غالباً بی، بی، سی کا پروگرام تھا اور کوئی وایولین (Violin) بجانے والا اپنا کمال دکھارہا تھا۔ لَے ایسی تھی جیسی کہ (Mendelssohn) [3] کے مشہور قطعہ "نغمہ بغیر لفظ" (سوانگس وِداوٹ ورڈز) کی سننے میں آئی تھی!

حدیثِ عشق کو از حرف و صوت مستغنی ست

بنالۂ دَف و نَے در خروش و ولولہ بود [4]

ناگہاں ایک مغنیۂ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اٹھی اور اُس نے ساز کے زیر و بم کے ساتھ مل کر وہ عالم پیدا کر دیا، جس کی طرف خواجۂ شیراز نے اشارہ کیا ہے:

چہ راہ می زند ایں مُطربِ مقام شناس

کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد [5]

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے، لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا، تو بدستور انقباضِ خاطر واپس آگیا تھا!

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد

یا کہ خود زخمِ مرا لذتِ آزار نماند [6]

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے۔ اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلبہ کو پڑھانے میں مشغول تھا، تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا، جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی، اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف خان کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مصوّر نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے۔ سیف خان عالمگیری عہد

کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدابخش کے ہاتھ لگا تھا، آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کتب خانہ کا تھا، اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینیسن راس آ گئے، جو اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے، اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کمسن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور و خوض سے مطالعہ کر رہا ہے، متعجب ہوئے، اور مجھ سے فارسی میں پوچھا: "یہ کس مصنف کی کتاب ہے؟" میں نے فارسی میں جواب دیا کہ سیف خان کی کتاب ہے اور فنِ موسیقی میں ہے۔ انھوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ "ہندوستان کا فنِ موسیقی بہت مشکل فن ہے، کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟" میں نے کہا: "جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں میں بھی اسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا۔" انھوں نے ہنس کر کہا: "تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھ سکتے ہو، تو مجھے اس صفحہ کا مطلب سمجھاؤ۔" انھوں نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا تھا، اس میں مبادیات کی بعض تقسیموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے، مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا؛ اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا، بغور مطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکوں گا۔

میں نے کتاب لے لی اور گھر آ کر اسے اوّل سے آخر تک پڑھ لیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہرِ فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اس بات کی خوگر ہو گئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی، اس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہو گیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی، تو طبیعت کو سخت اُلجھن ہوئی۔ اور خیال ہوا کہ

کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے۔ لیکن مدد لی جائے، تو کس سے لی جائے! خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچہ سے رسم و راہ رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا۔ آخر خیال میتا خاں کی طرف گیا۔ اس پیشہ کا یہی ایک آدمی تھا جس کی ہمارے یہاں گزر تھی۔

اس میتا خاں کا حال بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا اور پیشہ کا خاندانی گویّا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی، اور دہلی اور رجے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی۔ کلکتہ میں طوائفوں کی معلّمی کیا کرتا تھا؛

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے![11]

یہ والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کو مُرید نہیں کرتے تھے، لیکن اصلاح و توجّہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے؛ فرماتے: "بغیر بیعت کے آتے رہو، دیکھو خدا کو کیا منظور ہے!" اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بخود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ چنانچہ میتا خاں کو بھی یہی جواب ملا۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے، تو پہلے کچھ دیر دیوان خانہ میں بیٹھتے، پھر اندر جاتے۔ خاص خاص مُرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے آجاتے اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رخصت ہو جاتے۔ میتا خاں بھی ہر جمعہ وعظ کے بعد حاضر ہوتا، اور دُور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا۔ کبھی والد مرحوم کی نظر پڑ جاتی، تو پوچھ لیتے: "میتا خاں، کیا حال ہے؟" عرض کرتا: "حضور کی نظرِ کرم کا امیدوار ہوں"۔ فرماتے: "ہاں اپنے دل کی لگن میں لگے رہو"۔ وہ بے اختیار ہو کر قدموں پر گر جاتا، اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے آنکھیں تر کر دیتا۔ ہائے ذوق نے کیا خوب کہا ہے[12]:

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

کبھی عرض کرتا: "رات کے دربار میں حاضری کا حکم ہو جائے"، یعنی رات کی مجلسِ خاص میں جو مُریدوں کی تعلیم و ارشاد کے لیے ہفتہ میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ اسے والد مرحوم ٹال جاتے۔ مگر ان کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا؛ فرماتے: "اچھی بات ہے۔ دیکھو، ساری باتیں اپنے وقت پر ہو رہینگی"۔ وہ جان باختۂ امید و بیم اتنے ہی میں نہال ہو جاتا اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا۔ خواجہ حافظ ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہہ گئے ہیں[۱۳]:

بحاجب درِ خلوت سرائے خاص بگو
"فلاں زگوشہ نشینانِ خاکِ درگہِ ماست"

لیکن بالآخر اُس کا عجز و نیاز اور صدقِ طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ والد مرحوم نے اُسے مرید کر لیا تھا اور حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اسے بھی کچھ ایسی توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی معلمی سے تائب ہو گیا اور ایک بنگالی زمیندار کی ملازمت پر قناعت کر لی۔ والد مرحوم کو میں نے ایک مرتبہ یہ کہتے سنا تھا کہ مستیا خان کا حال دیکھتا ہوں تو پیرِ چنگی کی حکایت یاد آجاتی ہے یعنی مولانا روم والے پیرِ چنگی کی![۱۴]

پیرِ چنگی کَے بود مردِ خدا
حبذا اے سرِ پنہاں، حبذا![۱۵]

بہرحال میرا خیال اسی مستیا خان کی طرف گیا اور اُس سے اِس معاملہ کا ذکر کیا۔ پہلے تو اُسے کچھ حیرانی سی ہوئی، لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آ گیا، تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادہ کی نظرِ توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے، تو کیسے لائی جائے! گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ[۱۶] کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا، سا، را، گا، ما کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا، اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہرحال اس مشکل کا ایک حل نکال لیا گیا اور ایک رازدار مل گیا جس کے مکان

میں نشست و برخاست کا انتظام ہو گیا۔ پہلے ہفتہ میں تین دن مقرر کیے تھے، پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا۔ مسیتا خان پہلے سے وہاں موجود رہتا اور دو تین گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا:

عشق می ورزم و اُمید کہ ایں فنِ شریف
چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نشود [17]

مسیتا خان نے تعلیم کا ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے استادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے؛ وہی اس نے یہاں بھی چلایا۔ لیکن میں نے اسے روک دیا اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مرتّب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجّہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا، اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہو گی، لیکن اُس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھایئے، پوری طرح اُٹھایئے، اور جہاں تک راہ ملے، بڑھتے ہی جایئے۔ کوئی کام بھی ہو، لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا، اُسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے، تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے، تو انھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا، تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے؛ پارسائی کی راہ ملی، تو اُس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے، ناقصوں اور خامکاروں کی طرح نہ جایئے۔ رسم و راہ رکھیے، تو راہ کے کاملوں سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تا دسترسم بُود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم [18]

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا، تو جہاں تک راہ ملی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی

نہیں کی ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی؛ بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں، لیکن زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہوسکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہوگیا، اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں پہلے درد تھا[19]

اس عالمِ رنگ و بو میں ایک رَوِش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے، تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اُٹھ نہیں سکتی؛

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پلے بند ترے[20]

اور ایک بھونرے[21] کی ہوئی کہ ہر پھول پر بیٹھے، بُو باس لی، اور اُڑ گئے:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے[22]

چنانچہ زندگی کے چمنستانِ ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا۔ کچھ دیر کے لیے رک کر بُو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے، کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی مُمارَست کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حل ہوگیا تھا تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانعِ کار کے حکم میں داخل ہوگیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشہ میں رچ گیا تھا، دل سے نکالا نہیں جاسکتا تھا، اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی!
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا[23]

حُسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حُسن ہے، اور حُسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اُس محرومِ ازلی پر، جس کے بےحس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

سینۂ گرم نداری، مطلب صحبت عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر [24]

میں آپ سے ایک بات کہوں! میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مُداوا، اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے:

ڈوے نکو معالجۂ عمر کوتہ ست
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند [25]

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے، آپ کا مقصد پورا ہو جائیگا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانہ میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے، تو وہ ریڈیو سٹ کا فقدان ہے:

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی [26]

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابلِ فراموش احوال پیش آئے، جو اگرچہ خود گذر گئے، لیکن ہمیشہ کے لیے دامنِ زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی،[27] تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا، اور اس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی، ستار پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گذر چکے ہیں:

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں   کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم [28]

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات؛ چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے ڈھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں، اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے، اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے:

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم ۲۹

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی، گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ سر پر آکھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آکر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں، اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے، تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے:

تو مپندار کہ ایں قصّہ زخود میگویم
گوش نزدیکِ لبم آر کہ آوازے ہست ۳۰

اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ جانے اور کئی ماہ تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ سب سے پہلے آپ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے قلمی

کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کلیاتِ صائب کا ایک نسخہ خریدا تھا، اور مجھے یہ کہہ کر دکھایا تھا کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کچھ شوق ہے؟

ایں سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی![31]

اسی قیام کے دوران میں مرزا محمد ہادی مرحوم[32] سے شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے اور چونکہ علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے، اس لیے علمی طریقے پر اُسے سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے۔ مجھے اُن سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔ افسوس، وہ بھی چل بسے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس، تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی![33]

اُس زمانے میں کرسچین کالج کے سامنے پانچ روپیہ ماہوار کرایہ کا ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہی ان کی دنیا تھی۔ علمِ ہیئت کے شوق نے نجاری کے مشغلہ سے آشنا کر دیا تھا۔ جب کالج سے آتے تو مکان کی چھت پر لکڑی کے دوائرِ قطر اور نصف اور ثُلث بنانے میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح اپنی رصد بندیوں کا سامان کرتے۔ چھت کی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی، جست لگا کر اوپر پہنچتے اور پھر ساری رات ستاروں کی ہم نشینی میں بسر کر دیتے:

کہ با جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم[34]

کئی برس کے بعد پھر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا، تو انھیں ایک دوسرے ہی عالم میں پایا۔ ایک رشتہ دار کے انتقال سے کالپی کی کچھ جاید اد ورثہ میں مل گئی تھی، اور اب جوانی کی محرومیوں کا بڑھاپے کی ذوق اندوزیوں سے کفارہ کرنا چاہتے تھے:

وقتِ عزیز رفت، بیا تا قضا کنیم

عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت[35]

یہ گرمجوشیاں چونکہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں ابھری تھیں، اس لیے شاہدانِ نغمہ پردائم

سے صحبتیں گرم رہتی تھیں، اور بعض استادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ اگرچہ میرا قیام بہت مختصر رہا، لیکن جتنے دن رہا موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اسی زمانے کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے معارف النغمات[۳۶] کی ترتیب میں مدد دی، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

بچپنے میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے۔ صدرِ اوّل کے زمانے سے لے کر جس کا حال ہم کتاب الاغانی اور عقد الفرید[۳۷] وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں، آج تک حجازیوں کا ذوقِ موسیقی غیر متغیر رہا۔ یہ ذوق ان کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ اذان کی صداؤں تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا۔ آج کل کا حال معلوم نہیں لیکن اُس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارے پر ایک مؤذن متعین ہوتا تھا، اور ان سب کے اوپر شیخ المؤذنین ہوتا۔ اس زمانے میں شیخ المؤذنین شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش الحان تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر[۳۸] میں ان کی ترحیم* کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السّلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں، اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی، جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ جب عراق اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا، تو موجودہ عربی موسیقی کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدما کی بہت سی مصطلحات جو ہمیں کتاب الاغانی اور خوارزمی[۳۹] وغیرہ میں ملتی ہیں، اب کوئی نہیں جانتا۔ تعبیر و تقسیم کے اسما، و رموز تقریباً بدل گئے ہیں اور عربی کی جن مصطلحات نے ایران پہنچ کر فارسی کا جامہ پہن لیا تھا، وہ اب پھر عربی میں واپس آکر معرّب ہو گئی ہیں؛ البتّہ فن کی پرانی بنیادیں ابھی تک متزلزل نہیں ہوئیں وہی

* صبح کی اذان سے پہلے مختلف کلماتِ ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں، اسے "ترحیم" کہتے ہیں۔ کم سے کم چار سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی، کیونکہ ملا علی قاری اور صاحب الباعث نے اسے بھی بدع و محدثات میں سے شمار کیا تھا۔

بارہ راگنیاں اب بھی اصل و بنیاد کا کام دے رہی ہیں، جو یونانی موسیقی کی تقلید میں وضع ہوئی تھیں۔ آسمان کے بارہ برجوں کی طرف اب بھی انھیں اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے، جس طرح قدماء نے کیا تھا۔ آلاتِ موسیقی میں اگرچہ بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں لیکن عُود کے پردے ابھی تک خاموش نہیں ہوئے ہیں، اور رَباب کے زخموں سے وہ نوائیں اب بھی سُنی جا سکتی ہیں جو کبھی ہارون[43] الرشید کی شبستانِ طرب میں اسحاق[42] موصلی اور ابراہیم بن مہدی کے مضراب سے اٹھا کرتی تھیں؛

این مطرب از کجاست کہ سازِ "عراق" ساخت
واہنگ بازگشت زراہِ "حجاز" کرد [44]

"عراق" اور "حجاز" دو راگنیوں کے نام ہیں۔ اور "راہ" یعنی سُر

مطرب نگاہ دار ہمیں "رہ" کہ میزنی [45]

اُس زمانے میں شیخ احمد سلاّمہ حجازی[46] کا جَوق مصر میں بہت مشہور اور نامور تھا۔ "جَوق" وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں منڈلی کے لیے "طائفہ" کا لفظ اختیار کیا تھا۔ پھر اس کی جمع "طوائف" ہوئی اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ نے مفرد معنی پیدا کر لیے یعنی زنِ رقّاصہ و مغنّیہ کے معنی میں بولا جانے لگا۔ شیخ سلاّمہ کا جَوق قاہرہ کے اوپرا ہاؤس میں اکثر اپنا کمال دکھایا کرتا تھا، اور شہر کی کوئی بزمِ طرب بغیر اس کے بارونق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے بارہا اُس کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عربی موسیقی آج کل جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے، وہ اس کا پورا ماہر تھا۔ ایک دوست کے ذریعہ اس سے شناسائی پیدا کی تھی، اور موجودہ عربی موسیقی پر مذاکرات کیے تھے۔

اس زمانے میں مصر کی ایک مشہور "عالمہ" طائرہ[47] نامی باشندۂ طنطا تھی۔ "عالمہ" مصر میں مغنّیہ کو کہتے ہیں یعنی موسیقی کا علم جاننے والی؛ ہمارے علمائے کرام کو اس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ کی زبانوں میں بھی لفظ ہوگیا ہے۔ شیخ سلاّمہ

بھی اِس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلا ے جان تھی، مگر اُس کی آواز اُس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی میں نے اُس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سُنے۔ دیکھیے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں [48]

جس زمانے کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں، اس سے کئی سال بعد مصر میں اُمِّ کلثوم[49] کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اس کے بیشمار ریکارڈ سُنے ہیں، اور قاہرہ، انگورہ[50]، طرابلس الغرب[51]، فلسطین اور سنگا پور کے ریڈیو اسٹیشن آج کل بھی اس کی نواؤں سے گونجتے رہتے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جس شخص نے امِّ کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کرسکتا، اس کے مشہور انشادات میں سے ایک نشید عُلیّۃ[52] بنت المہدی کا مشہور نسیب ہے:

وَحَبِّب، فَاِنَّ الْحُبَّ دَاعِیَۃُ الْحُبِّ
وَکَم مِّن بَعِیدِ الدَّارِ مُسْتَوجِبُ الْقُرْبِ

البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتۃً سادہ اور رِدقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے ہندستان نے اس معاملہ کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدّنوں میں سے کوئی تمدّن بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا حسنِ تقسیم اور دقّتِ ترتیب یہاں کی ہر فنّی شاخ کی عام خصوصیّت رہی ہے۔ لیکن جہاں تک نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعلق ہے، اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ یورپ کا موجودہ فنِ موسیقی جس کی بنیاد نشأۃ ثانیہ (Renascence) کے باکمالوں نے رکھی تھی، انتہاے کمال تک پہنچا دیا گیا ہے اور گو ذوقِ سماع کے اختلاف سے ہمارے کان اس کی پوری قدر شناسی نہ کرسکیں، لیکن دماغ اس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیاء و معانی کے تمام مرکّب مزاجوں کی

طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا ہے اور سارا معاملہ مفرد اصوات و الحان کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ان مفرد اجزاء کی ترکیب کا تسویہ اور تناسب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائیگا، موسیقی کی گہرائیاں اتنی ہی بڑھتی جائینگی۔ اس اعتبار سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ کا فن موسیقی فکر انسانی کی دقت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے اور جرمنی کے باکمالانِ فن نے تو اس باب میں بڑی ہی سحر کاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزاء کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزاء کو حسنِ ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے:

تو خا بستی و من معنی زنگیں بستم [53]

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں، وہی موسیقی میں الحان و ایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے، لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا، اس نے اپنی روحِ معنی کے لیے نواؤں کا بھیس تیار کر لیا:

وَالاُذنُ تَعشَقُ قَبلَ العَینِ اَحیَاناً [54]

یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان درد و الم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں، بعض کے سننے سے مسرت و انبساط کے جذبات امڈنے لگتے ہیں! بعض کی لے ایسی ہوتی ہے، جیسے کہ رہی ہو کہ زندگی اور زر زندگی کے سارے ہنگامے ہیچ ہیں۔ بعض کی لے ایسی محسوس ہوتی ہے، جیسے اشارہ کر رہی ہو کہ:

یاراں! صلائے عام ست، گرمی کنید کارے [55]

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں ابھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے، تو کبھی حافظ [56] کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام [57] کا زمزمہ، کبھی شیلے [58] (Shelley) کی ماتم سرائیاں

ہوتیں، کبھی ورڈس ورتھ[59] (Wordsworth) کی حقائق سرائیاں :

دریں میدانِ پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی[60]

یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندستان کے تمام علوم و فنون میں دلچسپی لی لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابو ریحان البیرونی[61] نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم و عقائد پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب فی کتبھم فی سائر العلوم پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ[62]، (Sachau) نے الآثار الباقیہ کے مقدمہ میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے، جس میں اُس نے اپنی تمام مصنّفات کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن اُس میں بھی اِس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی، حال آنکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے ناٹک سلطان محمود[63] اور سلطان مسعود[64] کے درباروں میں اپنے کمالاتِ فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے، اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنین کے گلی کوچوں میں بجائے جا رہے تھے۔ غالباً اِس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علوم عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجّہ کرتے؛ اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بمشکل آشنا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنّف یک قلم ناآشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فنِ عروض کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا، حال آنکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

خود یونان کے فنونِ ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ہی تغافل برتا؛ یونان کی

شاعری اور ڈراموں کی انھیں بہت کم خبر تھی۔ ہومر[65] اور سوفاکلیس[66] وغیرہما کے نام انھیں ارسطو[67] کے مقالات اور افلاطون[68] کی جمہوریت سے معلوم ہو گئے تھے، لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ کر سکے۔ ابن رشد[69] نے "کامیڈی" اور "ٹریجڈی"[70] کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یونانی ڈرامہ کی حقیقت سے اُس کا دماغ کس درجہ ناآشنا تھا۔ وہ کامیڈی کو ہجو اور ٹریجڈی کو مدح سے تعبیر کرتا ہے!

یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ یونانی فنِ بلاغت سے ائمۂ بلاغتِ عرب کہاں تک متاثر ہوئے تھے: بظاہر انھوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ارسطو کے مقالات خطابت اور شاعری پر عربی میں منتقل ہو گئے تھے اور ابنِ رشد نے اپنی شرح میں انھیں بھی شامل کیا، لیکن عرب ائمۂ فن نہ تو اس کی روح سمجھ سکے اور نہ بلاغتِ عربی کی سرگرمیوں نے اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ہے، اور عربی دماغ اِن سے آشنا نہ تھا۔ آپ نے ابنِ قدامہ[71] کی نقد الشعر کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ چوتھی صدی کے بغداد کے علمی حلقہ میں اس کا نشو و نما ہوا تھا، اور وہ نسلاً رومی تھا۔ چند سال ہوئے اسکوریال[72] (اسپین) کے کتب خانہ میں ایک کتاب کا سراغ ملا، جس کی لوح پر نقد النثر درج تھا، مگر مصنّف کا نام مٹا ہوا تھا۔ بہت غور کرنے سے ابو جعفر ابنِ قدامہ سے ملتے جلتے حروف دکھائی دینے لگے۔ جب اس نام کی کتاب دنیا کے کتب خانوں کی فہرستوں میں ڈھونڈھی گئی، تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا نسخہ اس کا موجود نہیں۔ اسکوریال کے کتب خانہ میں زیادہ تر وہی کتابیں ہیں جو سترھویں صدی میں سلطان مراکش کے دو جہازوں کی لوٹ سے اسپین کے ہاتھ آئی تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں اسلامی ذخیروں کو تباہ کرنے کی مسیحی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں، اس لیے انھیں ضائع نہیں کیا گیا اور اسکوریال کی خانقاہ میں رکھ دی گئیں۔ یقیناً یہ نسخہ بھی اسی لوٹ میں آ گیا ہوگا۔ پچھلے دنوں جامعۂ مصریہ کے ادارہ

نے اس کا عکس حاصل کیا، اور ڈاکٹر منصور[4] اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین[5] کی تصحیح و ترتیب کے بعد چھپ کر شائع ہو گیا۔ دونوں نے اس پر الگ الگ مقدمے بھی لکھے ہیں۔ بظاہر اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسالہ بھی "نقد الشعر" کے مصنّف ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ رسالہ کے اسلوبِ بیان میں منطقی طریقِ بحث و تحلیل صاف نمایاں ہے، جو آگے چل کر فنِ بلاغت پر بالکل چھا گیا۔ لیکن اصولِ فن خالص عربی ہیں اور امثال و نظائر میں بھی باہر کے اثرات کی کوئی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ البتّہ بلاغت کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے یونان اور ہندوستان کے بعض اقوال جاحظ کے حوالہ سے نقل کر دیئے ہیں؛ اور وہ سب نے نقل کیے ہیں۔

لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا، وہ اس کے فنِ موسیقی سے برت نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ خود عربوں کا فنِ موسیقی کچھ نہ تھا، اور جتنی کچھ عمارت بھی انھوں نے اٹھائی تھی، اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا:

نوائے باربد ماندست و دستاں[6]

چنانچہ کافی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فنِ موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں، اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی بُرجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک بُرج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی۔ یونان اور روم کے آلات میں قانون اور ارغنون (آرگن)[8] عام طور پر رائج ہو گئے تھے۔ ابو نصر فارابی[9] نے قانون پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اخوان الصفا کے مصنّفوں کو بھی موسیقی سے اعتنا کرنا پڑا۔

سندھ کے نو آباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے جو اُن اطراف میں رائج ہوگی، ضرور آشنا

ہوئے ہونگے، لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا، اُن سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بآسانی نکال لے جاسکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے، بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے وہ تغافل برتتے، چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو[81] جیسے مجتہدِ فن کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی، اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ سازگری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ مثنوی قِران السعدین میں خود کہتے ہیں[82]:-

زمزمۂ "سازگری" در "عراق"
کردہ بگلبانگِ عراق اتفاق

قول، ترانہ، سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گویے کی زبان پر ہیں، حالانکہ یہ سب اسی عہد کی اختراعات ہیں، کلاسیکل موسیقی ان سے آشنا نہ تھی۔

غالباً مسلمان پادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ ملتان، اجودھن، گور، اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت و قبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہرِ کمال پیش کرتے تھے، جہاں تک سلاطینِ ہند کا تعلق ہے، خلجی[83] اور تغلق[84] کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدردانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں، لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بحیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا، وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان[85] تھا چنانچہ

اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا اور دھرپد کی جگہ اس سے اہلِ فن اعتنا کرنے لگے۔ اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی[86] اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجا پوری[88] بادشاہوں کا شوق و ذوق نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم و عمل کا تخت گاہ بن گئی تھی، اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی اسے حاصل ہو جاتی۔ ابراہیم عادل[89] شاہ تو بقول ظہوری[90] کے اِس اقلیم گاہ کا جگت گورو تھا، اور اُس کے شوقِ موسیقی نے بیجا پور کے گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اُس کی مدح میں کیا خوب کہ گیا ہے:

مروّت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغے خانہ ہاے بے نوایاں[1]

مالوا، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی، دونوں کے سرپرست تھے۔ چنانچہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام تر انہی کی سرپرستی میں نشو و نما پائی۔ مالوا کے باز بہادر[91] کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی؛ آج تک مالوا کے گھروں سے اس کے دُہروں کی نوائیں سنی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدرشناسیوں سے اس فن کو جو عروج ملا، اس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے ان تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے، جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہو گئے تھے اور ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔[92] جہانگیر نے اپنی توزک میں جا بجا ایسے اشارے کیے ہیں، جن سے اس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی حسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضہ یہی تھا کہ فنونِ لطیفہ کا قدرشناس ہو۔ چنانچہ شاعری، مصوری اور موسیقی تینوں کا دلدادہ اور اعلیٰ درجہ کا کمال شناس تھا۔ اس کے دربار میں جس درجے کے شاعر، مصور اور گوّیے جمع ہو گئے تھے، پھر ہندوستان کی تاریخ میں جمع ہونے والے نہ تھے۔ اس کے دربار کے ایک مصوّر نے

الیزبتھ[93] کے سفیر کو اپنا حال دکھا کر حیران کر دیا تھا۔ اُس کے شاعرانہ ذوق کے لیے اس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے:

از من متاب رُخ کہ نیَم بے تو یک نفس
یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابر ست[94]

اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنونِ دانشمندی میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیلِ علم اور تکمیلِ تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ امراء اور شرفاء کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح تمام فنونِ مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا، اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ملک کے ہر حصّے سے باکمالانِ فن کی مانگ آتی تھی، اور دہلی، آگرہ، لاہور اور احمد آباد کے گوّیے بڑی بڑی تنخواہوں پر امراء اور شرفائے کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو نوجوان تکمیلِ علم کے لیے بڑے شہروں میں آتے، وہ وہاں کے عالموں اور مدرّسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالانِ موسیقی کو بھی ڈھونڈھتے اور پھر ان کے حلقۂ تعلیم میں زانوئے تحصیل تہ کرتے۔ دکن میں احمد نگر، بیجاپور، اور برہان پور کے اہلِ فن مشہور تھے؛ دوآبہ میں دہلی اور آگرہ کے، اور پنجاب میں لاہور، سیالکوٹ اور جھنگ کے۔

اس عہد میں ایران اور توران سے جو افاضل و اشراف آتے، وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و مناسبت کی ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے، اور چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مقام شناس بن جاتے تھے۔ محمد قاسم فرشتہ[95] صاحبِ تاریخ کا باپ مازندران سے آکر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت مازندران کی تھی؛ لیکن اسے ہندوستانی موسیقی سے اس قدر شغف ہوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی، یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ علاء الملک تونی[96] جو جلوسِ شاہجہانی کے ساتویں سال ہندوستان آیا اور فاضل خان کے خطاب سے مخاطب ہوا، اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں عہدۂ وزارت

پر فائز ہوا۔ ہندوستانی موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ اس سے استفادہ کرتے تھے۔

اس عہد کے کتنے ہی مقدس علماء ہیں جن کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے، لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ ملّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا عالم و ماہر تھا۔ اکبر نے اپنے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا لیتا ہے!" [97]

ملّا عبدالقادر بدایونی [98] جیسا متشرع اور متصلب شخص بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اور فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اس کی سفارش کرتے ہوئے اس مشاقی کا ذکر کر دے [99]۔ علامہ سعداللہ شاہجہانی جن کی فضیلتِ علمی اور ثقاہتِ طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ رائے دے سکتے تھے؛ اُن کے استاد ملّا عبدالسلام لاہوری تھے۔ اُن کے حلقۂ درس کی عالمگیریوں نے سمرقند اور بخارا تک کو مسخر کر لیا تھا، اور جب شاہجہان نے شہزادوں کی تعلیم کے لیے تمام علمائے مملکت پر نظر ڈالی تھی، تو نظرِ انتخاب نے انہی کی سفارش کی تھی۔ لیکن اُن کے ذوقِ موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ہدایہ اور بزدوی کے مقاماتِ حل کیا کرتے تھے، اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ معالی خان، جو ملّا طاہر پٹنی محدثِ گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے، ان کے حالات میں صاحبِ مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ ملّا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانشمند خان کہ سرآمدِ علمائے عصر تھا اور شاہجہان کے دربار میں اس کا مباحثہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے، ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہو گیا کہ وقت کے باکمالانِ فن کو اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ حکیم برنیر فرانساوی

صاحب سفرنامۂ ہند اسی دانشمند خان کی سرکار میں ملازم تھا، اور غالباً اُسی کی صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکمائے فرنگ کا اسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔
شیخ علاء الدین[108] جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گذرے ہیں اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بکثرت گائی جاتی ہے[109]:

ندانم آں گلِ رعنا چہ رنگ و بُو دارد — کہ مرغِ ہر چمنے گفتگوے اُو دارد
نشاطِ بادہ پرستاں بمنتہیٰ برسید — ہنوز ساقیِ ما بادہ در سُبو دارد

اُن کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلاتِ موسیقی کے غیر معمولی مشاق تھے۔
شیخ جمالی صاحب سیر العارفین[111] اور ان کے لڑکے شیخ گدائی[112]، دونوں کا فن موسیقی میں توغل معلوم ہے۔ دورِ آخر میں مرزا مظہر جان جاناں[113] اور خواجہ میر درد[114] فنِ موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرضِ اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصوّر کرتے۔
شیخ عبد الواحد[115] بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے۔ سلوک و تصوّف میں ان کی کتاب سنابل مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں اُن سے گرم ہوتی تھیں۔
بیرم خان[117] موسیقیِ ہند کا بڑا قدر شناس تھا۔ اور اس کے لڑکے عبد الرحیم خانخاناں[118] کی قدر شناسیاں تو اس درجہ تک پہنچ گئی تھیں کہ اکبر اور جہانگیر کی شاہانہ فیاضیاں بھی اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ عبد الباقی نہاوندی نے مآثرِ رحیمی کے خاتمہ میں جہاں ان علماء و شعرا کا ذکر کیا ہے، جو خانخاناں کی سرکار سے وابستہ تھے، وہاں موسیقی کے باکمالوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ ان میں ایرانی اور ہندوستانی، ہندو اور مسلمان دونوں تھے[119]۔
شاہنواز خان صفوی کے حالات میں صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ شیفتۂ موسیقی بود و خوانندہا

سازندہا کہ پیش خود جمع کردہ بود، نظیر نداشتند" قریب قریب یہی الفاظ ہونگے ۔ حافظہ سے لکھ رہا ہوں اور کتاب دیکھے ہوئے سالہا سال گذر گئے[۱۲۰]۔ زین خان کوکہ کا علوم درسیہ میں شغف معلوم ہے۔ پنجاب کی صوبیداری کے زمانے میں بھی اس نے درس و تدریس علوم کا مشغلہ بالالتزام جاری رکھا تھا، لیکن اُس کے حالات میں بھی سب لکھتے ہیں کہ "بکبت و راگ شغفے داشت، و ساز را بکمالِ حسن و خوبی مینواخت"[۱۲۱]۔ اس کا لڑکا مغل خان بھی اس باب میں اپنے باپ کا جانشین تھا[۱۲۲]۔ خان کلاں میر محمد جو شمس الدین اتکہ کا بھائی تھا موسیقی ہند کے علم و مہارت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا[۱۲۳]۔ مرزا غازی خان بن جانی بیگ حاکمِ سندھ و قندھار کی نسبت سب لکھتے ہیں کہ نغمہ پردازی، طنبور نوازی اور تمام سازوں کے بجانے میں بے نظیر تھا[۱۲۴]۔ ملا مرشد یزدجردی نے اسی کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی[۱۲۵]:

گر نغمۂ سازت بسکوں می آید   رمزے ست بگو بمیت کہ چوں می آید

از بسکہ بگرد زخمہ ات می گردد   پیچیدہ ز طنبور بروں می آید

خانِ زماں میر خلیل[۱۲۶] نے جو یمین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا، اس فن میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی، کہ لوگ اپنے اختلافات اُس کے آگے فیصلہ کے لیے پیش کرتے۔ سَرس بائی[۱۲۷] جو شہزادہ مراد بخش کی محبوبہ تھی، خیال گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، مگر خود شہزادہ کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر ناز کرتی۔ اورنگ زیب نے جب مراد کو قید کیا تو سَرس بائی بھی تیار ہوگئی کہ اُس کے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارا کرے۔ چنانچہ مراد کے ساتھ قلعۂ گوالیار میں عرصہ تک محبوس رہی[۱۲۸]۔

مرزا عیسٰے خاں ترخاں[۱۲۹] جس نے جانی بیگ کی وفات کے بعد سندھ میں بڑی شورش برپا کی تھی، نغمہ سنجی اور ساز نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

اب اس وقت حافظہ کی گرہیں کھلنے لگی ہیں، تو بیشمار واقعات سامنے آرہے ہیں شہزادہ خرّم کی ماں، مان متی[۱۳۰] جو راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی، جب جہانگیر کے محل میں آئی، تو اُس کے

گانے کا محل میں شہرہ ہوا۔ جہانگیر چونکہ خود ماہرِ فن تھا، اس لیے اُس نے امتحان لیا اور جب دیکھا کہ امتحان میں پوری اُتری تو بہت خوش ہوا، اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اُس کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے انھیں تیار کرے۔ خود خرّم یعنی شاہجہان کے ذوق و مناسبتِ فن کا یہ حال تھا کہ تان سین کا جانشین لال خاں[۱۳۱] اس کا نام لے کر کان پکڑتا تھا۔ دھرپد میں شاہجہان کے رسوخِ ذوق کا مؤرخوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ[۱۳۲] کے لڑکے ناصر جنگ شہید[۱۳۳] کو موسیقی کے شوق نے سنسکرت زبان کی تحصیل کا شوق دلایا، تاکہ کلاسیکل موسیقی کی قدیم کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کر سکے۔ اس کے حالات میں صاحبِ شہادت نامہ لکھتے ہیں کہ زبانِ سنسکرت سے واقف اور موسیقی اور سنگیت میں ماہر تھا۔

اس عہد میں ایک ایک امیر کی فیاضیاں ترقیِ فن کے لیے شاہانہ فیاضیوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتی[۱۳۴] کا پوتا اسلام خاں[۱۳۵] جب جہانگیر کے عہد میں بنگال کا صوبیدار ہوا، تو اس کی سرکار میں اسّی ہزار روپیہ ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ صاحبِ مآثر الامرا لکھتے ہیں[۱۳۶] کہ اُس کے دسترخوان پر ایک ہزار لنگریاں[۱] کمال تکلّف و اہتمام سے دونوں وقت چنی جاتی تھیں، مگر خود اس کا یہ حال تھا کہ جوار کی روٹی اور ساگ کا خشکہ ساگ کے ساتھ کھاتا اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ بھی لکھا ہے[۱۳۷] کہ وہ عمر بھر جامۂ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کرتا پہنتا رہا اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی طاقیہ[۲] اوڑھتا۔

اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشّف سے اگرچہ فنونِ لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی مگر یہ جو کچھ ہوا

[۱] "لنگری" لکڑی کی روغن کی ہوئی سینی کو کہتے ہیں، جو لکڑی کے طشت کی طرح بہت بڑی ہوتی تھی، اور ایک مسلّم گوسفندِ بریاں اس میں رکھا جا سکتا تھا۔

[۲] "طاقیہ" ہلکی ٹوپی کو کہتے تھے، جو گھر میں سر پر رکھ لیتے۔ آج کل بھی عرب میں اس ٹوپی کو طاقیہ ہی کہتے ہیں۔

صرف دربارِ شاہی تک محدود نہ تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے ملک کے ہر گوشہ میں جو نہریں رواں کردی تھیں، وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رُخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہو جاتیں۔ بلاشبہہ عالمگیری عہد میں شاہی سرکار کے کارخانے بند ہو گئے تھے، لیکن ملک کے ہزاروں لاکھوں گھروں کے کارخانے کون بند کرسکتا تھا! میں نے اس مکتوب کی ابتدا میں فارسی کتاب راگ درپن کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب فقیر اللہ سیف خان[138] نے مرتّب کی تھی جو اسی عالمگیری عہد کا ایک امیر اور ناصر علی سرہندی کا ممدوح تھا۔ شیر خان لودھی صاحب مراۃ الخیال[139] بھی اسی عہد میں تھا، جس نے ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی، دونوں میں دستگاہ پیدا کی اور پھر دونوں پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ تذکرہ مراۃ الخیال میں بھی ایک فصل موسیقی پر لکھی ہے اور اپنے ذوقِ فن کا ذکر کیا ہے۔ موسیقی پر اس کی کتاب میری نظر سے گذر چکی ہے۔ اس کا ایک خوشخط نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس سلسلہ میں خود اورنگ زیب کی زندگی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیّہ تھی جو "زین آبادی" کے نام سے مشہور ہوئی، اور اس کے نغمہ و حسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانۂ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب مآثر الامرا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے[140] کیا خوب شعر لکھا ہے:

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا [141]

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا، لیکن ایک زمانہ میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے: اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی، ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا، اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحرکار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سایے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جو ہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا، زین آبادی نے نہ تو شہزادہ کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا، نہ اس کی خالہ کا، بیباکانہ اچھلی اور ایک شاخ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گذری اور اس نے ملامت کی، تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا، اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا:

بالا بلند عشوہ گرِ سروِ نازِ من
کوتاہ کرد قصۂ زہدِ درازِ من [143]

صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ "بکمالِ ابرام و سماجت زین آبادی را از خالۂ محترمۂ خود گرفت۔ باآں ہمہ زہدِ خشک و تفقہ بحت، شیفتہ و دلدادۂ او شد۔ قدحِ شراب بدست خود پُر کردہ می داد۔ گویند روزے زین آبادی ہم قدحِ بادہ پُر کردہ، بدستِ شہزادہ داد و تکلیفِ شرب نمود"[144]۔ یعنی بڑی منت و الحاح کرکے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہدِ خشک اور خالص تفقہ کے جس کے لیے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا، اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالمِ نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے

اپنے ہاتھ سے جام لبریز کرکے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگا لے۔ دیکھیے، عرفی کا ایک شعر کیا موقعہ سے یاد آگیا ہے، اور کیا چسپاں ہوا ہے:

ساقی تو ئی و سادہ دلی ہیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک مے گسار شد [145]

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو!

مے حاجت نیست مستیم را
در چشمِ تو خمار باقیست [146]

لیکن اس عیّار کو رحم نہ آیا:

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی میاموز آں دو چشمِ نامسلمان را! [147]

[148] ناچار شہزادہ نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگا لے۔ گویا وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا کی پوری رُوداد پیش آگئی:

عشقش خبر ز عالمِ مدہوشی آورد
اہلِ صلاح را بقدح نوشی آورد [149]

لیکن جونہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ ہو گیا ہے، فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا: "غرض امتحانِ عشق بود، نہ کہ تلخ کامیِ شما!" [150]

ایں جورِ دیگر ست کہ آزارِ عاشقاں
چنداں نمی کند کہ بہ آزار خو کنند! [151]

[152] رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہان تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ [153] دارا شکوہ نے اس حکایت کو اپنی سعات

وغمّازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا "ببینید، ایں مزوّرِ ریائی چہ صلاح وتقویٰ ساختہ است؟"[154] ہا فیضی نے کیا خوب کہا ہے:[155]

چہ دستے بُری اے بتیغ عشق اگر دادست
بُرِ زبان ملامت گرِ زلیخا را!

نہیں معلوم، اس قضیّہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا، لیکن قضا وقدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا یعنی عین عروجِ شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے:

خود رفتہ ایم و کنجِ مزارے گرفتہ ایم
تا بارِ دوشِ کس نشود استخوانِ ما[156]

آپ نے عاقل خان رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستارِ خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا، لیکن اسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اس بات پر وابستگانِ دولت کو تعجب ہوا کہ سوگواری کی حالت میں سیر و تفریح اور شکار کا کیا موقع تھا! جب اورنگ زیب شکار کے لیے محل سے نکلا، تو عاقل خان نے کہ میرِ عسکر تھا، تنہائی کا موقعہ نکال کر عرض کیا، "اس غم واندوہ کی حالت میں شکار کے لیے نکلنا کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی ہوگا جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی"!
اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالہ ہائے خانگی دل را تسلّی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اس پر عاقل خان کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا:

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت!

اورنگ زیب پر رقّت کا عالم طاری ہوگیا۔ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ عاقل خان نے کہا: اس شخص کا ہے، جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خان کا ہے۔ بہت تعریف کی اور اُس دن سے اُس کی سرپرستی اپنے ذمّہ لے لی۔[157] اس حکایت میں جس "پرستارِ خاص" کی موت کا ذکر آیا ہے، اس سے مقصود یہی "زین آبادی" ہے۔

صاحبِ مآثر الامرا نے خان زمان کے حال میں لکھا ہے کہ فنّ موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا، اور کاروبارِ منصب کے انہماک کے ساتھ راگ و رنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگانِ خوش آواز اور مغنّیاتِ عشوہ طراز اس کی سرکار میں ہمیشہ جمع رہتی تھیں۔ انہی میں "زین آبادی" بھی تھی جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی مدخولہ تھی۔[158]

خود اورنگ زیب بھی موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا، کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اس نے بھی اس کی تحصیل کی ہوگی۔ البتہ آگے چل کر اس کی طبیعت کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کی، اس لیے اس کے اشتغال و ذوق سے کنارہ کش ہوگیا، اور سلطنت پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے یہ کارخانہ ہی بند کر دیا۔ گویّوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا، تو اس نے کہا: "اس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے سر نہ اٹھا سکے۔" لیکن اورنگ زیب کے سارے منصوبوں کی طرح سلطنت کا یہ پرہیزی مزاج بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا، اور اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ جس طرح انگلستان میں پیوریٹن[160] (Puritan) عہد کی خشک مزاجیاں اعادۂ حال کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھیں، اسی طرح یہاں بھی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا مزاج پھر لوٹ آیا۔ فرخ سیر[161] اور محمد شاہ[162] کے عہد کی تر دماغیاں در اصل اسی عالمگیری خشک مزاجیوں کا ردِ عمل تھا۔ سیّد عبدالجلیل[163] محدث بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی کی تبریک میں جو مثنوی لکھی ہے، اس سے اس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[164]

ہندوستان کے قدمائے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے

جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کر کے رام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکارِ قمرغہ کے سر و سامان میں داخل ہوئی اور اس کے طائفے باکمالانِ فن کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص [165] نے مرأۃ المصطلحات میں اس طریقِ شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکارِ قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا، تو یہ طائفے شکارگاہ میں بھیج دیے جاتے تھے، اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے۔ اور پھر رقص و سرود کی محویت انھیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکارِ قمرغہ کا قصد کیا، اور اسی رقص و سرود کا جال بچھایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے تو نور جہان کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا:

همه آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امیدِ آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ شعر سن کر جہانگیر کی غیرتِ مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اٹھائے، دل گرفتہ واپس آ گیا۔

یہ خیال کہ جانور گانے سے متاثر ہوتے ہیں، دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ تورات میں [166] ہے کہ حضرتِ داؤد کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندستان کے قدمائے فن نے تو اسے ایک مسلّمہ حقیقت مان کر اپنے بیشمار عملیات کی بنیادیں اسی عقیدہ پر استوار کی تھیں۔ سانپ، گھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حُدی کی لے اگر رک جاتی ہے، تو محمل کی تیز رفتاری بھی رک جاتی ہے:

حُدی را تیز تر میخواں چوں محمل راگران بینی [167]

البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا، اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو، تو اُسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے؛ وہ صید کو جس طرف لے جانا چاہے، صرف اپنے راگ کے زور سے لگائے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے، جانوروں کی اس محوّیت و تسخیر کو عوام تعویذ اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض گانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں جہاں جزیرۂ سرندیپ کا ذکر کیا ہے لکھتا ہے: یہاں بندر بہت ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر اُن کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں، پڑھنے لگے، تو بندر اس کے مطیع ہو جائینگے اور اسے کچھ نقصان نہیں پہنچیگا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہوگی۔ یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہوگا، اشعار کی لَے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہوگی۔ پہلی تصریح غالباً اُس باب میں ہے جو فی ذکر علوم لھم کا سر ۃ الاجنحۃ علی افق الجھل کے عنوان سے ہے، اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملیگی جو فی معارف شتّیٰ من بلادھم و انھارھم کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کا علم الحیوان اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا۔ اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماعت کا حاسّہ ہی نہیں ہے۔

والہ داغستانی[۱۶۸] صاحب ریاض الشعرا، قزلباش خاں امید[۱۶۹]، میر معزّ فطرت موسوی[۱۷۰]، مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری[۱۷۱]، یہ سب تازہ ولایت ایرانی تھے، لیکن ہندوستان کی صحبتوں سے آشنا ہوتے ہی انھوں نے محسوس کیا کہ موسیقیِ ہند سے واقفیت

پیدا کیے بغیر اپنی دانش و شائستگی کی مسند نہیں سنبھال سکتے"، اس لیے اس کی تحصیل ناگزیر ہے۔ قزلباش خان اُمید کی مجالسِ طرب کا حال قاضی محمد [صادق] خان[172] اختر نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فن میں کس درجہ دستگاہ اسے حاصل ہو گئی تھی۔[173] شیخ علی حزیں[174] ایرانی موسیقی سے پوری طرح باخبر تھے، لیکن ہندوستان میں انھوں نے ہندوستانی موسیقی کی بھی تحصیل کی۔ پٹنہ کے قیام کے زمانے میں ان کا یہ دستور تھا کہ ہفتہ کے دو دن موسیقی کی صحبت کے لیے مخصوص کر دیے تھے؛ شہر کے باکمال حاضر ہوتے اور فن کی باریکیوں کے نمونے پیش کرتے۔

اودھ کی نوابی کے دور میں تفضّل حسین خاں[175] علامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی۔ شوستری[176] صاحبِ تحفۃ العالم[177] کلکتہ میں ان سے ملا تھا، جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام علومِ عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی درجۂ اجتہاد رکھتے ہیں، اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا، ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں۔ ایک ماہرِ فن سازندہ صرف اس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خوابگاہ میں خواب آور گت چھیڑ دیا کرے۔

لکھنؤ کے علماء فرنگی محل میں بحرالعلوم[179] کی نسبت اُن کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں ان کا رسوخ عام طور پر مسلم تھا۔[180]

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اشتغال تحسینِ فکر اور تہذیبِ طبع کا باعث ہوتا ہے، وہی دورِ تنزل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسنِ استعمال اور اعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے، اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی اور رصد عیسی کا دھبّہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر[181] کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا، تو مجلسِ سماع و نشاط سے اُن کی تھکن مٹاتا؛ اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر

کر دیتیں، دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ[182] جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا، تو موسیقی کے باکمالوں کو بار یاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ[183] کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا، تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقع دیتا۔ موسیقی کا شوق دونوں کو تھا مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

سَارَتْ مُشَرِّقَةً وَسِرْتُ مُغَرِّبًا　　　　شَتَّانَ بَیْنَ مُشَرِّقٍ وَمُغَرِّبِ

اس بات کی عام طور پر شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرّماتِ شرعیہ میں داخل ہے حال آنکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہا نے سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدّد کیا؛ اور یہ تشدّد بھی بابِ قضا سے تھا، نہ کہ بابِ تشریع سے قضا کا میدان نہایت وسیع ہے؛ ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جا سکتی ہے؛ لیکن اس سے تشریع کا حکمِ اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل جا سکتا؛ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ؟[185] لیکن یہ بحث میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا، یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی جا رہی ہے۔ وہ دوسرا ہے:

مومن! آ، کیشِ محبت میں کہ سب کچھ ہے روا
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ![186]

دیکھیے، بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر لگائے، تو معلوم ہوا کہ فلسکیپ کے چھبّیس صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہر حال اب قلم روکتا ہوں

حرفِ نامنظورِ دل، یک حرف ہم بیش ست و بس
معنیِ دلخواہ گر صد نسخہ باشد، ہم کم ست[187]

———— x ————

حواشی

از

مالک رام

صفحہ	شمار	
		دیباچہ
۱	۱	میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی، سیّد العارفین میر سیّد لطف اللہ حسینی واسطی بلگرامی المعروف شاہ لدّھا کے صاحبزادے، صوفی صافی اور شاعرِ حقائق گو تھے۔ "غبارِ خاطر" کے علاوہ ایک کتاب "گرامی نامہ" بھی اُن سے یادگار ہے۔ شعراے فارسی کے حالات میں ایک تذکرہ "سفینۂ بیخبر" قلم بند کیا تھا۔ اُن کے دیوان میں تقریبًا سات ہزار شعر ہوں گے۔ روزِ دوشنبہ ۲۴ ذی القعدہ ۱۱۴۲ھ/ ۱۶ جون ۱۷۳۰ء کو دلّی میں انتقال ہوا اور جوارِ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ میں دفن ہوئے۔ (سروِ آزاد: ۳۱۵-۳۲۵ ؛ نزہۃ الخواطر: ۶ : ۱۸۲-۱۸۳)
	۲	حسّان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اُن علما و شعرا میں سے ہیں، جن کے وجود پر اس ملک کو بجا ناز ہوسکتا ہے۔ ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ/ ۱۸ جون ۱۷۰۴ء بلگرام میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم میں تعلیم پائی اور درجۂ استناد حاصل کیا۔ سفرِ حج کے بعد اورنگ آباد دکن میں مقیم رہے اور نظام الدین ناصر جنگ شہید سے تعلّق پیدا کیا، اور ان کے انتقال کے بعد آزاد رہے۔ متعدد فارسی اور عربی کی تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ عربی میں ان کے سات دیوان ہیں۔ سروِ آزاد، ید بیضا، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیا، سبحۃ المرجان، مآثر الکرام متعدد تذکرے لکھے۔ جمعہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء کو انتقال ہوا۔ "آہ غلام علی آزاد" تاریخ ہے۔ خلد آباد (مہاراشٹر) میں مدفون ہیں۔ (سروِ آزاد: ۲۹۱-۳۰۷؛ مآثر الکرام: ۱۶۱-۱۶۴؛ نزہۃ الخواطر، ۶ : ۲۰۱-۲۰۵ ؛ اتحاف النبلا : ۳۳۵)

حواشی

۳ سراج الدین علی خان آرزو۔ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کی اولاد میں ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں میر عبدالصمد سخن اور غلام علی احسنی گوالیاری سے مشورہ رہا۔ بعہدِ فرخ سیر دلّی آئے، اور حملۂ نادری کے نتائج سے پریشان ہوکر اواخرِ محرم ۱۱۶۸ھ/ اکتوبر ۱۷۵۴ء میں شجاع الدّولہ کے زمانے میں فیض آباد پہنچے۔ جہاں سالار جنگ کی سفارش پر تین سو مشاہرہ مقرر ہوگیا۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ/ ۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ پہلے اماناً فیض آباد میں دفن ہوئے؛ بعد کو ان کی وصیت کے مطابق لاش دلّی آئی اور یہیں مدفون ہیں۔ (سروِ آزاد : ۲۲۷-۲۳۱؛ خزانۂ عامرہ: ۱۱۶؛ سفینۂ خوشگو: ۳۱۲-۳۲۱؛ سفینۂ ہندی: ۵-۶)

۴ آنند رام مخلص۔ سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ۔ پاکستان) کے رہنے والے تھے، لیکن تقریباً ساری عمر شاہجہان آباد میں بسر ہوئی، جہاں وہ دربارِ شاہی میں اعتماد الدولہ قمر الدین خان اور سیف الدّولہ عبدالصّمد خان ناظمِ صوبۂ لاہور کے وکیل رہے۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے معاصر سیاسی حلقوں میں اُن کا کیا مرتبہ ہوگا۔ انھیں 'رائے رایان' کا خطاب ملا تھا۔ ابتدا میں بیدؔل سے اصلاح لیتے رہے، اُن کے بعد خانِ آرزو سے مشورہ رہا۔ ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰-۱۷۵۱ء میں بعارضۂ نفث الدم انتقال کیا۔ (خزانۂ عامرہ: ۴۲۵؛ شمعِ انجمن: ۴۳۴؛ سفینۂ خوشگو: ۳۳۱-۳۳۸؛ سفینۂ ہندی: ۱۹۶-۱۹۷)

۵ محمد اجمل خان فروری ۱۸۹۷ء میں یوپی کے قصبے گوتنی (ضلع پرتاپ گڈھ) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے، ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ کچھ دن وشوبھارتی میں مدرّس رہے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کیا؛ اور وہ مرحوم کے یومِ آخر تک اسی حیثیت سے اُن سے وابستہ رہے۔ خود بھی مصنّف تھے؛ متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں سب سے اہم حضرت رسول کریم صلعم کی سوانحعمری ہے، جو قران سے اخذ کی گئی ہے۔

مولانا آزاد کی وفات کے بعد انھیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی وفات تک یہاں رہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی صبح ولنگڈن اسپتال، نئی دلّی میں انتقال ہوا؛ اور اسی دن سہ پہر کو بستی نظام الدین (غربی) میں احاطۂ خاندانِ خواجہ حسن نظامی میں دفن ہوئے۔

۲	۱	کلّیاتِ غالب (فارسی): ۲۷۵۔ مطبوعہ دیوان میں مصرعِ اولیٰ میں "نسخہ" کی جگہ "قصّہ" ہے؛ اور یہی ٹھیک ہے۔

خط ۱

۳	۱	خواجہ حافظ شیرازی کے مصرع پر نیا مصرع لگا کر مولانا نے اسے اپنا لیا ہے۔ حافظ کا دوسرا مصرع یوں تھا: می گویمت دعا و ثنا می فرستمت۔ (دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۵۱)
	۲	پہلی تینوں اشاعتوں میں یہاں اس خط کے بعد نواب صدر یار جنگ کا مندرجۂ ذیل خط چھپا تھا:

حبیب گنج (علی گڈھ)

۱ جولائی ۴۵ء

صدیقِ حبیب!

حس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے محسوس کیا تھا کہ نورِ عظمت جہانتاب ہوگا۔ ہوا، اور کس شان سے ہوا۔ ۲۷ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ایک ہنگامہ ایک گروپ کی شکل میں سامنے آیا۔ اس میں ایک پیکرِ محبوب بھی تھی؛ قینچی لی، مجمعِ اغیار سے اُسے جدا کیا۔ دیکھا شیراز کی طرف سے صدا آئی:

روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست
منّتِ خاکِ درت بصرے نیست کہ نیست

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقع نہ ہو:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رندان خبرے نیست کہ نیست

خیر، یہ تو ترانۂ شیراز تھا۔ کان لگاتا ہوں، تو شملہ کی چوٹیوں سے دوسرا ترانۂ محبت سامعہ نواز ہو رہا ہے :

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیان و دعا می فرستمت!

جو کان نے سُنا، تیسرے دن نقوشِ دل افروز کے پردے پر آنکھوں نے دیکھ لیا۔ اجازت ہو تو دوسرا مصرع میں بھی دُہرا دوں !

می بینمت عیان و دعا می فرستمت !

نیاز کیش
حبیب الرحمٰن

نواب صاحب مرحوم کے خط میں کے تینوں شعر خواجہ حافظ شیرازی کے ہیں۔
اس کے بعد پھر نواب صاحب ہی کا مندرجۂ ذیل نامۂ منظوم چھپا تھا :

حبیب گنج (علی گڑھ)
۶ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ

محوِ نظارۂ گلمرغ نگارے دارم — کز خیالش بہ دلِ زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بحضورش گذری — عرضہ دہ شوق کہ در جانِ فگارے دارم
ور بپرسد کہ "مگر شوقِ پیامم وارد"؟ — سر فرود آر و زمن گوے کہ "آرے دارم"

دُور دستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پاے خود ثمر می افگند

اسیر آزاد
حبیب

اس کے پہلے تینوں شعر نواب صاحب کے اپنے ہیں۔ وہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے؛ چوتھا شعر صائب تبریزی کا ہے (کلیات صائب : ۵۰۳)، چھپے ہوئے نسخے میں البتہ پہلے مصرع میں 'نعمت' کی جگہ ٹھیک 'احسان' ہے۔

خط ۲

۴	۱	بتغیرِ الفاظ یہ مصحفی کا مصرع ہے (جواہرِ سخن، ۲ : ۶۴۹)۔ پورا شعر یوں چھپا ہے: سراغِ قافلۂ اشک لیجیے کیونکر نکل گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے لیکن رضا لائبریری، رام پور میں مصحفی کے دیکھے ہوئے خطی دیوانِ اوّل میں دوسرا مصرع یوں ہے: گیا ہے دُور نکل وہ دیارِ حرماں سے
	۲	فیضی کے مشہور قصیدے کا مطلع ہے، جو اس نے اکبر کی مدح میں کہا تھا۔ (شعر العجم، ۲ : ۳۹) صحیح 'می کشد' کی جگہ 'می کند' ہے۔
۵	۳	دیوانِ کلیم کاشانی : ۳۲۶۔ مصرع ثانی میں مطبوعہ روایت 'از انیم' کی جگہ 'بہ آنیم' ہے۔
	۴	کلیاتِ غالب : ۳۶۰
	۵	اس شعر کا قائل مجہول ہے، لیکن یہ شعر کئی کتابوں میں ملتا ہے، مثلاً سمط اللآلی، ۱ : ۴۱؛ شرح التعرف لمذہب التصوف، ۱ : ۶۲؛ ایضاً، ۲ : ۱۷۱ وغیرہ

خط ۳

۶	۱	صبری اصفہانی کا شعر ہے (بہترین اشعار : ۲۹۴)۔ پٹرمان کے نسخے میں مصرعِ اول میں 'درد' کی جگہ 'حال' ہے۔
	۲	پہلے ایڈیشن میں 'پھیلی ہوئی ہے' کی جگہ 'پھیلتی گئی ہے' تھا۔
	۳	دیوانِ حافظ : ۲۴۸۔ مطبوعہ نسخے میں 'می نوشیم' کی جگہ 'می گریم' ہے۔
۷	۴	دیوانِ نظیری : ۱۵۰۔ دیوان میں دونوں مصرعوں میں اختلاف ہے: پہلے مصرعے میں "رسم و راہ" کی جگہ "رسمہاے" اور دوسرے میں "نہ بود" کی جگہ "نہ شد"۔
۸	۵	اس سے مولانا آزاد مرحوم کی بیگم کے انتقال کی طرف اشارہ مقصود ہے (دیکھیے نیچے مکتوب ۲۱، ص ۲۲۴-۲۴۲)

۶ کلیاتِ غالب : ۵۲۵ ۔ صحیح 'دلِ گم گشتہ' ہے، اگرچہ بعض مطبوعہ نسخوں میں 'سرگشتہ' بھی ملتا ہے۔ پہلا مصرع ہے : بگوشم می رسد از دُور آوازِ درا امشب ۔

۷ دیوانِ حافظ : ۱۶۶ ۔ مطبوعہ نسخے میں مصرعِ ثانی میں 'این' کی جگہ 'آن' ہے ۔

۹ | ۸ دیوانِ غالب : ۱۲۶ ۔ پورا شعر یوں ہے :

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

۹ کلیاتِ غالب : ۴۲۹ ۔ پورا شعر ہے :

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر رُوے تو بود
چشم سوے فلک و رُوے سخن سوے تو بود

۱۰ | ۱۰ پہلی اشاعت میں یہاں صرف 'موٹر' تھا۔

۱۱ پہلی اشاعت میں آخر میں یہ لفظ زاید تھے : 'جواب وہیں مرحمت ہو'۔

خط ۴

۱۱ | ۱ دیوانِ غالب : ۱۳۹ ۔ ٹھیک مصرعِ اولیٰ میں 'سر ہے' کی جگہ 'ہے سر' ہے ۔

۲ دیوانِ غالب : ۱۲۵ ۔

۱۲ | ۳ آقا رضی مسرور قزوینی کا شعر ہے۔ (شمعِ انجمن : ۴۳۲؛ بہترین اشعار : ۵۶۶) شمعِ انجمن کے مصرعِ اولیٰ میں 'بہ بیند' ہے؛ یہ سہوِ کتابت ہے ۔

۴ Coupe' ریل گاڑی کا بند ڈبہ جس میں صرف دو آدمیوں کے لیے جگہ ہوتی ہے؛ یہ عام طور پر اہم شخصیتوں کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔

۵ دیوانِ حافظ : ۱۴۱

۶ فیضی کا شعر ہے (شعر العجم، ۳ : ۷۰) شعر العجم میں 'منزلِ آخر' کی جگہ 'منزلِ اول' ہے۔

۱۳ | ۷ کلیاتِ بیدل، ۴ (عنصرِ دوم) : ۱۳۲ ۔ کلیات کے تینوں مصرعوں میں "زندگی" کی جگہ "ہستیم" ہے ۔

۸ طبع اول میں یہ "سے" موجود نہیں ہے۔

۹ Alarum Time Piece کی وہ گھڑی جس کی ایک خاص سوئی کو کسی گھنٹے پر جما کر اسے کوک دیا جائے، تو وقتِ مقرّرہ پر اس سے گھنٹی بجنے لگتی ہے۔

۱۰ گلستان (بابِ اول) کا شعر ہے (کلیات سعدی: ۱۵)

۱۴ | ۱۱ میرزا عبدالقادر بیدل کا مصرع ہے (کلیات، ۱: ۸۷۸)۔ پورا شعر ہے:

نہ بنقشِ بستہ مشوشم، نہ بحرفِ ساختہ سرخوشم
نفسے بیادِ تو سرکشم، چہ عبارت و چہ معانیم

۱۲ یہ شعر ابو نُواس کا نہیں، نہ اس کے دیوان میں ملا، اگرچہ ابوالقاسم الزعفرانی نے بھی اسے ابو نواس ہی کا بتایا ہے۔ اس کے برخلاف راغب اصفہانی نے محاضرات الادبا (۱: ۸۵ نیز ۲: ۲۱۷) میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان (۱: ۲۰۸) میں اسے صاحب بن عباد سے منسوب کیا ہے، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ محاضرات میں مصرع اوّل میں "رقت" کی جگہ "راقت" ہے۔

۱۳ قاآنی کا مصرع ہے (دیوان قاآنی: ۱۴۸)۔ دوسرا مصرع ہے:

اندُہ برد، غم بشکرد، شادی دہد، جاں پرورد

۱۵ | ۱۴ دیوانِ فیضی: ۱۷۴۔

۱۵ دیوان حافظ: ۱۴۵

نسخۂ مطبوعہ میں "در قلم" کی جگہ "برقلم" ہے، اور یہی درست ہے

۱۶ بیدل کا مصرع ہے (کلیات، ۱: ۱۱۷۷)۔ پہلا مصرع ہے:

منِ بیدل حریفِ سعیِ بیجا نیستم زاہد!

۱۷ دیوان حافظ: ۳۲۶۔ مصرع ثانی میں "بفسق" کی جگہ "زفسق" چاہیے۔

۱۶ | ۱۸ خواجہ الطاف حسین حالی کی رباعی کا آخری مصرع ہے (ضمیمۂ اردو کلیات نظمِ حالی: ۱۸؛ نیز کلیاتِ نظمِ حالی، ۲: ۳۷۵)۔ "تذکرۂ صبحِ گلشن" (۱۱۷-۱۱۸) میں بھی یہ ٹھیک حالی ہی کے نام سے درج ہے۔ البتہ تذکرۂ "روزِ روشن" (ص ۶۰۲) میں اسے

راے کانجی سہاے متین الہ آبادی سے منسوب کر دیا گیا ہے، جو غلط ہے۔ پوری رباعی ہے:

سر مفراز، خاکِ پاے ہمہ باش — دلہا مخراش، در رضاے ہمہ باش
با خلق نیامیختن، از خامیِ تست — ترکِ ہمہ گیر و آشناے ہمہ باش

۱۹ دیوان درد: ۵۲

۲۰ کلیات عرفی: ۲۹۵۔ صحیح 'اقلیم' کی جگہ 'جیحون' ہے۔

۱۷ — ۲۱ دیوانِ ذوق (مرتبۂ آزاد): ۱۲۲؛ ایضاً (مرتبۂ ویران): ۵۸۔ مصرع اولیٰ دونوں جگہ مختلف ہے۔ ویران کے نزدیک یہ ہے: "پوشیدہ ان نگاہوں میں سرخوش ہیں رات دن"۔ آزاد لکھتے ہیں: پردہ میں چشم مست کے سرخوش ہیں جو مدام۔

۲۲ ابو نواس کا شعر ہے (دیوان ابی نواس: ۲۸)

۲۳ پہلی اشاعت میں یہ دونوں حاشیے موجود نہیں۔

۲۴ سب اشاعتوں میں یہاں 'اپنے' چھپا ہوا تھا۔ ظاہرا یہ کتابت کی غلطی ہے، کیونکہ توبہ بالاتفاق مؤنث ہے، مثلاً ؏ گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا (غالب) اسی لیے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

۲۵ ملا محمد رضا نوعی خبوشانی کا مصرع ہے (روز روشن: ۷۲۳) مصرع اولیٰ ہے: "خمارِ بادہ ام از توبہ گر پشیماں کرد"، ماثرِ رحیمی (۲: ۶۷۷) میں مصرع اوّل یوں ہے: "خمارِ بادہ گر از توبہ ام پشیماں کرد"۔

۲۶ یہاں سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے۔ 'نشاط' مذکر نہیں، بلکہ مؤنث ہے۔ نوازش لکھنوی کا شعر ہے:

باتیں جو تم نے آج یہ چھیڑیں ملال کی — پھر کیا رہی نشاط تمھارے وصال کی

۱۸ — ۲۷ دیوان نظیری: ۴۶۔ مطبوعہ نسخے میں 'دُردی وصافی' ہے۔

۲۸ خاقانی کا مصرع ہے (کلیات، ۲: ۹۶۷)۔ پورا شعر ہے:

قصہاے بنوشت خاقانی — قلم ایں جا رسید سر بشکست

گویا مولانا آزاد کے ہاں 'واو' زائد ہے۔

خط ۵

۱۹

۱ کلیاتِ بیدل، ۱ : ۱۲۳

۲ میر ضیاالدین حسین المخاطب بہ اسلام خان متخلص بہ والا بدخشی کا شعر ہے (خزانۂ عامرہ: ۱۷۷؛ شمع انجمن: ۵۱۷)

۳ محسن کاکوروی کا مصرع ہے (کلیاتِ نعت مولوی محمد محسن: ۲۰۴) ٹھیک شعر یوں ہے:

حالت نہ پوچھیے مرے شیب و شباب کی
دو کروٹیں تھیں عالمِ غفلت میں خواب کی

یعنی مصرع ثانی میں 'ہیں' کی جگہ 'تھیں' ہے۔

۴ محمد جان قدسی کی رباعی کا آخری مصرع ہے (بزمِ ایران: ۵۲۹)۔ پوری رباعی ہے:

ہر کار کہ در جہاں میسّر گردد — ہر گاہ بہ پایاں رسد، ابتر گردد
نیکو نبود ہیچ مرادے بکمال — چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

۵ حافظ کے 'ساقی نامہ' کا شعر ہے (دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۳۵۸)

۶ طبعِ اول: ورکینگ

۷ کلیاتِ میر (دیوان اول): ۲۰۸

۸ صاحبِ مکان سے مراد شری بھولا بھائی ڈیسائی ہیں، جن کے ساتھ مولانا ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کا ۶ مئی ۱۹۴۶ء کو دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ آخری عمر میں وہ کچھ دماغی پریشانیوں کا شکار رہنے لگے تھے۔

۹ یہ صاحب مولانا آزاد کے حقیقی بھانجے تھے؛ محمد طاہر خان نام تھا۔ ان کی ولادت یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو ہوئی۔ شروع میں چند ماہ ملازمت کی۔ لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا۔ ان کا باندرہ میں قیام تھا؛ بمبئی میں ان کا اچھا خاصا درآمد کا تجارتی کاروبار تھا۔

حکومتِ وقت کے بھی معتمد علیہ تھے؛ خان صاحب کا خطاب ملا تھا؛ M.B.E بھی ہوئے۔ پھر کانگریس میں شامل ہوگئے۔ انتخاب میں کامیاب ہوئے تو MLC اور MLA بنے۔ اور کچھ زمانہ آنریری مجسٹریٹ اور J P (جسٹس آف پیس) بھی رہے۔

لکھنؤ میں ۲۱ جنوری ۱۹۶۳ء کو انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔ اولاد میں دو لڑکے اور ایک صاحبزادی جسمانی یادگار چھوڑے۔ بڑے لڑکے محمد عارف انجینئر بمبئی میں مقیم ہیں (خطوط سیّد حامد علی صاحب، بمبئی)

۲۱ — ۱۰ — دیوان حافظ: ۱۴۷۔ دوسرا مصرع یوں چھپا ہوا ملتا ہے:

بود آیا کہ فلک زیں دو سہ کارے بکند

۱۱ — دیوان حافظ: ۲۳۴۔ پہلا مصرع ہے:

جائے کہ تخت و مسندِ جم می رود بباد

۱۲ — طالب علی عیشی کا مصرع ہے (جواہر سخن، ۲: ۸۱۸)۔ پہلا مصرع ہے:

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل

۲۲ — ۱۳ — اس سے بھولا بھائی ڈیسائی کے صاحبزادے دھیرج لال ڈیسائی مراد ہیں۔ ان کا بعارضۂ قلب بعمر ۴۳ سال ۲۱ مارچ ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوا۔

۱۴ — دیوان حافظ: ۵۸۔ پہلا مصرع ہے:

سحر کرشمۂ وصلش بخواب می دیدم

۱۵ — کہا جاتا ہے کہ یہ مصرع نظام ششم نواب محبوب علی خان والیِ حیدر آباد کا ہے۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ریاست کے بعض اعلیٰ افسروں نے ان کے خلاف کوئی سازش کی تھی، اس موقع پر انھوں نے اطلاع ملنے پر متعلقہ کاغذات طلب کیے کہ دیکھیں، کن لوگوں نے اس سازش میں حصہ لیا ہے، اور یہ مصرع کہا۔ بعد کو اس پر پیش مصرع لگا کر شعر یوں پورا کر دیا:

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں　　کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

(ہماری زبان، علی گڈھ، یکم جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۹) ۔ لیکن مجھے شبہہ ہے کہ یہ مصرع کسی اور کا ہے۔

۱۶ بتغیرِ الفاظ غالب کا مصرع ہے (کلیات غالب : ۴۹۴)۔ پورا شعر ہے :

پشت بر کوہ ست طاقت تکیہ تا بر رحمتست
کار دشوارست و ما برخویش آساں کردہ ایم

۱۷ دیوان حافظ : ۱۴۵

۱۸ Terminus کسی ریلوے لائن کا آخری اسٹیشن ۔ اب اور گاڑیوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ہے۔

۲۳

۱۹ ریسٹوران کار (Restaurant Car) ریل گاڑیوں کا وہ ڈبّہ جس میں کھانا تیار کرکے مسافروں کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔

۲۰ میر انشا کا مصرع ہے (کلام انشا : ۱۵۲)؛ پورا شعر ہے :

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے؛ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

۲۱ کلّیات غالب : ۴۰۰

۲۲ دیوان حافظ : ۳۱۹۔ مطبوعہ نسخے میں شعر یوں ہے :

بنوش مے کہ سبکروحی لطیف مُدام
علی الخصوص درآں دم کہ سرگراں داری

۲۴

۲۳ غالب کی مشہور غزل کا مصرع ہے (دیوان غالب : ۱۹۰)؛ پہلا مصرع ہے :

یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں

طبعِ اوّل میں 'شُور' تھا اور طبعِ ثالث میں 'سوز'؛ درست 'شُور' ہی ہے۔

۲۴ دیوان درد : ۳۱۔ دراصل 'جی' کی جگہ 'دل' ہے۔

۲۵ دیوان حافظ : ۱۵۷

۲۶ ایضاً : ۲۵۔ مصرع اولیٰ ہے :

مرادر منزلِ جاناں چہ امن وعیش، چوں ہر دم

	۲۷	شروح سقط الزند، (شروح، ۳: ۱۲۲۸) دیوان میں مصرعِ اولیٰ میں 'بالخیف' کی جگہ 'بالحزن' ہے۔
	۲۸	طبعِ اوّل: گانوں۔
	۲۹	ملک احمد نظام الملک۔ نظام شاہی خاندان کا بانی ۸۹۵ھ تا ۹۱۵ھ/ ۱۴۹۰ء تا ۱۵۰۹ء حکمران رہا۔ اُس کا باپ ملک حسن نومسلم تھا؛ اُس کا اصلی نام تمّا بھٹ اور اُس کے باپ کا نام بھیر تھا۔ (فرشتہ، ۲: ۱۸۰) اِسی بھیر کی نسبت سے وہ بھیری کہلاتا ہے، اور اسی سے بعض لوگوں نے بحری بنا لیا ہے۔ (اس سلسلے میں مآثرِ رحیمی اور منتخب اللباب کے متعلقہ مقامات بھی دیکھے جائیں)
۲۶	۳۰	تاریخ فرشتہ، ۲: ۱۸۸۔ ۱۸۹
	۳۱	برہان نظام شاہ اوّل: ۹۱۵۔ ۹۶۰ھ/ ۱۵۰۹۔ ۱۵۵۳ء
	۳۲	شبلی نعمانی کا شعر ہے (کلیاتِ شبلی: ۳۵)
	۳۳	چاند بی بی یا چاند سلطانہ، حسین نظام شاہ والیِ احمد نگر کی بیٹی، مرتضیٰ نظام شاہ کی ہمشیر اور بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ تھی۔ علی عادل کی وفات (۱۵۸۰ء) پر اُس کا نابالغ بھتیجا ابراہیم عادل اس کا جانشین ہوا؛ اور ملکہ چاند سلطانہ اس کی سرپرست مقرر ہوئی۔ ۱۵۹۵ء میں اکبری فوجوں نے شاہزادہ مراد کی سرکردگی میں احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ چاند سلطانہ نے جس ہوشیاری اور بہادری سے دفاع کا انتظام کیا اور اپنی فوجوں کی کمان کی، وہ تاریخِ ہند کا روشن باب ہے۔ مراد کو منہ کی کھانا پڑی اور وہ صلحنامے پر دستخط کر کے آگرے کو سدھارا۔ چار برس بعد ۱۵۹۹ء میں دوبارہ اکبر نے دھاوا بول دیا۔ اب کے نہ صرف شاہی افواج کا پلّہ بھاری تھا، بلکہ ملکہ کے ساتھیوں نے بھی غداری کی۔ چیتہ خان خواجہ سرا نے اہلِ قلعہ سے سازش کر کے سلطانہ کو قتل کر ڈالا اور قلعہ اکبر کے قبضے میں آگیا۔
	۳۴	دیوان حافظ: ۹۹۔ مطبوعہ نسخے میں مصرعِ اولیٰ میں 'بفشاں' کی جگہ 'بفگن' ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں (بن بیرم خان خانخاناں)، عہدِ اکبری و جہانگیری کے مشہور امیر، خود صاحبِ علم اور اہلِ علم کے قدر شناس اور مربّی؛ فارسی، ترکی، ہندی تینوں بانوں پر یکساں قدرت تھی۔ اکبر کی فرمایش پر توزکِ بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ فارسی اور ہندی میں کلام موجود ہے۔ ان کی شجاعت اور جنگی قابلیت کے واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ/۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۹ جمادی الاول (۲۰ جمادی الثانی) ۱۰۳۶ھ/۲۶ جنوری (۲۶ فروری) ۱۶۲۷ء کو ۷۲ سال کی عمر میں دلّی میں انتقال ہوا۔ بستی نظام الدین، دلّی میں ایک خاص مقبرے میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں (مآثر الامرا، ۱:۶۹۳-۷۱۲؛ مآثرِ رحیمی، ۲:۱۰۳؛ مفتاح التواریخ: ۲۳۲)	۳۵	
ملّا عبدالباقی نہاوندی، عہدِ اکبری و جہانگیری کے مشہور مصنّف جنھوں نے عبدالرحیم خانخاناں کے حالات میں مآثرِ رحیمی لکھی۔ یہ کتاب ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں مکمل ہوئی تھی۔ شمس العلما مولانا ہدایت حسین کی تصحیح و تحشیہ کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے (۱۹۳۰-۱۹۳۱ء)۔	۳۶	۲۷
صمصام الدولہ شاہنواز خان جن کی کتاب مآثر الامرا مرتبہ مرزا اشرف علی و مولوی عبدالرحیم تین جلدوں میں کلکتے سے شائع ہوئی ہے (۱۸۸۸-۱۸۹۰ء)۔	۳۷	
مآثر الامرا، ۱:۱۰۷۔ 'است' اور 'ما' کے لفظ 'مآثر الامرا' سے اضافہ کیے گئے ہیں۔ 'شکست' کی جگہ متن میں 'حادثہ' تھا؛ یہ درستی بھی اصل کتاب پر مبنی ہے۔	۳۸	
یہ ابو فراس الحمدانی کا شعر ہے (دیوان ابی فراس: ۱۶۱)	۳۹	
یہ مصرع حکیم کاظمائے تونی کا ہے (خریطۂ جواہر: ۱۴۴)۔ پورا شعر ہے: ہر چند سیر کردم، جاے چو دل ندیدم با یک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جاست تذکرۂ شمع انجمن (ص ۴۰۰) کی روایت میں مصرعِ ثانی یوں ہے: با صد جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست	۴۰	

	۴۱	یہ سہوِ قلم ہوگا کیونکہ 'موڑ' مؤنث نہیں، بلکہ مذکر ہے۔
۲۸	۴۲	کلیاتِ عرفی : ۳۱۷۔ پہلے مصرع میں 'گشتن' کی جگہ 'رفتن' چاہیے۔
	۴۳	کلیات سودا، ۱ : ۲
	۴۴	شیخ ابوالفضل، شیخ مبارک کے بیٹے، اکبر کے دربار کے مایۂ ناز اور درخشندہ رتن' ۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء میں جہانگیر کے ایما پر قتل ہوئے (حالات کے لیے دیکھیے آئینِ اکبری : ۲۶۲-۲۶۸؛ توزکِ جہانگیری ۹-۱۰ (دیباچہ)؛ مفتاح التواریخ ۲۰۴-۲۰۶؛ دربارِ اکبری ۵۲۱-۵۸۴)
	۴۵	Tank : بکتر بند فوجی گاڑی۔
۲۹	۴۶	کلیاتِ بیدل، ۱ : ۶۷۷
	۴۷	دیوان غالب : ۲۳۴
	۴۸	شاد عظیم آبادی کا مصرع ہے، اس فرق کے ساتھ کہ دراصل 'یہیں' کی جگہ 'وہیں' ہے (کلامِ شاد : ۱۳۹) پورا شعر ہے : کمند پھینک کے جا قصرِ یار پر، اے شوق! وہیں ملینگے تجھے نالۂ بلند ترے اس کی دوسری روایت یہ ہے : کمند پھینک کے جا اس کے قصر پر، اے دل! چھپے ہوئے ہیں کہاں نالۂ بلند ترے (کلیات شاد، ۲ : ۲۱۳)
۳۰	۴۹	امیر مینائی کا مصرع ہے۔ (مرآۃ الغیب : ۲۰۱) شعر ہے : نہ کر اے یاس! یوں برباد میرے خانۂ دل کو اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں
	۵۰	دیوان غالب : ۲۳۸
	۵۱	پہلی اشاعت میں یہاں 'چائے دم دی' کی جگہ 'چائے بنائی' تھا۔

۳۱	۵۲	دیوان نظیری : ۳۰۷
	۵۳	کلیات یغمائے جندقی : ۱۷۴؛ مطبوعہ دیوان میں مصرعِ اولیٰ یوں ہے : چرا گویند در خُم خرقۂ صوفی فرو کردی
	۵۴	ایضاً۔ البتہ مصرع اولیٰ میں 'شیخ' کی جگہ 'شحنہ' چھپا ملتا ہے۔
	۵۵	ایضاً۔ یہ اسی غزل کے مطلع کا مصرع ہے؛ مصرع اولیٰ ہے : بہار ار بادہ در ساغر نمی کردم، چہ می کردم
۳۲	۵۶	غالب کا پورا شعر یوں ہے (دیوان ۰ ۵۶) : یہ جانتا ہوں کہ، تو اور پاسخِ مکتوب! مگر، ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

خط ۶

۳۳	۱	دیوان نظیری نیشاپوری : ۲۲۔ شعر ہے : خضر صد منزل بہ پیشم آمد و تشنا ختم باز می باید ز سرگرم رہِ بیہودہ را یعنی 'خواہم' کی جگہ 'باید' ہونا چاہیے۔
	۲	احکامِ عشرہ تورات کی کتاب استثنا (۵ : ۷ - ۲۱) میں بیان ہوئے ہیں۔ یومِ سبت کا حکم آیات ۱۲ - ۱۵ میں یوں آیا ہے : تو خداوند اپنے خدا کے حکم کے مطابق سبت کے دن کو یاد کرکے پاک ماننا۔ چھ دن تک تو محنت کرکے اپنا سارا کام کاج کرنا؛ لیکن ساتویں دن خداوند تیرے خدا کا سَبْت ہے، اس میں نہ تو کوئی کام کرے، نہ تیرا بیٹا، نہ تیری بیٹی ... الخ
۳۴	۳	دیوان حافظ : ۲۰۴۔ مطبوعہ نسخے میں 'ہمہ سال' کی بجائے 'ہمہ سالہ' ہے۔
	۴	دیوان نظیری : ۱۷۲
	۵	طبع اوّل = کوٹھڑی۔

حواشی

	۶	کلیات غالب (فارسی) : ۳۸۸
	۷	دیوان غالب (اردو) : ۲۳۵
۳۵	۸	دیوان غالب : ۱۱۹ - صحیح 'دوگز' کی جگہ 'سوگز' ہے
۳۶	۹	کلیلہ و دِمنہ عربی کی مشہور کتاب ہے ، جو دراصل 'پنچ تنتر' (سنسکرت) کا ترجمہ ہے۔ پہلے اس کا ترجمہ پہلوی میں ہوا اور اسی سے عربی ترجمہ عبداللہ ابن مقفع نے دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر عبداللہ منصور کے زمانے میں کیا۔ اس کتاب کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔
۳۷	۱۰	پہلے ایڈیشن میں یہاں مندرجہ ذیل حاشیہ تھا : "سائنس اب "ثابت شدہ حقیقت" اور "طبعیاتی جبریت" کی متاع سے بھی تہی دست ہو چکا ہے ، اور جس "حقیقت" کے سراغ میں نکلا تھا ، وہی یک قلم اس پر مشتبہ ہو گئی ہے ۔"
	۱۱	کلیات سودا : ۵۴
	۱۲	دیوان نظیری ۱۰۷ - مطبوعہ نسخے میں مصرعِ اول میں 'کوچہ' کی جگہ 'کوے' ہے ۔
	۱۳	بیدل کے مطلع کا مصرع ہے (کلیات ، ۱ : ۸۷۸) پورا شعر یوں ہے : تو کریم مطلق و من گدا ، چکنی جُز ایں کہ نخوانیم درِ دیگرم بنما کہ من بکجا روم ، چو براینم
۳۸	۱۴	یہ انگریزی شاعر لارڈ ٹینی سن کی 'ان میموریم' (In Memorium) کے پہلے بند کے دو مصرعے ہیں ، جو حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں پورا بند یوں ہے ۔ Strong son of God, Immortal Love Whom we, that have not seen thy Face By Faith, and Faith Alone, Embrace Believing, Where we cannot prove "In Memorium" (The Poems and Plays of Tennyson 23)

۳۹	۱۵	دیوان غالب : ۱۳۰
	۱۶	اس شعر کے قائل کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ثعالبی نے التمثیل والمحاضرہ (ص ۲۰۴) میں اسے نقل کیا ہے، اور کسی سے منسوب نہیں کیا۔ یہ الحماسۃ البصریہ (۲ : ۱۷۴) میں بھی ملتا ہے، وہاں بھی شاعر کا نام نہیں ہے۔
	۱۷	کلیات عرفی : ۲۷۷
۴۰	۱۸	کلیات فیضی : ۴۹۲۔ اس شعر کی ایک دوسری روایت میں مصرع ثانی میں 'زاہست' کی جگہ 'راہست' ملتا ہے؛ 'راہیست' بہتر ہے۔
	۱۹	دیوان وحشی بافقی : ۲۰۔ دیوان کا مطبوعہ شعر ہے : تا بغایت ما ہنر پنداشتیم عاشقی خود عیب و عالے بودہ است اس کے بعد (ص ۲۸) پر یہی غزل دوبارہ چھپی ملتی ہے، وہاں مصرع ثانی میں 'خود عیب' کی جگہ 'خود ننگ' ہے۔
	۲۰	نظیری کا مصرع ہے (دیوان نظیری : ۴۶) پہلا مصرع ہے : بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
۴۱	۲۱	نظیری نیشاپوری کا شعر ہے (دیوان : ۴۷) بعض جگہ مصرعِ اولیٰ یوں بھی دیکھا گیا ہے : بر چہرۂ حقیقتِ ما ماند پردۂ
	۲۲	فیضی : ۳۷۶۔ صحیح شعر یوں ہے : جلوۂ کاروانِ مانیست بناقہ و جرس شوقِ تو راہ می برد، دردِ تو زاد می دہد
۴۲	۲۳	غالباً عرفی کا شعر ہے (شعر العجم، ۲ : ۱۳۱) قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اگرچہ کلیات کے نسخۂ مطبوعۂ ایران میں اس زمین میں غزل موجود ہے، لیکن اس میں یہ شعر نہیں ملتا۔
۴۲	۲۴	میرزا خاضع، میرزا صائب کے شاگرد اور سید عبدالجلیل بلگرامی کے ہمنشین تھے، اُن کی

زبانی منقول ہے کہ ایک دن میں نے میرزا صائب کے سامنے یہ مصرع پڑھا:

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مُردن

مصرع بالکل مہمل تھا یعنی چند غیر متعلق چیزیں جمع کردی تھیں۔ میرزا نے اس پر دوسرا مصرع لگاکر عجیب فلسفیانہ مضمون پیدا کر دیا۔ (یدبیضا: ۱۰۶ (ب))

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

بقدر ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را

مولانا شبلی نے نقل میں مصرعوں کی جگہ بدل دی ہے (شعرالعجم، ۲: ۱۶۹)

۴۲	۲۵	اس مصرعے سے متعلق جہانگیر نے عجیب واقعہ لکھا ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک دن کسی نے کہا، سپہ سالار اتالیق خانخاناں نے اس مصرع

بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید

پر غزل کہی ہے اور بعض دوسرے شعراے دربار نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس پر فی البدیہہ یہ شعر میرے ذہن میں آیا:

ساغرے بر رُخِ گلزار می باید کشید

ابر بسیار است، مَے بسیار می باید کشید

پھر تو بہت لوگوں نے اس پر غزلیں کہہ کر گزرانیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مصرع مولانا جامی کا ہے ان کی پوری غزل ملاحظہ سے گذری، اس ایک مصرعے کے سوا جو زبان زدِ خاص و عام ہے، پوری غزل میں اور کوئی چیز کام کی نہ نکلی (توزکِ جہانگیری: ۲۲۲-۲۲۳)

لطیفہ یہ ہے کہ اب مطبوعہ دیوان میں نہ یہ مصرع ملا، نہ اس زمین میں غزل ملی۔

	۲۶	نشاط اصفہانی کا شعر ہے (ریاض العارفین: ۵۲۵) مطبوعہ شعر یوں ہے:

طالباں را خستگی در راہ نیست

عشق خود راہ ست و ہم خود منزل ست

۴۳	۲۷	شیخ علی حزیں کا شعر ہے (کلیات: ۶۰۳)۔ مطبوعہ کلیات میں پہلے مصرع میں 'ناصح' کی جگہ 'زاہد' ہے۔

حواشی

۴۳ | ۲۸ | مصرعِ ثانی میں سرمد غالباً غلط ہے؛ یہ سرمد کے کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں ہے۔
یہ رباعی متعدد جگھوں پر بیدل کے نام سے درج ہے۔ اور ٹھیک شاید یوں ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد
صوفی بجے شبانہ ربطے دارد
بیدل ہمہ را بحالِ خود می بینم
ہرکس بخیالِ خویش خبطے دارد

اگرچہ کلیاتِ بیدل میں بھی تلاش کرنے پر نہیں ملی۔

۲۹ | تیسرے ایڈیشن میں یہاں "کاربرداریوں" ملتا ہے اور پہلے میں "کاربرآریوں"؛ ٹھیک 'کاربرآریوں' ہی ہے اور یہی یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

۳۰ | کلّیات عرفی شیرازی: ۳۲ (اضافات) دیوان میں شعر یوں ہے:

نہ داغِ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کاود
بدہ، یارب! دلے کاین صورتِ بیجاں نمی خواہم

۳۱ | کلّیات بیدل، ۱: ۶۱۰

۴۴ | ۳۲ | مفتی صدرالدین خان آزردہ کا شعر ہے (خم خانۂ جاوید، ۱: ۵۹)

۳۳ | دیوان کلیم ۲۹۴۰۔ مطبوعہ دیوان میں پہلے مصرعے میں 'آویزش' کی جگہ 'آمیزش' ہے؛ اور دوسرا مصرع یوں ہے:

روز و شب با من و پیوستہ گریزاں از من

۳۴ | دیوان درد: ۵۳۔ مصرعِ ثانی ٹھیک یوں ہے:

جیسا رہے گا کب تئیں، اے خضر! مر کہیں

۴۵ | ۳۵ | دیوان نظری: ۱۷۹

۳۶ | کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان: ۳۲۶)
فرق صرف اتنا ہے کہ مطبوعہ نسخے میں مصرعِ ثانی میں "ازانیم" کی جگہ "بہ آنیم" ہے

۳۷ | کلیات غالب (فارسی) ۳۴۲۰

۴۵	۳۸	نظیری کا مصرع ہے، اس تفاوت کے ساتھ کہ 'لختے' کی جگہ 'حرفے' چاہیے۔ (دیوان نظیری: ۳۰۸) مصرعِ اوّل ہے: تحقیقِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود
۴۶	۳۹	دیوان نظیری: ۱۰

خط ۷

۴۷	۱	طالب آملی کا شعر ہے (دیوان: ۱۱۳۳)
	۲	دیوان حافظ: ۶۲
	۳	ایضاً: ۱۲۴
۴۸	۴	Warder = جیلخانے کا پہریدار
	۵	کلیات مومن، ۱: ۲۵۳
	۶	دیوان نظیری: ۱۴۵
	۷	طبعِ اول میں 'میٹھی نیند' کی جگہ 'خوابِ شیریں' تھا۔
	۸	شیخ سعدی کا شعر ہے (متن کامل دیوان سعدی شیرازی: ۳۹۲) دیوان میں یوں ملتا ہے: خلق را بیدار باید بود ز آبِ چشمِ من ویں عجب کاں وقت می گریم کہ کس بیدار نیست
۴۹	۹	ملا درکی قُمی کا مصرع ہے (خریطۂ جواہر: ۱۰۸)۔ مصرعِ اول ہے: زندہ در عالمِ تصویر ہمیں نقاش ست
	۱۰	دیوان حافظ: ۳۹
	۱۱	کلیاتِ عرفی: ۳۸۶
	۱۲	مولانا آزاد کے والد کا نام مولانا محمد خیرالدین تھا۔ ان کے جستہ جستہ حالات اسی کتاب میں اور کچھ "تذکرہ" میں بھی ملتے ہیں۔ ان کا بروز شنبہ ۱۷ رجب ۱۳۲۶ھ/۱۵ اگست ۱۹۰۸ء

حواشی

کو کلکتہ میں بعمر ۷۷ سال انتقال ہوا۔ دبدبۂ سکندری (۴۴ : ۲۹ : ۷) میں تاریخِ وفات
۱۷ اگست ۱۹۰۸ء چھپی تھی جو ٹھیک نہیں۔ یہ غلطی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ کلکتہ سے
غلط خبر آئی یا دیر سے موصول ہوئی۔ تاریخ وفات ہے:

قضا کرد اُف مولوی خیرِ دیں
فقیہِ زماں، اہلِ جوش و خروش
سنِ فوت چوں خواستم از خرد
بگفتا: "فضایل پناہ، اہلِ ہوش"
(۱۳۲۶ھ)

کلکتے ہی میں مانک تلا کے قبرستان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ (اذکار الابرار المشہور بہ تذکرۃ الاقطاب) پہلے ہر سال ۱۷ رجب کو ان کے مُرید عُرس کیا کرتے تھے؛ بوجوہ ۱۹۶۴ء کے بعد یہ نہیں ہو سکا۔ ان کی دو کتابیں "دُرج الدُرَر البہیۃ فی ایمان الآباء والاُمّہات المصطفویہ" (مطبع توفیقی، کلکتہ۔ ۱۳۱۲ھ) اور "الستۃ الضروریہ فی المعارف الخیوریہ" (مطبع معدن الرموز مسمیٰ بالکنز، کلکتہ) نظر سے گذریں۔ ان کی بعض اور کتابوں کے نام یہ ہیں:

اسباب السرور لاصحاب الخیور (مطبع ہادی، بمبئی، ۱۳۱۸ھ)۔ حفظ المتین عن لصوص الدین (دربارۂ اطلاق لفظ خدا بر غیرِ خدا و ردِّ شبہاتِ منکرین)، خیر الامصار مدینۃ الانصار (در فضیلتِ مدینہ منورہ)، الاوراد الخیوریہ سلالۃ الادعیہ الماثوریہ، لیکن یہ میری نظر سے نہیں گذریں۔

شعر بھی کہتے تھے۔ خیوریؔ تخلص تھا۔ (ان کے مفصّل حالات کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی : ۶۶ - ۱۷۷)

۱۳ سب اشاعتوں میں یہاں 'کی' چھپا ہے۔ یہ غالباً کاتب اول کی غلطی ہے، 'کا' کی جگہ 'کی' لکھ گیا۔ 'پہر' مذکر ہے۔ امیر مینائی کا شعر ہے (صنمخانۂ عشق : ۱۹۵)

ایک ایک گھڑی روزِ قیامت سے بڑی ہے
کس طرح کٹیں چار پہر ہجر کی شب کے

حواشی

۱۴ — مفتی صدرالدین خاںؒ دورِ آخر کی مشہور شخصیت ہیں۔ اصلاً کشمیری اور مولداً دہلوی تھے۔ ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے ("چراغ" تاریخ ہے)۔ شاہی میں بھی ممتاز تھے اور انگریزی عہد میں بھی معزّز رہے، صدرالصدوری کا عہدہ پایا۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت تھی۔ عہدِ شاہجہانی کا مدرسۂ 'دارالبقا' زندہ کیا تھا؛ اور طلبہ کو پڑھانے کے علاوہ اُن کے جملہ اخراجات کے بھی کفیل تھے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو بعارضۂ فالج انتقال ہوا۔ "چراغ دوجہاں" سے تاریخ نکلتی ہے۔ درگاہ شاہ چراغ دہلی میں دفن ہوئے تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند: ۹۳-۹۴)

۵۰

۱۵ — رکن المدرسین سے مولانا منورالدّین مراد ہیں۔ جو مولانا خیرالدین کے نانا تھے۔

۱۶ — حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے فرزندِ رشید ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ/ ۳۰ ستمبر ۱۷۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ توّے برس کی عمر تھی، جب شوال ۱۲۳۹ھ/ جون ۱۸۲۴ء میں رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ دلّی دروازے کے باہر مہندیان (قبرستان) میں آسودۂ خواب ہیں۔ آخری دَور کے مشہور عالم اور منبعِ رُشد و ہدایت تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔ (حالات عزیزی، تذکرۂ عزیزیہ)

۱۷ — یہاں 'پچھلی' کی جگہ 'پچھلے' ٹھیک ہوگا۔

۱۸ — دیوان حافظ: ۱۰۰

۵۱

۱۹ — کلیاتِ بیدل، ۱: ۸۴۔ دوسرے شعر میں دراصل 'خجستہ بُو' کی جگہ 'رمیدہ بُو' ہے۔

۲۰ — دیوان حافظ: ۲۴۵۔ مصرعِ اولیٰ ہے:

این کہ می گویند، آں بہتر ز حسن

۲۱ — مثلاً شمعِ انجمن: ۵۶؛ خزانۂ عامرہ: ۱۲۲؛ مآثرالامرا، ۳: ۷۷۵ وغیرہ

۵۲

۲۲ — Detention Camp (ڈیٹنشن کیمپ) وہ عارضی قید خانہ یا فوجی چھاؤنی جہاں لوگوں کو نظربند کر دیا جاتا ہے۔

۲۳ — مہری کی رباعی کا آخری مصرع ہے (آتشکدۂ آذر: ۳۶۰) پوری رباعی ہے:

حلِ ہر نکتہ کہ بر پیرِ خرد مشکل بود
آزمودیم، بیک جرعۂ مے حاصل بود
گفتم، از مدرسہ پُرسم سببِ حرمتِ مے
در ہر کس زدم، بیخود و لایعقل بود

چوتھے مصرعے میں اختلاف ظاہر ہے۔

۵۳ | ۲۴ | امیر الامرا شریف خان شیرازی کا شعر ہے (توزک جہانگیری: ۱۱۱)
جہانگیر لکھتا ہے کہ جب یہ شعر میرے سامنے پڑھا گیا، تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر آگیا:

از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نَفَس
یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابرست

اس پر دربار کے سب موزوں طبعوں نے ایک ایک شعر کہہ کے پیش کیا۔ ان میں ملاّ علی احمد مُہر کَن کا یہ شعر بھی تھا:

اے محتسب ز گریۂ پیرِ مغاں بترس
یک خم شکستنِ تو بصد خوں برابرست

۲۵ | Inspector General of Prisons یعنی حوالاتوں اور جیل خانوں کا داروغہ۔

۲۶ | سب اشاعتوں میں 'طیّار' (طا کے ساتھ) چھپا ہے؛ چونکہ مولانا مرحوم نے "تذکرہ" میں خود اس لفظ کو کاٹ کر 'تیار' کر دیا ہے، اس لیے یہاں بھی یہ تصحیح کر دی گئی ہے۔ پوری کتاب میں یہی صورت ہے۔

۲۷ | یادگار داغ: ۲۵۳

۲۸ | اگرچہ یہ شعر کلیات صائب مطبوعہ تہران میں نہیں ملتا لیکن ہے غالباً صائب ہی کا۔ (دیوان صائب: ۳۳۱)

۵۴ | ۲۹ | مرزا احسن اللہ مخاطب بہ ظفر خان احسن کا شعر ہے، اس فرق کے ساتھ کہ مصرع اولیٰ میں 'زہ تیغ' کی جگہ 'بہ تیغ' ہے، جو ٹھیک اور بہتر ہے (شمع انجمن: ۵۴؛ کلمات الشعرا: ۵)

۳۰ مفتی صدرالدین آزردہ کا شعر ہے۔ (آثار الصنادید : ۵۳۹)

۳۱ دیوان حافظ : ۱۲۰ - ۱۲۱

خط ۸

۵۵ | ۱ کلیاتِ بیدل، ۱ : ۵۲ مطبوعہ دیوان میں شعرِ دوم کے دوسرے مصرع میں 'زآتشے' کی جگہ 'باتشے' ملتا ہے۔

۲ دیوانِ غالب : ۲۲۲۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے مصرع میں "شکایت" ہونا چاہیے اور دوسرے میں "حکایت"۔

۳ شیخ ناصر علی سرہندی عہدِ شاہجہانی و عالمگیری کے مشہور قادر الکلام شاعر، سرہند میں پیدا ہوئے؛ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مختلف اوقات میں امرائے شاہی کے دامن سے وابستہ، اور اسی سلسلے میں الٰہ آباد، بیجاپور، کرناٹک وغیرہ میں مقیم رہے، آخری عمر میں دتّی میں رہنے لگے تھے۔ یہیں ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ/ ۲ اپریل ۱۶۹۷ء کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ سلطانجی میں دفن ہوئے تھے۔ (سروِ آزاد: ۱۲۹-۱۳۱)

۴ لیکن یہ شعر کلیات عرفی کے کسی نسخے میں نہیں ملتا۔ البتہ یہ روایت سرخوش نے اپنے تذکرے کلمات الشعرا (ص ۴۳) میں بیان کی ہے۔ خدا معلوم، کس کا شعر ہے! مولانا شبلی نے بھی اسے عرفی ہی سے منسوب کیا ہے (شعر العجم : ۳ : ۱۱۹)۔ غالباً انھوں نے بھی سرخوش پر اعتماد کر کے یہ لکھ دیا۔

۵۶ | ۵ کلیاتِ عرفی : ۲۸۴۔ ٹھیک شعر یوں ہے :

منکر نشوی گر بغلط دم زنم از عشق
ایں نشہ مرا گر نبود، بادگرے ہست

۶ I.M.S مخفف ہے Indian Medical Service: کا۔ ہندستان کی سب سے اعلیٰ طبّی ملازمت۔

۷ فرشتہ (۲ : ۲۲۳) میں چلیتہ خاں کا ذکر ملتا ہے (اگرچہ وہاں جیتا خاں چھپا ہے)

		معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواجہ سرا تھا اور اتنا صاحبِ رسوخ کہ چاند سلطانہ کے تمام فوجی مشوروں میں شریک رہتا تھا۔ وہاں یہ نہیں لکھا کہ یہ قلعہ دار تھا۔
	۸	متن میں سہوِ کتابت سے حضرات چھپا ملتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ٹھیک 'حضرت' ہی تھا۔
	۹	نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ رام پور کا مصرع ہے (کلیاتِ ناظم: ۸۸)۔ پورا شعر ہے: اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر نام اُن کا آسماں ٹھہرالیا تحریر میں
	۱۰	کلیاتِ سعدی: ۴۰۹۔ پورا شعر ہے: در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش ما ہیچ نگفتیم و حکایت بدر افتاد
	۱۱	میرزا عبدالقادر بیدل کا مصرع ہے (کلیاتِ بیدل، ۱: ۶۶۳) پورا شعر یوں ہے: نمی خواہد کسے خود را غبار آلودِ بیدردی اگر ما دردِ دل داریم، زاہد دردِ دیں دارد
۵۷	۱۲	یعنی "ہندُستان کے کسی مقام سے جب مسکن کو صیغۂ راز میں رکھنا مقصود ہو، تو سرکاری ڈاک (خاص طور پر فوجی) میں اس طرح لکھتے ہیں۔
	۱۳	کلیاتِ ناسخ (دیوان دوم): ۹
	۱۴	جنگ بوئر۔ ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) اور آرنج فری اسٹیٹ نے مل کر انگریزوں کے خلاف ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو جنگ کا اعلان کر دیا تھا؛ اس کا مقصد انگریزوں کے اقدام کو روکنا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنا تھا۔ اس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور ویرن کنگ کے صلحنامے پر جنگ کا خاتمہ ہوا (۳۱ مئی ۱۹۰۲ء)۔ (بوئر ان ولندیزوں (ہالینڈ کے باشندے) کو کہتے تھے جنھوں نے جنوبی افریقہ میں یہ نوآبادیاں قائم کی تھیں)
	۱۵	دیوان خاقانی: ۱۹۲، دیوان میں 'سبق' کی بجائے 'رقوم' ملتا ہے۔

حواشی

۵۸ | ۱۶ | دیوان ذوق (مرتبۂ آزاد) : ۵۲

۱۷ | دیوان غالب : ۱۷۷

۵۹ | ۱۸ | کلیات مومن، ۱ : ۱۶۵

۶۰ | ۱۹ | حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ : ۱۷۳)۔ مصرعِ اولیٰ ہے :

زہرہ سازی خوش نمی سازد، مگر عُودش بسوخت

۲۰ | غالب کا مصرع ہے (کلیات غالب : ۵۲۸) پہلا مصرع ہے :

چگویم از دل و جانے کہ در بساطِ منست

۲۱ | دیوان نظیری : ۸۲

۲۲ | بیدل کا مصرع ہے (کلیات، ۱ : ۹۴)۔ شعر ہے :

بہ بیسامانیم وقت است، اگر شورِ جنوں گرید
کہ دستے گر کنم پیدا، نمی یابم گریباں را

مولانا کے ہاں دوسرے مصرعے کا متن قدرے بدل گیا ہے۔

۲۳ | دیوان حافظ : ۱۱۰

۶۱ | ۲۴ | جامی کا مصرع ہے، صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ 'آخر آمد' کی جگہ دراصل 'آمد آخر' ہے۔ (دیوان جامی : ۳۰۳) پہلا مصرع ہے :

للہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر می خواست

۲۵ | غالب کا مصرع ہے؛ البتہ 'ہی' کی جگہ 'بھی' چاہیے۔ (دیوان غالب : ۴۵) پورا شعر ہے :

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

۲۶ | کلیات مومن، ۱ : ۲۷۔ یہاں خفیف سا لفظی اختلاف ہے۔ پورا شعر ہے :

ہمارے خوں بہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو
یہ بعدِ انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

حواشی

۶۲	۲۷	یہ حافظ کی سرِ دیوان غزل کا مصرعِ ثانی ہے، جس سے اس نے یزید بن معاویہ کے مصرع کی تضمین کی ہے۔ یزید کا شعر ہے : اَنَا المَسمُومُ وَمَا عِندِیْ بِتِریَاقٍ وَّلَارَاقٍ اَلَایَا اَیُّھَا السَّاقِی اَدِرکَاسًا وَّنَاوِلھَا
	۲۸	حضرت امیر خسرو کا مصرع ہے (شعر العجم، ۲ : ۱۵۲)۔ ٹھیک پورا شعر یوں ہے : خسرو است و شبِ افسانۂ یار و ہر بار قدرے می گرید و پس برسرِ افسانہ رود مصرع اولیٰ یوں بھی ملتا ہے : خسروست و شب وافسانۂ یار و ہر بار (خریطۂ جواہر : ۱۰۲)
	۲۹	کلیات مومن، ۱ : ۱۶۹۔ مصرعِ اولیٰ ہے : رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص عام
۶۳	۳۰	تفصیل کے لیے دیکھیے، خزانۂ عامرہ : ۳۳۶ - ۳۴۶
	۳۱	ایضاً : ۳۳۸
	۳۲	دیوان حافظ : ۱۱۷
	۳۳	پورا نام آرتھر شوپن ہور، ۲۲ فروری ۱۷۸۸ء کو ڈینزگ میں ایک تاجر کے گھر میں پیدا ہوئے مشہور فلسفی ہیں۔ وہ اپنے پیشرو کانٹ سے بہت متاثر ہوئے، لیکن اُنھوں نے اُن کی اندھا دھند پیروی نہیں کی، بلکہ ان کی تنقید بھی کی۔ کانٹ کے علاوہ افلاطون اور شیلنگ کا بھی ان پر اثر ہے۔ وہ انگریزی فلسفیوں، خاص طور پر لاک اور ہیوم کی عظمت کے بھی معترف تھے۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء کو جرمنی کے شہر فرنکفورٹ میں انتقال ہوا۔
	۳۴	دیوان حافظ : ۴۷
۶۴	۳۵	حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ : ۲۰۳) : پہلا مصرع ہے :

		اے دل! اندر بندِ زلفش از پریشانی منال
	۳۶	مصحفی کا مصرع ہے (جواہرِ سخن، ۲ : ۶۴۹) پورا شعر یوں ہے :
		سراغِ قافلۂ اشک لیجیے کیونکر
		نکل گیا ہے یہ کوسوں دیارِ حرماں سے
		اس سلسلے میں دیکھیے، حاشیہ (۱) خط (۲)
	۳۷	یہ مومن کی غزل کے مطلع کا مصرع ثانی ہے (کلیاتِ مومن، ۱ : ۷۹) مطلع ہے :
		پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ
		دل سے دیوانے کو مت چھیڑ، یہ زنجیر نہ کھینچ
	۳۸	دیوان غالب : ۲۶۴ ۔ اصلی شعر میں 'پہلے' اور 'پیچھے' کی آپس میں جگہ بدلی ہوئی ہے؛ اور 'امید' کی جگہ 'اوقات' ہے۔

خط ۹

۶۵	۱	کلیاتِ عرفی : ۲۹۵ ۔ ٹھیک 'اقلیم' کی جگہ 'جیحون' ہے۔
	۲	ایضاً : ۲۹۴
	۳	دیوان نظیری : ۳۲۰ ۔ اصل میں 'موجِ بحر' کی بجائے 'موجِ آب' ہے۔ دوسرے مصرع میں بھی 'چو گرداب' کی جگہ 'بگرداب' چاہیے۔
۶۶	۴	غالب کا مصرع ہے :(کلیات غالب : ۲۰۶)۔البتہ مطبوعہ دیوان میں "وقتست" کی بجائے 'خواہم کہ' ہے۔ پہلا مصرع ہے :
		آوارۂ غربت نتوں دید صنم را
	۵	دیوان نظیری : ۸۷
	۶	دیوان حافظ : ۶۹ - ۷۰
۶۷	۷	مولانا شبلی نعمانی کا مصرع ہے (کلیات : ۳۷) پورا شعر ہے :
		عقل را نیست سرِ عربدہ ایں جا بانقل پنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار افتاد است

حواشی

	۸	دیوان نظیری : ۱۹۷
	۹	دیوان حافظ : ۵۳
	۱۰	کاک ٹیل — مختلف قسم کی شرابوں کی آمیزش سے یہ مشروب تیار کیا جاتا ہے۔ بالعموم اسے بھوک کو تیز کرنے کے لیے کھانے سے پہلے پیتے ہیں۔
	۱۱	دیوانِ حافظ : ۱۸۰۔ دراصل مصرع اولیٰ یوں ہے : ازیں افیوں کہ ساقی در مے افگند بعض نسخوں میں 'ازیں' کی جگہ 'ازاں' بھی ملتا ہے۔
	۱۲	ورموتھ اور جِن دو مختلف قسم کی شرابیں ہیں، جو بالعموم کاک ٹیل تیار کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔
	۱۳	مثنوی رومی دفتر پنجم : ۱۹۶۔ دونوں مصرعوں میں 'آں' کی جگہ 'او' چاہیے۔
۶۸	۱۴	گلزار داغ : ۲۵۳۔ دراصل پہلے مصرع میں 'جو' کی جگہ 'تو' ہے۔
	۱۵	سورۃ الذّاریات ۵۱ : ۲۱۔ اس کے معنی ہیں : اور تم اپنے نفسوں کا محاسبہ کیوں نہیں کرتے ؟
	۱۶	استاد ذوق کا شعر ہے۔ (دیوان مرتبۂ آزاد : ۶۳)۔ مصرع ثانی میں 'پایا' کی جگہ 'دیکھا' چاہیے۔
	۱۷	طبع اول میں 'پر کھول دیگا' کی جگہ 'پروں کو کھول دیگا' تھا۔
	۱۸	بیدل کا شعر ہے (کلیات، ۱ : ۱۹۶۱) مطبوعہ نسخے میں مصرعِ ثانی میں 'جوشد' کی جگہ 'بالد' ہے۔
۶۹	۱۹	دیوان غالب : ۵۰
	۲۰	طبعِ اول : کوٹھری
۷۰	۲۱	دیوانِ نظیری : ۷۲
	۲۲	دیوان درد : ۹۶ ۔ اصلی متن میں 'جائے' کی جگہ 'جاوے' ہے، اور یہی درست ہے۔
	۲۳	یہ دولت خاں قاقشال سمرقندی کا شعر ہے (روزِ روشن : ۲۲۳) لیکن یہاں پہلے

مصرع میں 'پیرم' کی جگہ 'مردم' لکھا ہے، جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ ٹھیک 'پیرم' ہی ہوگا جیساکہ تذکرۂ منتخب اللطائف (قلمی) میں بھی ہے۔ (ورق ۸۸ ب)

۲۴ متن میں یہاں سہوِ کاتب سے 'دمیدش' لکھا ملتا ہے، صحیح 'دیدمش' ہے؛ طبع اول میں ٹھیک 'دیدمش' ہی تھا۔

۲۵ یہاں متن میں 'داں دراں' لکھا تھا، جو بداہتہً غلط ہے؛ یہی طبعِ اول میں بھی تھا۔ دیوان سے تصحیح کی گئی۔

۲۶ دیوان حافظ : ۱۳۶

۷۱ — ۲۷ دیوان حافظ : ۲۸۱

۲۸ Champagne فرانس کے اسی نام کے شہر (شامپین) کی بنی ہوئی شراب؛ عموماً سفید رنگ کی اور چمکدار ہوتی ہے۔

۲۹ Bordeaux (بوردو) فرانس کا ایک اور مشہور شہر جہاں کی ساختہ شراب بھی اسی نام سے مشہور ہوگئی ہے۔

۳۰ دیوان حافظ : ۲۷

۷۲ — ۳۱ ایضاً : ۲۸۵

۳۲ ایضاً : ۲۰۹۔ مولانا کا متن مطبوعہ نسخے سے کچھ مختلف ہے۔ مثلاً پہلا مصرع دراصل یوں ہے: شرابِ تلخ می خواہم کہ مرد افگن بود زورش۔ تیسرے مصرع میں 'جامِ مے' کی جگہ 'جامِ جم' ہونا چاہیے۔ چوتھے مصرع کے آخری الفاظ ہیں: 'نہ بہرام ست و نہ گورش'۔

۷۳ — ۳۳ دیوان نظیری : ۶۲، صحیح 'کُلبہ' کی جگہ 'خانہ' ہے۔

۳۴ دیوان حافظ : ۲۸۵

۳۵ ایضاً : ۱۲۸

۳۶ ایضاً : ۱۲۶۔ مصرعِ ثانی یوں ہونا چاہیے:
کہ دردِ سرکشی جانا، گرت مستی خمار آرد

صفحہ	حاشیہ	متن
۷۴	۳۷	آندرے ژید - پورا نام André Paul Guillaume Gide ؛ فرانسیسی زبان کا مشہور ناول نگار، ڈراما نویس، انشائیہ نویس، نقّاد —— ۲۱ نومبر ۱۸۶۹ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کی تمام تحریریں ۱۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہیں (۱۹۳۲-۱۹۳۹ء)۔ وہ پہلے کمیونسٹ تھا، لیکن ۱۹۳۶ء میں روس کی سیاحت سے واپس آکر اس نے اس طرزِ فکر کو ترک کر دیا، اور اُس کے بعد اپنی مشہور کتاب "روس سے مراجعت" تصنیف کی (۱۹۳۷ء)۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے اس کی کوئی خاص شہرت نہیں تھی، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا نے اُسے اپنے زمانے کے بلند پایہ مصنّفوں میں تسلیم کر لیا؛ اور یہ بھی درست ہے کہ اُس نے اپنے معاصرین کو بہت متاثر کیا۔ چونکہ وہ مذہباً پروٹسٹنٹ تھا، اور مزید برآں آزاد خیال بھی، اس لیے خود فرانس میں اس کی اتنی قدر دانی نہیں ہوئی، جتنی بیرونی دنیا میں۔ ۱۹۴۷ء میں اسے ادب کا عالمی نوبل انعام ملا تھا۔ ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو پیرس میں انتقال ہوا۔ اس کے بیشتر ناولوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ اس کی ڈائری کی تین جلدیں بھی انگریزی میں شائع ہو گئی ہیں۔ (۱۹۴۷-۱۹۴۹ء)
	۳۸	اس کا پہلا مصرع ہے: 'در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را'؛ حسابی نطنزی کا شعر ہے۔ (سفینۂ علی حزیں:) حزیں نے مصرع ثانی 'کازردہ دل آزردہ کند انجمنے را' لکھا ہے۔ بعض لوگوں نے اس شعر کو مخلص خاں مخلص سے منسوب کیا ہے (مثلاً بہترین اشعار: ۵۶۱)
	۳۹	کلیاتِ عرفی: ۲۱۳۔ مصرعِ اول میں 'باہم' کی جگہ 'دایم' چاہیے۔
۷۵	۴۰	قاآنی کے محمد شاہ کے قصیدۂ مدحیہ کا شعر ہے، (دیوان قاآنی: ۳۲۱)
	۴۱	نظامی گنجوی کا شعر ہے۔ دیکھیے شعرالعجم، ۱: ۳۰۴ مصرعِ اولیٰ میں 'جملہ بہ آفاق' کی جگہ 'جملۂ آفاق' چاہیے۔
۷۶	۴۲	کلیات صائب تبریزی: ۶۲۴۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کلیات میں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'راز ہائے مستاں' کی جگہ صحیح 'رازِ مے پرستاں' ملتا ہے۔

خط ۱۰

۷۷	۱	نظیری نیشاپوری کا شعر ہے (دیوان : ۱۵۰)۔ ٹھیک یوں ہے : ایں رسمہاے تازہ ز حرمانِ عہدِ ماست عنقا بروزگار کسے نامہ بر نشد ایک نسخے میں مصرعِ اولیٰ میں 'تازہ حرمان' بھی ملتا ہے۔
	۲	بیدل کا مصرع ہے (کلیات، ۱ : ۱۱) مصرعِ اولیٰ ہے : رمیدی از دیدہ بے تامل گذشتی آخر بصد تغافل مطبوعہ دیوان میں مصرعِ ثانی میں 'بود' کی جگہ 'داشت' ملتا ہے۔
	۳	کلیات بیدل، ۴ (نکاتِ بیدل) : ۸۱
	۴	یہ حاشیہ پہلی دونوں اشاعتوں میں نہیں تھا۔
۷۸	۵	یہ مصرع غالب کا ہے (دیوان غالب : ۴۵)۔ پورا شعر ہے : احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
	۶	بیدل کا شعر ہے (کلیات بیدل، ۱ : ۶۵۱)
	۷	پہلی دونوں اشاعتوں میں یہاں اس کے بعد ایک فقرہ ملتا ہے : "اس طرح کا ادھورا انقطاع فی الحقیقت انقطاع نہیں ہو سکتا، کیونکہ نہ تو باہر ..... الخ "۔ تیسری اشاعت میں یہ فقرہ حذف کر دیا گیا ہے۔
	۸	دیوان غالب : ۷۲۔ دراصل مصرع اولیٰ یوں ہے : قید میں ہے ترے وحشی کو، وہی زلف کی یاد
۷۹	۹	سورہ کہف ۱۸ : ۱۱۔ اس کے معنی ہیں : پس ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر کئی سال تک تھپکی دی۔
	۱۰	عمرو بن الحارث بن عمرو بن مضاض الاصغر کا شعر ہے (السیرۃ لابن ہشام، ۱ : ۱۸۲؛ معجم البلدان، ۵ : ۱۸۶؛ وفیات الاعیان، ۱ : ۳۰۱؛ المحاضرات للراغب، ۱ : ۱۴۷)

صفحہ	نمبر	حاشیہ
	۱۱	مومن کا مصرع ہے (کلیات مومن، ۱ : ۶۷)، پہلا مصرع ہے : سجدے پہ سر قلم ہو، دعا پر زباں کٹے
	۱۲	طبع اول میں یہاں 'ہوگیا ہو' تھا۔
	۱۳	ماثرالامرا، ۲ : ۶۴۴
۸۰	۱۴	دیوان غالب : ۱۱۹۔ جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہوا، مصرع ثانی میں 'دوگز' کی جگہ ٹھیک 'سوگز' ہے۔
	۱۵	سورۃ الحدید ۵۷ : ۱۳۔ اس کے معنی ہیں : اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور بیرونی طرف عذاب۔
	۱۶	کلیاتِ غالب : ۲۴۰ ۔
	۱۷	اسکوئر یعنی Square (میدان)۔ کلکتے کی مشہور سیرگاہ ہے۔
۸۱	۱۸	Bench، لکڑی کی بیٹھنے کی لمبی جگہ جس کے نیچے پایے ہوتے ہیں۔
	۱۹	فروغی بسطامی کا شعر ہے (دیوان : ۱۴۴) دیوان میں پہلے مصرعے میں 'بود' کی جگہ 'بودہ' اور دوسرے مصرعے میں 'حیف وصد حیف' ملتا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ شعر صائب سے بھی منسوب ہے۔ (دیوان صائب : ۵۷۲)
	۲۱	ضمیری اصفہانی کا شعر ہے (بہترین اشعار : ۳۱۲)۔ پہلا مصرع ہے : علاجِ دردِ ضمیری نہ شد، نمی دانم (متن میں دراصل 'مبادا' چھپا تھا جو صریحاً سہوِ کتابت تھا، اس لیے درست کیا گیا)
۸۲	۲۲	کلیاتِ عرفی : ۳۹۹
	۲۳	دیوانِ غالب : ۱۳۰
۸۳	۲۴	دیوان فیضی فیاضی : ۵۶۔ مطبوعہ نسخے میں 'کا نجا' کی جگہ 'کا ینجا' ہے (نیز دیکھیے، شعر العجم، ۳ : ۷۰)

حواشی

صفحہ	نمبر	حاشیہ
	۲۵	یہ فقرہ، "میرا معاملہ سیاسی زندگی . . . ساتھ ہوا تھا" پہلی دونوں اشاعتوں میں نہیں ملتا۔
	۲۶	کلیاتِ غالب : ۳۵۹
	۲۷	کلیات عرفی : ۲۹۷۔ مصرع ثانی میں 'کیں' کی جگہ 'ایں' چاہیے۔
۸۴	۲۸	طبع اول : کوٹھری۔
	۲۹	دیوان غالب : ۱۸۴
	۳۰	طبع اول میں یہ فقرہ یوں تھا: "نہ اسے کوئی حسن و خوبی کی بات سمجھتا ہوں"
	۳۱	دیوان نظیری : ۴۶۔ 'صافی' اور 'دردی' کی آپس میں جگہ بدل گئی ہے۔
	۳۲	کلیات بیدل، ۴ (عنصر سوم) : ۲۲۷
۸۵	۳۳	یہاں لغزشِ قلم ہے؛ غنیمت کی جگہ نام غنیؔ لکھا گیا ہے۔ کلمات الشعرا (ص ۸۲) میں یہ شعر غنیمت کنجاہی کے نام ہی سے درج ہے؛ دیوان غنیمت (ص ۹۱) میں بھی موجود ہے۔ مطبوعہ نسخے میں "چوں گردِ نمناکم نماند" ہے؛ اور دوسرے مصرعے میں "خلق می داند" ہے۔
	۳۴	دیوان غالب : ۵۹
	۳۵	کلیاتِ بیدل، ۱ : ۵۷۶۔ صحیح مصرع ثانی میں 'غبار' کی جگہ 'غرور' ہے۔ بمبئی کے مطبوعہ کلیات میں پہلے مصرع میں 'وصلش' کی جگہ 'وصلت' ہے۔
۸۶	۳۶	دیوانِ حافظ : ۳۱۸۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مطبوعہ نسخے میں 'خوش فرش' کی بجائے 'خوش وقت' ہے۔
	۳۷	کلیاتِ بیدل، ۱ : ۹۳
	۳۸	کلیاتِ غالب (فارسی) : ۳۴۰
	۳۹	دیوانِ غالب : ۲۲۶۔ صحیح مصرعِ اولیٰ میں "بے کاری جنوں کو" ہے۔
۸۷	۴۰	Mess (میس) : فوجیوں یا جہازیوں کے کھانے پینے کی جگہ۔ اب عمومی سکونت کا وہ مکان بھی مراد لیا جاتا ہے، جہاں کھانے کا بھی انتظام ہو۔

	۴۱	کلیاتِ مومن، ۱ : ۱۹۷ ۔ دیوان میں مصرعِ اول یوں چھپا ملتا ہے : ہے ایک خلق کا خوں سرپہ اشکِ خوں کے مرے
	۴۲	کلیاتِ بیدل، ۱ : ۴۶۶ ۔مطبوعہ کلیات میں مصرعِ ثانی یوں ہے : دستِ ہوس بدامنِ صحرا نمی رسد یقیناً 'ہوس' بہتر روایت ہے ۔
	۴۳	دیوانِ حافظ : ۱۹۹ ۔ مصرعِ اولیٰ ہے : ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
	۴۴	مآثرالامرا، ۲ : ۶۲۹ ؛ نیز روزِ روشن : ۳۴۵
۸۸	۴۵	دیکھیے توزکِ جہانگیری : ۱۱۲، جہاں یہ واقعہ بیان ہوا ہے ۔ (نیز دیکھیے، حاشیہ ۲۰، خط ۷)

خط ۱۱

	۱	دیوان حافظ : ۵۱ ۔ اصل میں دوسرے شعر کے مصرعِ اول میں 'راہِ عشق' تھا، جسے مرحوم نے موقع کی مناسبت سے 'راہِ دوست' میں تبدیل کر دیا۔
۹۰	۲	حکیم مسیح الزماں صدرا شیرازی کا شعر ہے (مآثرالامرا، ۱ : ۵۷۹)
	۳	آفتابِ عالمتاب شعرائے فارسی کا تذکرہ، قاضی محمد صادق خاں اختر کی تالیف تھا۔ افسوس کہ یہ تذکرہ ناپید ہوگیا اور باوجود تلاشِ بسیار کسی کتابخانے میں اس کا سراغ نہیں ملا ۔ بھوپال کے تذکرے اسی پر مبنیٰ ہیں ۔(اب ایک جگہ اس کی موجودگی کی خبر ملی ہے)
۹۱	۴	کلیاتِ عرفی : پہلا مصرع ہے : سبک ز جاش بگیری کہ بس گراں گہرست
	۵	ایضاً
	۶	حافظ شیرازی کا شعر ہے (دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی : ۴۹ اس شعر کی بیشتر روایت یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں 'کوے' اور 'سوے' کی جگہ 'راہ' ہے (مثلاً شعرالعجم، ۲ : ۲۸۳)
۹۲	۷	میر عبدالرحمٰن گرامی کا شعر ہے (روزِ روشن : ۵۸۴) مصرع ثانی میں 'کردم' ملتاہے

		اور یہی غزل کی ردیف ہے۔
	۸	فیضی کا شعر ہے (شعر العجم، ۳ : ۶۹؛ کلیات فیضی : ۲۴۸)
	۹	غالب کا شعر ہے، (کلیات غالب : ۳۵۸)
	۱۰	کلیاتِ عرفی : ۲۱۴۔ مطبوعہ نسخے میں 'رشتہ بانگشت' کی جگہ 'رشتۂ باریک'؛ اور مصرعِ اولیٰ یوں ہے: ایما و اشارت نہ باندازۂ راز ست ایک دوسرے نسخے میں شعر یوں ہے: (کلیات (اضافات) : ۹) بیدادگرا! رُوے تو اندازۂ راز ست ایں رشتہ بانگشت نپیچی کہ دراز ست
۹۴	۱۱	عدی بن زید کا مصرع ہے (جمھرۃ اشعار العرب : ۱۰۳) پورا شعر ہے: عن المرء لا تسئل وسَل عن قرینه فکل قرینِ بالمقارن یقتدی
	۱۲	دیوان حافظ : ۶۴۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'عجیب' اور 'غریب' کا محل باہم بدل گیا ہے۔
۹۷	۱۳	طبعِ اول میں 'کچھ نہیں' کی جگہ 'کچھ نہیں ہے' تھا۔
	۱۴	گلستاں کا مصرع ہے (کلیات سعدی : ۱۱۸)؛ مکمل قطعہ یوں ہے: اے بلبلِ بلند یا تنگ! در یا طن ہیچ — بے توشہ چہ تدبیر کنی وقت بسیچ روے طمع از خلق بپیچ، اگر مردی — تسبیحِ ہزار دانہ، بر دست مپیچ
	۱۵	سیّد جمال الدین اسد آبادی افغانی: پچھلی صدی کی دنیاے اسلام کی عجیب و غریب بلکہ بڑی پُراسرار شخصیت ہیں۔ کابل کے نواحی قصبے اسد آباد میں ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸۔ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل اور پھر ہندستان اور حجاز کے سفر کے بعد امیر دوست محمد خان والیِ افغانستان کی ملازمت میں داخل ہو گئے؛ لیکن امیر کی وفات کے بعد جانشینی کا قضیہ کھڑا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں انھیں وطن کو

خیر باد کہنا پڑا۔ اس پر وہ قسطنطنیہ چلے گئے، لیکن شیخ الاسلام کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں کے باعث انھیں یہاں سے بھی کوچ کرنا پڑا۔ وہ اسلامی ممالک کی اندرونی اصلاح اور "پان اسلام ازم" کے زبردست حامی، اور یورپی حکومتوں کی مسلسل سازشوں اور ان کے مشرقی ملکوں پر اقتدار قائم رکھنے کے شدید مخالف تھے۔ اسی مقصد سے انھوں نے جلا وطنی کے ایام میں پیرس سے اپنا مشہور عربی اخبار "عُرْوَۃ الوثقیٰ" نکالا، جس کے ایڈیٹر ان کے شاگردِ رشید اور رفیق کار محمد عبدہٗ مصری تھے۔ سب سے آخر میں وہ قسطنطنیہ میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔ یہاں وہ قصر یلدیز کے جوار میں نشانتاش میں پانچ برس مقیم رہے۔ یہیں ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو بعارضۂ سرطان انتقال ہوا اور نشانتاش میں دفن ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں نعش کابل لائی گئی اور ۶ جنوری ۱۹۴۵ء کو اس مقبرے میں دفن ہوئے، جو اب کابل یونیورسٹی کے احاطے میں ان کی خوابگاہِ ابدی ہے۔

۹۸	۱۶	شیخ محمد عبدہٗ۔ مصر کے مشہور مفکّر اور مذہبی اور سیاسی رہنما، ۱۸۴۲ء/ ۱۲۵۸ھ میں قریۂ محلّہ نصر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور طنطا کے مذہبی مدرسے میں پائی اور اس کے بعد الازہر (قاہرہ) میں داخلہ لے لیا، جہاں سے درجۂ عالمیت کی سند حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی سید جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی جن سے نقطۂ نظر اور طریقۂ کار کے جُزوی اختلاف کے باوجود ان کے تعلقات آخر تک بہت دوستانہ رہے۔ بالآخر انھیں سیاسی سرگرمیوں کے باعث جلا وطن ہونا پڑا؛ لیکن واپس آئے، تو اول شرعی عدالت کے جج اور آخر میں مفتیِ دیارِ مصریہ مقرر ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں اپنے انتقال تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ ان کی ساری عمر دین کی اصلاح اور اُسے خرافات سے صاف کرنے میں گذری۔ مرنے کے قریب انھوں نے دو شعر کہے تھے، جو اُن کے اسی رجحان کے شاہدِ عادل ہیں۔ فرمایا:

وَلَسْتُ اُبَالِی اَنْ یُّقَالَ مُحَمَّدٌ — اَبَلَّ اَوِ اکْتَظَّتْ عَلَیْہِ الْمَآتِمُ

وَلٰکِنْ دِیْنًا اَرَدْتُ صَلَاحَہٗ — اَخَافُ اَنْ تَقْضِیَ عَلَیْہِ الْعَمَائِمُ

		(مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی کہے، محمد (عبدہ) بیماری سے صحتیاب ہوگیا یا اس کے جنازے پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ لیکن ایک دین (اسلام)، البتہ ضرور ایسی چیز ہے جس کی بہتری میرے پیشِ نظر رہی ہے اور جس سے متعلق مجھے اندیشہ تھا کہ مبادا یہ بڑے بڑے عمامے (یعنی مُلّا) اسے برباد کردیں) چند رسائل بھی لکھے تھے جن میں زیادہ مشہور 'رسالۃ التوحید' ہے۔ ایک کتاب میں اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کیا ہے۔ تفسیر قرآن بھی لکھنا شروع کی تھی، جو پوری نہ ہوسکی؛ اِس کی تکمیل ان کے شاگرد شیخ محمد رشید رضا (صاحب المنار) نے کی۔
	۱۷	اس سے ابو نصر غلام یٰسین آہ مراد ہیں۔ یہ مولانا سے دو برس بڑے تھے؛ سالِ ولادت ۱۸۸۶ء ہے۔ عین عالم شباب میں وسط ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ء میں انتقال ہوا۔ کلکتے میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہیں۔ ان کی وفات پر سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے ایک شذرہ اپنے رسالے عالمگیر کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا۔ ان کے مزید حالات کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ۱۷۸ - ۱۸۵؛ ماہی تحریر (دلی)، ۲:۲ (اپریل/جون ۱۹۶۸ء)
	۱۸	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۴ شوال ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء ــــــ ۱۷۶۲ء/۱۱۷۶ھ) دورِ آخر کے فاضلِ اجل، صاحبِ اجتہاد و تجدید، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی سی جامعیت کے بہت کم عالم پیدا ہوئے ہیں۔ دلی دروازے کے باہر قبرستان مہندیان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔
۹۹	۱۹	اصلی متن میں یونہی چھپا ہے، لیکن ایما مذکر ہے۔ ذوق دہلوی کا شعر ہے (دیوانِ ذوق مرتبۂ آزاد : ۲۰۴) : واں ہلے ابرو، یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ بات کا ایما بھی پانا، کوئی ہم سے سیکھ جائے
۱۰۰	۲۰	دیوان کلیم کاشانی : ۲۶۸

حواشی

۱۰۱ | ۲۱ | راقم مشہدی کا شعر ہے (شعر العجم، ۵ : ۲۰۲)
شعر العجم میں 'از آنکہ' کی جگہ 'زبسکہ' ملتا ہے۔

| ۲۲ | امیر خسرو کا مصرع ہے (شعر العجم، ۲ : ۱۵۴) پہلا مصرع ہے :
جاں ز تن بُردی و در جانی ہنوز

| ۲۳ | دیوانِ حافظ : ۱۰۹

۱۰۲ | ۲۴ | یہ شعر ابن قیم کی کتاب 'اغاثة اللهفان من مصاید الشیطان' (۱ : ۹۲) میں ملتا ہے اور یہیں غالبًا اسے دیکھا ہوگا؛ یہ ابن قیم کی دوسری کتاب 'الداء والدواء' (ص ۲۲۵) میں بھی ہے۔

| ۲۵ | اوحدی اصفہانی صاحبِ "جام جم" کا شعر ہے (شعر العجم : ۵ : ۱۱۶)

| ۲۶ | طبعِ اول میں یہاں 'حلقۂ صحبت کے اثرات' تھا۔

| ۲۷ | غالبًا حافظ شیرازی کا شعر ہے۔ پہلے مصرعے کی مختلف روایات ہیں مثلاً
کارِ زلفِ تست مشک افشانیِ عالم، ولے
یا
کارِ زلفِ تست مشک افشانی، امّا حالیا
ایک قلمی نسخے میں ہے : کارِ زلفِ تست عیّاری و مشک افشاندنی؛ مصرعِ ثانی میں البتہ 'آہوے چیں' کی جگہ 'نافۂ چیں' ہے (نسخہ ہاے مملوکہ نواب رحمت اللہ خاں شیروانی)۔ لیکن دیوان کے ایرانی نسخوں میں یہ شعر نہیں ملا، بلکہ اس زمین میں سرے سے کوئی غزل ہی موجود نہیں ہے۔

۱۰۳ | ۲۸ | دیوانِ نظیری : ۵۰۲۔ مطبوعہ دیوان میں شعرِ ثانی کا مصرعِ اولیٰ یوں ہے :
عجب ار نبودہ باشد خضرے بجست وجویم

| ۲۹ | ایضاً : ۲۹۳

| ۳۰ | دیوانِ حافظ : ۱۹۰

| ۳۱ | کلیاتِ میر (دیوانِ اول) : ۸۰۲۔ صحیح مصرعِ ثانی میں 'تو' کی جگہ 'ہی' ہے۔

۱۰۴	۳۲	کلیاتِ بیدل، ۱ : ۹۳
	۳۳	دیوان کلیم : ۱۲۳ - بعض نسخوں میں پہلے مصرعے میں 'طبع' کی جگہ 'وضع' بھی ملتا ہے۔
	۳۴	کلیاتِ غالب (فارسی) : ۴۹۴ - یہاں کچھ لفظی تفاوت ہے؛ پورا شعر ہے : پشت بر کوہست طاقت تکیہ تا بر رحمتست کار دشوارست و ما بر خویش آساں کردہ ایم
	۳۵	کلیاتِ عرفی : ۲۳۳ - مصرع اولیٰ میں 'گر' کی بجائے 'چوں' چاہیے۔
۱۰۵	۳۶	دیوانِ غالب : ۲۵۷ - مصرع اول ہے : صبح آیا جانبِ مشرق نظر
	۳۷	متن میں یہاں عید الضحیٰ چھپا ہے جو غلط ہے؛ عید ضحیٰ ہو یا عید الاضحیہ - طبع اول میں ٹھیک عید اضحیٰ ہی ہے۔
	۳۸	صحاح میں اس موضوع سے متعلق متعدد حدیثیں ہیں - مثلاً حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عید الفطر کے دن جب تک چند کھجوریں نہ کھا لیتے، اس وقت تک نماز کے لیے عید گاہ تشریف نہیں لے جاتے تھے - حضرت انس رضؓ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ کھجوروں کی تعداد طاق ہوا کرتی تھی، یعنی تین، پانچ، سات وغیرہ - صحیح بخاری کے الفاظ ہیں : حدثنا انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یغدو یوم الفطر حتی یاکل تمرات ویاکلهن وترًا (صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، ۴ : ۱)- عید الاضحیہ کے دن دستور اس کے برعکس تھا - براء بن عازب سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے عید اضحیٰ کے دن نماز کے بعد خطبے میں فرمایا کہ جس نے نماز سے پہلے قربانی کی، اس نے گویا قربانی کی ہی نہیں - مَنْ نَسَكَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَاِنَّهٗ قبل الصّلٰوہ ولا نُسُكَ لَهٗ (صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، ۵ : ۲)
	۳۹	یہ غالب کے ایک قصیدے (بستمین قصیدہ) در مدحِ بہادر شاہ ظفر کے دونوں شعر ہیں - پہلا مطلع ہی ہے (کلیات : ۲۳۲)، دوسرا درمیان سے لیا گیا ہے (ص ۲۳۳) - دوسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں غبارِ خاطر کی تمام اشاعتوں میں 'رواگیر' چھپا ہے؛ لیکن دیوان میں

		'دواگیر' ملتا ہے، 'رواگیر' بہتر قرأت ہے؛ اور عین ممکن ہے کہ دیوان میں سہوِ کتابت ہو۔

خط ۱۲

۱۰۶	۱	فیضی کا شعر ہے (شعرالعجم، ۳: ۶۶)
	۲	عرفی شیرازی کا مصرع ہے (کلیات: ۲۹۵) اصل میں 'اینکہ' کی جگہ 'آنچہ' ہے۔ پہلا مصرع ہے: بادہ خواہی، باش، تاازخُم بروں آرم کہ من
۱۰۷	۳	داستان نل و دمن: ۴۲
	۴	مولانا شبلی نعمانی کا مصرع ہے (کلیات شبلی: ۵۳)۔ مصرع اولیٰ ہے: بادہ فرستم بحریفاں دگر
	۵	بابا فغانی شیرازی کا شعر ہے (دیوان فغانی: ۴۳)
۱۰۸	۶	= اگر پردہ اٹھ جائے، جب بھی میرا یقین اس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ یہ قول حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے (دیکھیے شرح نہج البلاغہ: ۳۲: نیز حلیۃ الاولیا، ۱: ۷۲)
۱۰۹	۷	متن میں 'ہوئی' بہ مقام 'ہوگی' کا ہے؛ یہی طبع اول میں تھا۔
	۸	کلیم کا مصرع ہے (دیوان کلیم: ۱۱۹)؛ پورا شعر ہے: ماز آغاز و ز انجامِ جہاں بیخبریم اول و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتادست
	۹	دیوان حافظ ۹۷۰
	۱۰	رباعیاتِ عمر خیام: ۱۲۱
۱۱۰	۱۱	متن میں صرف 'کھڑے ہوتے'، لیکن سیاق یہاں 'ہیں' کے اضافے کا مقتضی ہے؛ پہلے ایڈیشن میں 'ہیں' موجود بھی ہے۔ یہ تیسرے ایڈیشن کے کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔

| ۱۲ | دیوان نظیری نیشاپوری : ۳۶۸
| ۱۳ | آئن سٹائن ؛ پورا نام البرٹ آئن سٹائن۔ ۱۸۷۹ء میں جرمنی کے شہر اُلم کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ پندرہ برس کے تھے جب ان کا خاندان نقلِ مکان کر کے اٹلی چلا گیا۔ آئن سٹائن کی تعلیم سوئیٹزرلینڈ میں ہوئی اور اس کی تکمیل کے بعد وہیں ملازم ہو گئے اور اُسی ملک کی قومیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیاں جاری رکھیں اور متعدد تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھیں۔ مشہور 'نظریۂ اضافیت' انھیں کی دریافت ہے جس پر انھیں ۱۹۲۱ء میں فزکس کا عالمی نوبل انعام ملا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں وہ امریکہ چلے گئے اور وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو پرنسٹن میں انتقال ہوا۔

| ۱۴ | شرلاک ہومز۔ انگلستان کے مشہور مصنّف سر آرتھر کانن ڈایل (ف جولائی ۱۹۳۰ء) نے اپنی جاسوسی کہانیوں میں ایک فرضی کردار شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) پیدا کیا ہے جو جرائم کی تحقیق و تفتیش میں حیرتناک ذہانت و استدلال کا مظاہرہ کرتا ہے۔

| ۱۵ | ڈی مقراطیس، یونان کے شہر 'ابڈیرا' کے رہنے والے، غالباً یونان کے سب سے بڑے طبیعیاتی فلسفی ہوئے ہیں۔ انھوں نے حصولِ علم کی خاطر یورپ، ایشیا، افریقہ میں طویل سفر کیے۔ ان کے ملک نے بھی ان کی پوری قدر کی —— جابجا ان کے بُت کھڑے کیے اور ان کی خدمت میں ایک گراں قدر تھیلی پیش کی گئی؛ نیز قانون منظور کیا گیا کہ ان کے جنازے کے تمام مصارف حکومت کی طرف سے ادا کیے جائینگے۔ ایٹم (سالمہ) انہی نے دریافت کیا تھا اور کہا کہ یہ فنا نہیں کیا جا سکتا۔ کہکشاں کی ہیئت بھی اِنہی نے معلوم کی تھی۔ ۱۰۹ سال کی عمر میں ۳۶۱ قبل مسیح فوت ہوئے۔

۱۱۱ | ۱۶ | دیوان کلیم : ۲۹۴۔ صحیح 'آویزش' کی جگہ 'آمیزش'، 'دمبدم' کی جگہ 'روز و شب'، اور 'ہر لحظہ' کی جگہ 'پیوستہ' ہے۔ حکیم مومن خاں مومن دہلوی نے اس غزل کی تضمین کی ہے (کلیاتِ مومن، ۱، ۳۳۲ - ۳۳۳)

حواشی

۱۷ — جوڈ (Cyril Edwin Mitchinson Joad) ۱۲ اگست ۱۸۹۱ء کو لندن میں پیدا ہوئے، تعلیم آکسفرڈ میں پائی۔ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک سرکاری ملازمت میں رہے، لیکن پھر مستعفی ہو کر لندن یونیورسٹی میں فلسفے اور نفسیات کے استاد ہو گئے منعدد کتابیں لکھیں، اپنی سوانحعمری 'پانچویں پسلی کے نیچے' Under the Fifth Rib کے نام سے ۱۹۳۲ء میں شائع کی، اسے وہ 'جارحانہ سوانحعمری' کہا کرتے تھے۔ بعد کو (تورات کی کتابوں کی تقلید میں) اس کا نام بدل کر Book of Joad یعنی "کتاب جوڈ" رکھ دیا تھا۔ ۹ اپریل ۱۹۵۳ء کو لندن میں انتقال ہوا۔

۱۸ — برٹرنڈ رسل۔ پورا نام برٹرنڈ آرتھر ولیم رسل (Bertrand Arthur William Russell) خاندانی امیر، ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ مشہور فلسفی اور ریاضی داں تھے، اور ان علوم میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جنگ کے مخالف (یعنی امن پسند) کی حیثیت سے عالمگیر شہرت رکھتے تھے؛ اس کی پاداش میں قید و بند کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں انھیں ادب کا عالمی نوبل انعام ملا تھا۔ ۲/۳ فروری ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب میں (تقریباً ساڑھے بارہ بجے) اپنے آبائی مکان پنری دودرت (ویلز۔ انگلستان) میں انتقال ہوا۔ دنیا کے مسلّمہ فلسفیوں میں ان کا مقام ہے۔

۱۱۲ / ۱۹ — پہلی اشاعتوں میں 'حل ملتا نہیں' کی جگہ 'حل نہیں ملتا' تھا۔

۲۰ — عرفی کا شعر ہے (کلیات، اضافات: ۱۶)۔ مطبوعہ نسخے میں 'چنداں کہ' کی جگہ 'ہر چند' ملتا ہے۔

۱۱۴ / ۲۱ — عرفی کا مصرع ہے (کلیات ۳۱۱۰)؛ پورا شعر ہے:

حدِ حُسنِ تو نادراک نشاید دانست
این سخن نیز باندازۂ ادراکِ منست

۱۱۵ / ۲۲ — کلیاتِ عرفی: ۲۸۹

۱۱۶ / ۲۳ — دیوانِ حافظ ۳۷

حواشی

	۲۴	پہلی اشاعتوں میں 'نہیں ہوئی' کی جگہ 'نہیں ہوسکتی' تھا۔
۱۱۷	۲۵	پہلی اشاعتوں میں 'چال چلا نہیں سکتا' کی جگہ 'چال نہیں چلا سکتا' تھا۔
	۲۶	'رگ وید' ہندو دھرم کی بنیادی الہامی کتاب؛ یہ دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔
۱۱۸	۲۷	حِتّی ۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے کی ایک قوم جو تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۱۲۰۰ ق۔م تک ایشیائے کوچک اور شام کے علاقے پر حکمران تھی۔ جرمنی کے مشہور ماہرِ اسیریات ہیوگو ونکلر نے ۱۹۰۶۔ ۱۹۰۷ء میں اور پھر ۱۹۱۱۔ ۱۹۱۲ء میں ترکیا کے شہر بوغاز کوئی میں جو اثری کھدائی کی ہے، اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ یہ شہر حتّی قوم (اور سلطنت) کا صدر مقام تھا۔ بوغاز کوئی، انقرہ سے ۱۴۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مدّتوں حتّیوں کی مصریوں اور اسیریوں اور بابلیوں کے ساتھ جنگ رہی، ان کا ذکر تورات میں متعدّد مقامات پر آیا ہے۔
	۲۸	عیلامی ۔ تورات میں عیلام، ایران کے اس صوبے کا نام تھا، جو بعد کو اپنے دارالخلافے صوصہ کی وجہ سے صوصیانہ کہلایا۔ صوصہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ مدتوں بابل اور صوصہ کی باہمی آویزش رہی اور دونوں ایک دوسرے پر تسلّط حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بابلِ قدیم کے مشہور بادشاہ حموربی کے قوانین کا متن صوصہ ہی کی اثری کھدائی میں دستیاب ہوا تھا۔
	۲۹	کالڈیا (Chaldea) بابل قدیم کا نام ہے، چنانچہ تورات میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، وہاں اس سے مراد بابل ہی ہے۔ شروع میں یہ جنوبی میسوپوٹیمیا (عراق) میں دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے کا نام تھا؛ بعد کو وسیع ہوکر عراق کے اکثر حصّے پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ اس کا دارالخلافہ اُوّر تھا، جہاں کے حضرت ابراہیم علیہ السّلام تھے (اُوّر کے اصلی معنی شہر کے ہیں)
	۳۰	کلیاتِ صائب : ۷۵۰
	۳۱	ابوالفضل اکبری عہد کے مشہور عالم اور اکبر کے مصاحب و وزیر، ۶ محرّم ۹۵۸ھ/

		۱۴ جنوری ۱۵۵۱ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کی سیاست میں بہت دخیل رہے۔ اکبر نے جو 'دینِ الٰہی' رائج کرنے کی کوشش کی تھی، اس میں بھی ان کا بہت ہاتھ تھا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) ان سے ناراض رہتا تھا، اُس نے انھیں دکن سے ایک مہم سے واپس آتے ہوئے رستے میں قتل کروادیا۔ یہ ۴ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ / ۱۲ اگست ۱۶۰۲ء کا واقعہ ہے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب اکبرنامہ (مع آئینِ اکبری) ہے؛ اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں۔ (آئینِ اکبری : ۲۴۳-۲۶۵؛ طبقاتِ اکبری : ۲ : ۴۵۸؛ توزکِ جہانگیری : ۱۰-۱۱؛ دربارِ اکبری : ۵۲۱-۵۸۴)
	۳۲	یہ دونوں شعر خیالی بخاری (شاگرد ملّا عصمت اللہ بخاری) کے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر تذکرہ شمع انجمن (ص ۱۱۸) میں ملتا ہے، لیکن وہاں شاعر کا تخلص غلطی سے خیالی کی جگہ حیاتی لکھا گیا ہے۔ سفینۂ علی حزیں (ص ۶۶) میں بھی تخلص حیاتی دیا ہے۔ صحیح خیالی ہی ہے، جیساکہ روزِ روشن (ص ۲۰۷) میں نشاندہی کی گئی ہے۔

خط ۱۳

۱۱۹	۱	پہلی اشاعتوں میں شخصی تصور کی جگہ 'مشخّص تصور' ملتا ہے۔
۱۲۰	۲	دیوان نظیری : ۴۷۔ مصرع اولیٰ یوں بھی ملتا ہے : بر چہرۂ حقیقتِ ما مانَد پردۂ
	۳	دیوان بابا فغانی شیرازی : ۱۱۰
۱۲۱	۴	استاد ذوق کا شعر ہے (دیوانِ ذوق (مرتبۂ آزاد) : ۲۴۸) مطبوعہ نسخے کا متن یوں ہے : کرے کعبہ میں کیا، جو سرِ بتخانہ سے آگاہ ہے یہاں تو کوئی صورت بھی، وہاں اللہ ہی اللہ ہے
	۵	طبع اول میں اس لفظ کا املا 'چھیتی' کی جگہ 'چاہیتی' تھا۔
	۶	قرآن، سورۃ النساء، ۴: ۴۸ نیز ۱۱۶۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو نہیں بخشنا کہ کوئی اس کا

		شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ، جو چاہتا ہے، بخش دیتا ہے۔
	۷	احکامِ عشرہ کے لیے دیکھیے، تورات، کتاب استثنا، باب ۵، آیات ۷ تا ۲۱۔ یہاں آیت ۸ کی طرف اشارہ کیا ہے۔
۱۲۲	۸	خیام کی رباعی کا شعر ہے (رباعیات: ۱۳۴)؛ پوری رباعی ہے: ناکردہ گناہ در جہاں کیست، بگو وانکس کہ گنہ نکرد، چوں زیست، بگو من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرقِ میانِ من و تو چیست، بگو
	۹	سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۱۱۔ یعنی اس کی طرح کا سا کوئی نہیں ہے۔
	۱۰	سورۃ النحل ۱۶: ۷۴۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر مثالیں چسپاں نہ کرو۔
	۱۱	سورۃ الانعام ۶: ۱۰۳۔ یعنی اُسے (خدا کو) آنکھیں نہیں پا سکتیں، نہیں دیکھ سکتیں۔
	۱۲	سورۃ الاعراف ۷: ۱۴۳۔ یعنی (خداوند تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا) تو مجھے ہرگز نہیں دیکھیگا، لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ۔
	۱۳	کلیات عرفی: ۲۸۴۔ مطبوعہ نسخے میں 'اشارت' کی جگہ 'کنایت' ہے۔
	۱۴	سورۃ الاعراف ۷: ۱۸۰۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں؛ اُسے انھیں سے پکارو۔
	۱۵	سورۃ المائدۃ ۵: ۶۴۔ یعنی اُس کے دونوں ہاتھ کھُلے ہوئے ہیں۔
	۱۶	سورۃ الفتح ۴۸: ۱۰۔ یعنی اُن کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔
	۱۷	سورۃ الانفال ۸: ۱۷۔ یعنی جب تم نے (مٹھی بھر کنکریاں) پھینکیں، تو یہ تم نے نہیں پھینکی تھیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔
	۱۸	سورۃ طٰہٰ ۲۰: ۵۔ یعنی وہ بیحد مہربان خدا عرش پر قائم ہوا۔
	۱۹	سورۃ الفجر ۸۹: ۱۴۔ یعنی یقیناً تیرا رب گھات میں لگا ہے۔

حواشی

	۲۰	سورۃ الرحمٰن ۵۵ : ۲۹ ۔یعنی ہر روز اس کی ایک شان ہے۔
	۲۱	دیوان غالب : ۹۱ ۔ صحیح مصرع اول میں 'حق میں' کی جگہ 'حق کی' ہے
۱۲۳	۲۲	کلیات عرفی : ۲۲۱ ۔یہاں متن شعر العجم (۳ : ۱۲۰) کے مطابق ہے۔ کلیات میں ہے : آہ ازیں حوصلۂ تنگ و ازآں حُسنِ بلند کہ دلم را طلبِ شربتِ دیدارِ تو نیست
	۲۳	سورۃ الفجر ۸۹ : ۱۴
	۲۴	سورۃ البقرہ ۲ : ۱۸۶
	۲۵	اوحدی اصفہانی کا شعر ہے (شعرالعجم ، ۵ : ۱۱۶)
۱۲۴	۲۶	یہ موضوع حدیثوں میں سے ہے۔ ملاّ علی قاری لکھتے ہیں : لیس عن کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا یعرف لہ سند صحیح ولا ضعیف، لکن معناہ صحیح مستفاد من قولہ تعالیٰ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ای لیعرفون کما فسرہ ابن عباس (موضوعات کبیر : ۶۴) یعنی یہ قول حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے ۔ اس کی کوئی سند معلوم نہیں، نہ صحیح ، نہ ضعیف ۔ لیکن یہ قول معنوں کے لحاظ سے ٹھیک ہے اور مبنی ہے اس آیت پر وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ یہاں لِیَعْبُدُوْنِ کے معنی لِیَعْرِفُوْنِ ہیں، جیسا کہ حضرت ابنِ عباس کی تفسیر میں وارد ہوا ہے ۔
	۲۷	بیدل کا شعر ہے (کلیات بیدل ۱ : ۳۸۸)
	۲۸	اگرچہ یہ مضمون تفسیرِ سورۂ فاتحہ میں جستہ جستہ اور جگہ بھی آیا ہے لیکن مسلسل ترجمان القرآن جلد اول (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن) کے ص ۲۱۲ - ۲۶۲ میں دیکھا جا سکتا ہے۔
	۲۹	سورۃ النحل ۱۶ : ۷۴ (ترجمان القرآن ۴ : ۱۹۷ - ۲۰۵)
	۳۰	دیوانِ حافظ : ۲۶۶

۱۲۷	۳۱	نظیری کا مصرع ہے (دیوانِ نظیری نیشاپوری : ۶۶)۔ مصرعِ اولیٰ ہے: پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
۱۲۸	۳۲	= جس نے چکھا نہیں، اسے کیا معلوم!
	۳۳	ظہوری ترشیزی کا شعر ہے (دیوانِ نورالدین ظہوری : ۴۶)
۱۲۹	۳۴	تیسرے ایڈیشن کے متن میں یہاں 'یقینی' چھپا ملتا ہے، جو یقیناً سہوِ کتابت ہے؛ پہلے ایڈیشن سے تصحیح کی گئی ہے۔
	۳۵	پہلے ایڈیشنوں میں 'داخلی ذہنیت' کی جگہ 'داخلیت' تھا؛ اور یہی بہتر بلکہ یہاں ٹھیک بھی ہوگا۔
	۳۶	اوحدی مراغی کا شعر ہے (شعرالعجم، ۵ : ۳۷)

خط ۱۴

۱۳۰	۱	ژاں دُ ژواین وِیل قوم کا فرانسیسی تھا؛ ۱۲۲۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ پانچویں صلیبی جنگ میں (۱۲۴۸ تا ۱۲۵۴ء) لوئی نہم شاہِ فرانس کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنی عمر کے آخری زمانے یعنی ۱۳۰۹ء میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں قلم بند کی تھی، جس میں ان چھ برس کے حالات بیان کیے ہیں۔ اُس سے پہلے ایک اور فرانسیسی شخص جافری دُ وِیل ہار دُواَین نے چوتھی صلیبی جنگ سے متعلق اپنے چشم دید حالات لکھے تھے۔ ان دونوں یادداشتوں کا انگریزی ترجمہ (Memoirs of the Crusades) کے عنوان سے ایوری مینس لائبریری (Everyman's Library) نے شائع کیا ہے۔ (کتاب نمبر ۳۳۳) میرے سامنے ۱۹۵۵ء کا چھپا ہوا نسخہ رہا ہے؛ یہاں حوالے اسی سے درج کیے گئے ہیں۔
	۲	صلیبی جنگوں پر بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، اور اُن سے ایک مختصر سا کتاب خانہ مہیا ہو سکتا ہے۔ مختصراً یہ اُن جنگوں کا نام ہے، جو مغربی یورپ کی مختلف حکومتوں نے عیسائیت کے مقاماتِ مقدّسہ کو مسلمانوں کے قبضے اور تسلّط سے آزاد

کرانے کے لیے ۱۰۹۶ء سے لے کر ۱۲۹۱ء تک لڑیں۔ اس موضوع پر ایک بہت اچھی کتاب A History of the Crusades کے نام سے پانچ جلدوں میں وِس کونسن یونیورسٹی، فلاڈیلفیا (امریکہ) شائع کر رہی ہے۔ اس کا مطالعہ کتنی ضخیم کتابوں سے مستغنی کر دیگا؛ تمام واقعات مستند ماخذوں سے پوری تفصیل سے دے دیے گئے ہیں۔

لوئی نہم کی جنگوں کا حال اس سلسلے کی دوسری جلد میں آیا ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ اصولی طور پر لوئی والی جنگ 'ساتویں صلیبی جنگ' تھی۔

۳ لوئی نہم، شاہ فرانس (۱۲۱۴ - ۱۲۷۰ء) اپنے والد لوئی ہشتم کی وفات پر ۱۲۲۶ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے شروع ہی سے مذہبی معاملات سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور بالآخر ۱۲۴۸ء میں وہ صلیبی جنگ کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہاں مصر کے شہر منصورہ میں اس کی فوج کو شکست فاش ہوئی اور لوئی خود گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ۱۲۵۴ء میں فرانس واپس گیا۔ اگلے سولہ برس اس نے تیاریوں میں صرف کیے، اور ۱۲۷۰ء میں وہ تازہ مہم پر روانہ ہوا۔ لیکن اب کے وہ مقاماتِ مقدّسہ یا مصر کی بجائے تیونس کے شہر قرطاجنہ (کارتھج) پہنچ گیا۔ دراصل یہاں کی موت اس کی قسمت میں لکھی تھی۔ ایک مہینے کے اندر اندر گرمی اور وبا نے اس کی فوج کو لاشوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا؛ اسی میں وہ خود بھی لقمۂ اجل ہوگیا (۲۵ اگست ۱۲۷۰ء)۔ ۱۲۹۷ء میں پوپ نے اسے ولی کا درجہ عطا کیا؛ چنانچہ اب وہ سینٹ لوئی کے نام سے مشہور ہے۔ ژاں ڈُژوآین وِیل نے اپنی کتاب میں اس کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

۴ دمیاط۔ شمالی مصر کا مشہور قدیم شہر، قاہرہ سے تقریباً ۱۲۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اِس وقت آبادی ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یہ پندرہ بیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ کسی زمانے میں بڑا شاندار مرکزِ تجارت تھا۔

حواشی

	۵	عربی میں اس موضوع سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ اہم ہیں : ابوشامہ : کتاب الروضتین ۔ قاہرہ ۱۸۷۰، ۱۸۷۱ء الملک المؤید اسماعیل ابوالفدا : المختصر فی اخبار البشر ۔ قاہرہ، ۱۳۲۵ھ تقی الدین احمد بن علی المقریزی : السلوک لمعرفۃ دول الملوک ۔ قاہرہ، ۱۹۵۸ء جمال الدین محمد بن سالم بن واصل : مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب ۔ (اس کا صرف ایک حصہ ۶۱۵ھ تک کے واقعات پر مشتمل ڈاکٹر جمال الدین الشیال کی تصحیح کے بعد شائع ہوا ہے ؛ بقیہ ہنوز دارالکتب المصریہ، قاہرہ میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے) جمال الدین یوسف ابن تغری بردی ۔ النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة ابن اثیر : تاریخ الکامل ایک نئی کتاب دکتور سعد عبدالفتاح عاشور کی الحرکۃ الصلیبیہ (قاہرہ، ۱۹۶۳ء) بھی مفیدِ مطلب ہے ۔ دارالکتب المصریہ، قاہرہ میں اس موضوع پر ایک اور خطی کتاب عقد الجمان فی تاریخ اهل الزمان بدر الدین محمود العینی کی تالیف بھی موجود ہے ۔
	۶	عکّہ : مشرقی بحیرہ روم میں اسرائیل کی بندرگاہ ۔ اب تو اس شہر کی زیادہ اہمیت نہیں رہی، چند ہزار کی آبادی ہوگی ؛ لیکن کسی زمانے میں یہ فینقیا اور فلسطین کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جو تجارتی قافلے کاروبار کرتے تھے ۔ ان کا یہ مغربی صدر مقام تھا ۔ تورات میں اس کا متعدد مقامات پر ذکر ہے (مثلاً کتاب القضاۃ، ۱ : ۳۱ وغیرہ) اب اس کی اہمیت اس پہلو سے بھی ہے کہ بہائی مذہب کے بانی مرزا حسین علی نوری المعروف بہ بہاء اللہ (ف ۲۹ مئی ۱۸۹۲ء) اسی کے مضافات میں البہجہ کے مقام پر دفن ہیں ۔
۱۳۱	۷	ژوایں وِیل : ۳۲۷

۱۳۲ ۸ ژوائین ویل : ۲۴۶

۱۳۳ ۹ رابعہ بصریہ ۔ اصلی نام رابعہ العدویہ، بصرہ کے ایک غریب گھرانے میں ۹۵ھ/۱۳-۷۱۴ء میں پیدا ہوئیں۔ بچپن میں کوئی اٹھا لے گیا اور اس نے انھیں قیس بن عدی کے قبیلہ العتیق کے پاس فروخت کر دیا۔ ان کی نیکی اور تقویٰ نے آزادی دلائی۔ اس کے بعد یہ پہلے آبادی سے دور اور اس کے بعد بصرے میں گوشہ نشین ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ ان کے زہد و اتقا کا شہرہ ہوا اور لوگ ان کے پاس تعلیم و استفادہ اور صلاح و مشورہ کے لیے آنے لگے؛ ان میں مالک بن دینار، رباح القیس، سفیان الثوری، شقیق بلخی وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔

حضرت رابعہ کا انتقال ۱۸۵ھ/۸۰۱ء میں بصرے میں ہوا؛ اور وہیں دفن ہیں۔

(تذکرۃ الاولیا، ۱: ۵۹؛ الطبقات الکبریٰ: ۵۶؛ نفحات الانس: ۷۱۶ - ۷۱۷)

۱۰ ابوالقاسم القشیری : الرسالہ : ۸۶، ۱۷۳، ۱۹۲

۱۱ ابوطالب مکی : قوت القلوب، ۱ : ۱۰۳، ۱۵۶

۱۲ فریدالدین عطار : تذکرۃ الاولیا، ۱ : ۵۹

۱۳ الشعرانی : الطبقات الکبریٰ : ۵۶

۱۳۴ ۱۴ پہلے یہ جملہ یوں تھا : بعض متجسس طبائع ایسے پیدا ہو گئے تھے؛ اسی لیے آگے 'ملتیں' کی جگہ 'ملتے' اور 'کرتیں' کی جگہ 'کرتے' تھا۔

۱۳۵ ۱۵ شیخ شیرازی نے یہ واقعہ گلستاں میں بیان کیا ہے (کلیات : ۵۳) اسی قید کے زمانے میں ان کی ملاقات حلب کے ایک رئیس سے ہوئی تھی، جس نے دس دینار ادا کر کے انھیں رہا کرایا اور گھر لا کر سو دینار مہر پر اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ عورت تھی لڑاکا اور زبان دراز؛ شیخ اس سے عاجز آ گئے۔ ایک دن اس نے طعنہ دیا کہ تم وہی تو ہو جسے میرے باپ نے دس دینار پر قید فرنگ سے خریدا تھا۔ شیخ نے برجستہ جواب دیا ۔ ہاں، تم نے سچ کہا؛ دس دینار میں خرید کر سو پر تمھارے ہاتھ بیچ ڈالا۔

	۱۶	ژواں ویل : ۲۴۶ - ۲۴۷
۱۳۶	۱۷	ایضاً : ۲۴۶
	۱۸	پہلے یہاں 'برائی' کی جگہ لفظ 'گناہ' تھا۔
۱۳۷	۱۹	Apocrypha : تورات اور انجیل میں جتنی کتابیں ملتی ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں لوگوں میں رائج تھیں، جنھیں وہ عقیدت وارادت اور ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ مولانا مرحوم کی تحریر کا مفاد یہ ہے کہ یہ سب 'جعلی نوشتے' تھے، حال آنکہ یہ صحیح نہیں۔ ان کے مصنّف یا مرتّب بھی اسی زمانے کے لوگ تھے، جب تورات اور انجیل لکھی گئیں۔ ہے یوں کہ جب ان دونوں کتابوں کو آخری شکل میں مرتّب کیا گیا، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مذہبی اور اعتقادی یکسانیت پیدا کرنے کے لیے جو کتابیں ترک کی گئی ہیں، ان کا مطالعہ بھی ممنوع قرار دیا جائے۔ اسی لیے ان کا نام Apocrypha رکھا گیا اور مذہبی حلقوں میں ان کا پڑھنا پڑھانا جرم قرار پایا؛ ورنہ وہ کتابیں بھی اتنی ہی اصلی اور مصدّقہ تھیں، جتنی وہ جو اب دونوں کتابوں میں شامل ہیں۔
	۲۰	امام احمد بن حنبل۔ چار فقہی مذاہب میں سے حنبلی طریقے کے بانی، ربیع الاول ۱۶۴ھ/ نومبر ۷۸۰ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ عراق، شام، حجاز، یمن کے اساتذۂ عہد سے حدیث اور امام شافعی سے فقہ واصول کی تعلیم پائی۔ مسئلۂ خلقِ قرآن پر ان کا بھی مامون الرشید سے اختلاف ہوا جس پر قید و بند کی سختیاں جھیلنا پڑیں؛ بغداد ہی میں ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ/ ۳۱ جولائی ۸۵۵ء کو انتقال ہوا؛ وہیں قبرستان 'مقابر الشہدا' میں دفن ہوئے تھے۔
	۲۱	ابن حنبل کا یہ قول مسند میں نہیں ملا، لیکن اس کی طرف ایک جدید تالیف 'دفاع عن الحدیث النبوی' میں اشارہ ملتا ہے۔
۱۳۸	۲۲	پہلی اشاعتوں میں 'دستا نسرائی' چھپا ملتا ہے۔
	۲۳	ملّا معین واعظ کاشفی۔ یہ سہوِ قلم ہے۔ ملّا معین ہروی بیٹے تھے مولانا محمد فراہی کے

		اوران کا تخلص کاشفی نہیں، بلکہ معین اور معینی تھے؛ اور عرف ملّا مسکین مشہور فقیہ ہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب کنز الدقائق (از نسفی) کی شرح اور معارج النبوة فی مدارج الفتوة ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء (حبیب السیر، ۳ : ۳۲۸) یا ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں انتقال ہوا (معجم المؤلفین، ۱۲ : ۲۱۲ نیز کشف الظنون : ۱۶۲۳)
	۲۴	رابعہ شامیہ، یہ احمد بن ابی الحواری کی بیوی تھیں۔ احمد کہتے ہیں کہ کبھی ان پر عشق و محبت کا غلبہ ہوتا تھا، کبھی اُنس کا، اور کبھی خوف کا۔ صاحبۂ کشف تھیں۔ ہارون الرشید (۸۰۹ء) اور مامون الرشید (ف ۸۳۳ء) کی معاصر تھیں (نفحات الانس : ۷۱۹-۷۲۰)
۱۳۹	۲۵	ژوائین وِیل : ۲۴۸
	۲۶	متن میں 'التموت' چھپا تھا؛ صحیح 'الموت' ہے، اس لیے اصلاح کر دی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے 'الموط' بھی لکھا ہے، مثلاً اقبال کا مصرع ہے : ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔
	۲۷	حسن بن صبّاح۔ اس شخص کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ تاریخوں میں کچھ ایسی متضاد روایات ملتی ہیں کہ ان میں سے کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا معلوم ہے کہ فاطمی امامِ مصر المستنصر کی وفات (۱۰۹۴ء) کے بعد وراثت سے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایران میں عبد الملک بن عطّاش اصفہانی فاطمیوں کا داعی تھا؛ اس نے المستنصر کے بیٹے نزار کا ساتھ دیا؛ مصری دوسرے بیٹے المستعلی کے طرفدار تھے۔ یہ گویا ایرانی اسمٰعیلیوں کے الگ نظام کی ابتدا تھی۔ ان لوگوں نے ایران کے مختلف قلعوں پر قبضہ کر لیا، جو اس سے پہلے سلجوقیوں کے زیرِ تسلّط تھے (سلجوقی مذہباً سنّی تھے) منجملہ ان کے الموت کا پہاڑی قلعہ حسن بن صبّاح نے ۱۰۹۰ء میں فتح کر لیا تھا۔ حسن پہلے ابن عطاش کے ماتحت ایک داعی تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ اسمٰعیلیوں کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ حسن بن صبّاح ہی شیخ الجبال

کے لقب سے معروف تھا؛ 'باطنیہ' فرقے کا بانی یہی وہی ہے۔ یہ لوگ اپنے مخالف کو بے دریغ قتل کر دیتے تھے (ان کا عربی لقب حشیشیہ ہی انگریزی میں جا کر Assassin بن گیا ہے)، مدتوں باطنیہ نے مغربی ایشیا کے مختلف ملکوں میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ حسن بن صبّاح کا ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء میں انتقال ہوا۔ ملکی معاملات میں اس کا جرنیل کے بزرگ امید رودباری اس کا جانشین ہوا، اور روحانی میں ابو علی داعی الدعاۃ اوّل۔

آغا خاں انھیں اسمٰعیلیوں کے وارث اور نام لیوا ہیں۔ (انگریزی میں اس موضوع پر بہترین کتاب ہاگرڈسن کی Order of the Assassins (لائیڈن، ۱۹۵۵ء) ہے اور عربی میں دکتور محمد کامل حسین کی طائفۃ الاسماعیلیہ (قاہرہ)

	۲۸	ٹمپلر۔ یہ Knight Templar یا Poor Knights of Jesus کہلاتے تھے۔ اس طرح کی تین تنظیمیں تھیں۔ خاص یہ تنظیم بارھویں صدی میں دو آدمیوں نے شروع کی تھی؛ پھر لوگ آ آ کر شامل ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ دراصل یہ صلیبیوں ہی کا فوجی ادارہ تھا، اور اس کا مقصد ان زائرینِ مقاماتِ مقدسہ کی مدد اور حفاظت کرنا تھا، جو پہلی صلیبی جنگ کے بعد سے یروشلم میں جمع ہو گئے تھے۔ بالڈون ثانی شاہِ یروشلم نے اپنے محل ہی کا ایک حصہ ان کے حوالے کر دیا تھا؛ یہ قدیم مسجدِ اقصیٰ کے نواح میں تھا۔ چونکہ اس کا کلیسائی نام Temple of Soloman (ہیکل سلیمانی) تھا، اس لیے ان لوگوں کا نام ٹمپلر پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ادارہ کلیسا میں ایک نیا فرقہ تسلیم کر لیا گیا (۱۱۲۸ء) اور تقریباً ایک سو برس تک اپنے تموّل اور رسوخ کے باعث بہت ممتاز رہا۔ انھوں نے ایشیائے کوچک کے تمام اہم مقامات میں اپنے مرکز قائم کر لیے تھے اور صلیبی جنگوں کے دوران میں وہ عیسائی فوجوں کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔ چودھویں صدی کے شروع میں (۲ مئی ۱۳۱۲ء) پوپ نے خاص حکم کے ذریعے سے اس فرقے کو ختم کر دیا۔
۱۴۰	۲۹	ہاسپٹلر۔ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر پوپ گریگوری نے یروشلم میں ایک

ہسپتال قائم کیا تھا جس کا نام ہاسپٹل آف سینٹ جون Hospital of St John) تھا۔ جو لوگ اس ادارے سے متعلق اور اس کے منتظم تھے، اسی باعث ان کا نام ہاسپٹلر مشہور ہوگیا۔ یہ دراصل فوجی راہب تھے، اور شروع میں انھیں فوج یا جنگ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی یہ حیثیت بتدریج بارھویں صدی میں مکمل ہوئی۔ جب مسلمانوں نے یروشلم پر قبضہ کرلیا، تو یہ عکّہ چلے گئے، اور پھر انھیں وہاں سے بھی نکل کر قبرص میں پناہ لینا پڑی۔ چودھویں صدی میں انھوں نے روڈس پر قبضہ کرلیا۔ جب ۱۵۲۲ء میں ترکوں نے یہ جزیرہ فتح کرلیا، تو یہ لوگ مالٹا پہنچے، جہاں کی حکومت ۱۷۹۸ء تک ان کے ہاتھ میں رہی۔ مالٹا سے انھیں نپولین نے نکالا تھا۔

۳۰ فریڈرک ثانی (۱۱۹۴ - ۱۲۵۰ء) شہنشاہِ سلطنتِ روما، ۲۶ دسمبر ۱۱۹۴ء کو پیدا ہوئے، اور اپنے والد کی وفات کے بعد کمسنی ہی میں مئی ۱۱۹۸ء میں تخت نشین ہو گئے۔ وہ سب سے پہلے ۱۲۲۷ء کی صلیبی جنگ میں شامل ہوئے تھے۔ لیکن فوج میں وبا پھوٹ پڑی اور انھیں واپس جانا پڑا۔ جب حالات معمول پر آگئے، تو وہ دوبارہ مقاماتِ مقدّسہ پہنچے اور اب کے فروری ۱۲۲۹ء کے عہد نامے کی رُو سے یروشلم، بیت لحم اور اس کے مضافات پر قابض ہوگئے۔ مارچ ۱۲۲۹ء میں انھوں نے 'شاہِ یروشلم' کا لقب اختیار کرلیا۔

بہت قابل شخص تھے۔ یورپ کی چھ زبانوں میں پوری مہارت حاصل تھی؛ اس کے علاوہ ریاضی، فلسفہ، طب، معماری سے خاص شغف تھا۔ مقنّن بھی تھے، ان کے مدوّنہ قوانین شارلمین کے بعد مکمل ترین مجموعہ کہے جاسکتے ہیں؛ یہ صحیح معنوں میں ان کی شخصیت کا مظہر ہیں۔ ناپلز کی یونیورسٹی انھیں نے قائم کی تھی۔ مغرب میں عربی (ہندی) اعداد کا استعمال بھی انھیں نے شروع کیا۔ پرندوں اور جانوروں سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ ایک چڑیا گھر بنایا اور پرندوں سے متعلق کتاب لکھی۔

ان کی ساری عمر کلیسا اور پوپ سے اختلاف اور جنگ میں گذری۔ ۱۳ دسمبر ۱۲۵۰ء

		کو وفات پائی۔
	۳۱	ژواین ویل : ۲۴۸
۱۴۱	۳۲	ایضاً
۱۴۲	۳۳	ایضاً : ۲۴۹
۱۴۳	۳۴	ایضاً : ۲۲۰، ۲۳۱ - یہ رقم آٹھ لاکھ طلائی سکّے بیزان (Bezants) کے برابر تھی۔
۱۴۴	۳۵	ایضاً : ۲۴۹
	۳۶	طبع اوّل میں یہاں 'ایک ماہ' تھا۔
	۳۷	ژواین ویل : ۲۴۹
۱۴۵	۳۸	ایضاً : ۲۵۱
	۳۹	ایضاً : ۲۵۰
	۴۰	ایضاً
۱۴۶	۴۱	اس کا پورا نام رکن الدین خورشاہ تھا۔ لیکن خورشاہ ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء میں حکمران ہوا۔ اس سے پہلے اس کا باپ علاء الدین محمد ثالث (ف ۶۵۳ھ) حاکم تھا۔ لوئی نہم اسی کا معاصر تھا؛ اس لیے یہ خط وکتابت اور سفارتی تبادلہ بھی اسی کے عہد میں ہوا ہوگا، نہ کہ خورشاہ کے زمانے میں۔
۱۴۷	۴۲	ژواین ویل : ۱۸۶
۱۴۸	۴۳	ایضاً : ۱۸۶-۱۸۷
	۴۴	نپولین بونا پارٹ مشہور شہنشاہِ فرانس ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء کو جزیرۂ کورسیکا میں پیدا ہوا۔ بتدریج مئی ۱۸۰۴ء میں فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ ۱۸۱۵ء میں انگریزوں نے دوسری یورپی حکومتوں کے ساتھ مل کر اسے واٹرلو (بلجیم) کے میدانِ جنگ میں شکست دی۔ اس کے بعد نپولین نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا؛ انھوں نے اسے پابجولاں جزیرہ سینٹ ہلینا بھیج دیا۔ یہیں قید کی حالت میں ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو انتقال ہوا۔ ۲۰ سال بعد ۱۸۴۰ء میں نعش پیرس لائی گئی ،

جہاں اب یہ ایک خاص مقبرے (Invalides) میں مدفون ہے۔

۴۵ نپولین نے مصر پر یہ حملہ جولائی ۱۷۹۸ء میں کیا تھا، اس نے فوجیں اسکندریہ کی مشہور بندرگاہ میں اتاری تھیں۔ اس وقت قاہرہ میں دو شخصوں کی مشترکہ حکومت تھی: اسمٰعیل بک، شیخ البلد اور مراد بک امیر الحج (بک کا تلفظ بَے ہے)۔ ان کی فوجوں کا نپولین سے مقابلہ اہرام کے نواح میں قریۂ امبابہ میں ہوا؛ اسی لیے یہ جنگِ امبابہ کہلاتی ہے۔ انھیں شکست ہوئی اور مراد بک جنوبی مصر کی طرف بھاگ گیا۔ نپولین کے ایک فوجی دستے نے اس کا پیچھا کیا، لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔ غالبًا وہ بھی یکم مارچ ۱۸۱۱ء کے اس قتلِ عام میں ختم ہوگیا، جب محمد علی پاشا نے تمام مملوک سرداروں کو قاہرہ کے قلعے میں دعوت میں بلاکر تلوار کے گھاٹ اتروادیا تھا۔

۴۶ الجبرتی نے اس واقعے سے متعلق یہ لکھا ہے:

وَقدْ كانت العلماء عند توجه مراد يجتمع بالازهر كل يوم ويقرءون البخاري وغيره من الدعوات (عجائب الآثار فی التراجم والاخبار، ۳: ۶) یعنی جب مراد فرانسیسوں کے مقابلے کے لیے جاتا، تو علما (نیک فالی کے لیے) ازہر میں جمع ہوکر صحیح بخاری پڑھتے اور دوسری دعاؤں کا ورد کرتے تھے۔

۱۴۹ ۴۷ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی، الجبرت کی نسبت حبشہ (ابی سینیا) میں ایک قصبے یا شہر سے ہے، جہاں سے ان کے اجداد ہجرت کرکے مصر میں آرہے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم اپنے والد کی زیر نگرانی ہوئی اور خود اُن سے اِنھوں نے مذہب کے علاوہ ادب، ریاضی اور ہیئت کی تعلیم پائی اور پھر اپنے طور پر اتنی استعداد پیدا کرلی کہ اپنے زمانے کے علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۲۰۳ھ میں ایک مصری عالم سیّد مرتضیٰ نے بارھویں صدی ہجری کے مشاہیر کا تذکرہ مرتّب کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے اس مفید کام میں عبدالرحمٰن الجبرتی سے معاونت کی درخواست کی، جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ بدقسمتی سے سیّد مرتضیٰ کا اس کے بعد جلد ہی انتقال ہوگیا۔ اس خیال سے کہ

ساری محنت اکارت نہ جائے، الجبرتی نے مرحوم کا تمام کتاب خانہ اور مسوّدات خرید لیے حال آں کہ ان میں کا بہت سا حصہ خود انھی کا لکھا ہوا تھا۔ اب یہ کام انھوں نے خود کام آگے بڑھایا اور بالآخر اپنی مشہور تاریخ مرتب کرلی جس کا پورا نام عجائب الآثار فی التراجم والاخبار ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے (المطبعۃ العامرۃ الشرقیہ، قاہرہ - ۱۳۲۲ھ)

خط ۱۵

۱۵۱ | ۱ | دیوان غالب : ۲۲۱

۲ | میرزا کاظم قمی کا شعر ہے (خریطۂ جواہر: ۱۴۴؛ شمع انجمن : ۴۰۰)

۳ | غالباً یغما جندقی کی رباعی کا چوتھا مصرع ہے (دیوان : ۲۲۱) پوری رباعی ہے:

آں ظلمتِ محض کآمد از خطّۂ نور
زنہار بنامِ او نگردی مغرور
چوں سگ نجس است، طاہرش میخوانند
برعکس نہند نام زنگی کافور

(یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چوتھا مصرع کسی اور کا ہو جسے یغما نے تضمین کیا ہے)

۴ | دیوان بابا فغانی : ۷۹

۱۵۲ | ۵ | قدسی

۶ | کلیات غالب (فارسی) : ۲۳۳

۷ | میرزا سعد الدین محمد راقم مشہدی کا شعر ہے (شعر العجم، ۵ : ۲۰۲) شعر العجم میں البتہ مصرع اولیٰ یوں ہے:

زبسکہ پیروی خلق گمرہی آرد

۸ | ذوق کا مصرع ہے (دیوان ذوق (مرتبۂ آزاد) : ۲۳۹)۔ پہلا مصرع ہے:

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینہ میں پیکاں سے

حواشی

صفحہ	حاشیہ	
۱۵۳	۹	دیوان حافظ : ۴۱
	۱۰	گلستاں (بابِ اول) کا ٹکڑا ہے (کلیاتِ سعدی : ۲۶) البتہ یہاں کچھ لفظی تغیّر ہوگیا ہے، اصلی عبارت یوں ہے : 'بنیادِ ظلم در جہاں اندکے بودہ است ۔ ہر کہ آمد، بر و مزیدے کرد تا بدیں غایت رسید'
	۱۱	نواب مرزا خان داغ دہلوی کا مصرع ہے (گلزارِ داغ : ۱۵۱) پورا شعر ہے : لطفِ مَے تجھ سے کیا کہوں واعظ ہائے، کمبخت ! تو نے پی ہی نہیں
۱۵۴	۱۲	دیوان حافظ : ۱۱۴ ۔ پہلا مصرع ہے : غیر تم گشت کہ محبوبِ جہانی، لیکن
	۱۳	ایضاً، ص ۱۴۳
	۱۴	دیوانِ حافظ : ۱۱۹ ۔ مصرع اولیٰ ہے : جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
	۱۵	دیوان غالب : ۱۳۴
۱۵۵	۱۶	مفتی صدرالدین آزردہ کا شعر ہے (گلستانِ سخن : ۱۱۴)
	۱۷	کسی غنی تخلص کے شاعر کا مصرع ہے (گلستانِ مسرت : ۸۸) پہلا مصرع ہے : بگردِ کعبہ ہندو شد، مسلماں گشت بے ایماں
	۱۸	دیوان حکیم سنائیؔ : ۳۳۹
	۱۹	میرزا عبدالقادر بیدل کی رباعی ہے (کلیات بیدل، ۲ (رباعیات) : ۳۹) صحیح مصرع اول میں 'خلق' کی جگہ 'غیر' ہے اور مصرع ثانی یوں ہے واگرد بدل دلیل، توفیق اینست
۱۵۶	۲۰	گلستاں (بابِ پنجم) کا شعر ہے (کلیات سعدی : ۸۹)
	۲۱	ابو فراس الحمدانی کا مصرع ہے (دیوان ابی فراس الحمدانی : ۳۵) پہلا مصرع ہے :

حواشی

ومن مذهبی حب الدیار لاهلها

۲۲ یہ حدیث کسی معتبر مجموعے میں نہیں ملی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح محدّث دہلوی نے اس حدیث سے متعلق ایک عجیب روایت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں (ترجمہ از عربی)

میرے والد نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أنا أملحُ وأخي یوسف اصبح یعنی میں ملیح ہوں اور میرا بھائی یوسف صبیح ہے۔ میں اس حدیث کے معنوں کا خیال کرکے متعجّب ہوا کیونکہ ملاحت صباحت کی بہ نسبت عاشقوں کو زیادہ بیقرار کرتی ہے؛ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں بیان ہوا ہے کہ زنانِ مصر نے انھیں دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، اور بعض لوگ ان (کے جمال) کو دیکھ کر مر گئے تھے، اور (اس کے بالعکس) ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ (اس کے بعد) میں نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو خواب میں دیکھا اور اس سے متعلق سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: اللہ عز وجل نے غیرت سے میرا حسن لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اگر یہ ظاہر ہو جائے تو لوگ اُس سے کہیں زیادہ کریں، جو انھوں نے یوسف کو دیکھ کر کیا تھا۔"

(الدُّر الثمین فی مبشّرات النبی الامین: ۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں چالیس ایسی حدیثوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے خواب میں براہ راست حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یا ایک دو واسطہ سے سنی تھیں۔ یہ بیسویں حدیث ہے۔

۲۳ دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۷۲، مصرع اول ہے:

زاں یار دل نوازم شکریست باشکایت

بعض جگہ یہ مصرع یوں ملتا ہے:

گر نکتہ دان عشقی، بشنو تو ایں حکایت

	۲۴	مولانا شبلی نعمانی کا شعر ہے (کلیات شبلی : ۸۷)
	۲۵	یہ حاشیہ طبع اول میں نہیں تھا۔
۱۵۷	۲۶	دیوان ذوق (مرتبہٗ آزاد) : ۲۲۹ ؛ ایضاً (مرتبہٗ ویران) : ۱۲۷
	۲۷	چندر بھان برہمن کا شعر ہے (کلمات الشعرا : ۱۸)
	۲۸	دیوان حافظ : ۸۱ ۔ مصرع اولیٰ ہے : زیں قصہ ہفت گنبدِ افلاک پُر صدا ست
	۲۹	انشا کا مصرع ہے (کلام انشا : ۵) ؛ پہلا مصرع یوں ہے : نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھیو، انشا !
۱۵۸	۳۰	کلیات غالب : ۳۷۱
۱۵۹	۳۱	تذکرۂ شمع انجمن (ص ۳۸۸) اسے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح سے منسوب کیا گیا ہے، اور پورا شعر ہے : من بچندیں آشنائی می خورم خونِ جگر آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانۂ لیکن حضرت علیہ الرحمۃ کا شاعر ہونا ہی مشتبہ ہے ۔ چونکہ مقطع مندرجۂ شمع انجمن میں تخلص قطب ہی ملتا ہے، اس لیے اسی تخلص کے کسی اور شاعر کا ہوگا ۔
۱۶۰	۳۲	مومن کا مصرع ہے (کلیات مومن، ۱ : ۱۵۷) ۔مصرع اولیٰ ہے : بس گلہ کرتا ہوں اپنا، تو نہ سُن غیروں کی بات
	۳۳	بیدل کا مصرع ہے (کلیات بیدل، ۱ : ۸۳۶) ٹھیک شعر یوں ہے : سازِ تحقیق ندارد ، چہ نگاہ و چہ نفس سرِ ایں رشتہ بجائیست کہ من میدانم
	۳۴	تیسرے ایڈیشن (یعنی ہمارے متن) میں یہاں 'کے' چھپا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ محل 'سے' کا ہے ؛ یہی پہلے ایڈیشن میں بھی ہے ۔ ظاہرا کتابت کی غلطی ہے، لہذا اصلاح کر دی گئی ہے ۔

۱۶۱	۳۵	دیوان حافظ : ۳۲۵ - یہاں کچھ لفظی تبدیلی ہوگئی ہے - پورا شعر یوں ہے : گر مسلمانی از این است کہ حافظ دارد آہ ، اگر از پئے امروز بود فردائے !
	۳۶	دیوان حافظ : ۸۵ - مصرع اول ہے : شرحِ شکنِ زلف خم اندر خمِ جاناں
	۳۷	دیوان حافظ : ۵۹ - مصرع اولیٰ ٹھیک یوں ہے : دوائے دردِ خود اکنوں ازاں مفرّح جو ہے
۱۶۲	۳۸	جرنیل چنگ کائی شک (Chiang Kai-Shek) ، ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۷ء کو پیدا ہوئے - چین اور جاپان میں فوجی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مشہور انقلابی رہنما ڈاکٹر سن یات سن (Sun Yat-sen) کی پارٹی میں شامل ہوگئے - دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء) کے دوران میں چینی حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی - وہ اپنی بیگم کے ساتھ فروری ۱۹۴۲ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے (جس کی طرف متن میں اشارہ ہے) - جب چین میں کمیونسٹ برسراقتدار آئے ، تو وہ فورموسا میں آزاد حکومت کے سربراہ بن گئے - جسے اب تائیوان کہتے ہیں - ۵ اپریل ۱۹۷۵ء کو انتقال ہوا -
	۳۹	میڈم چنگ - ڈاکٹر سن یات سن کی صاحبزادی - ان کا دوشیزگی کا نام میلنگ سونگ (Mayling Soong) تھا - ۱۹۲۷ء میں ان کی شادی جرنیل چنگ کائی شک سے ہوئی - یہ بھی اپنے نامی شوہر کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان آئی تھیں - متعدد کتابوں کی مصنف ہیں -
	۴۰	کلیات غالب : ۴۰۲
	۴۱	کلیات عرفی : ۲۸۷ - دراصل 'رازِ صبا' کی جگہ 'بادِ صبا' ہے -
	۴۲	حضرت امیر خسرو کا شعر ہے (شعر العجم ، ۲ : ۱۶۸)
۱۶۳	۴۳	دیوان حافظ : ۳۳۰ - مطبوعہ دیوان میں مصرع ثانی میں 'مے می چشی' ہے -

حواشی

	۴۴	ایضاً : ۲۷۳ ۔ دراصل 'تا' کی جگہ 'چوں' ہے ۔ مصرع اولیٰ ہے : اے نورِ چشمِ من ! سخنے ہست، گوش کن
	۴۵	دیوان حالی : ۱۰۰
۱۶۴	۴۶	لیپچو (Lopchu) ، عام چاے کا ایک تاجرانہ نام ہے؛ ویپچو تابع مہمل ہے ۔
	۴۷	کلیات غالب : ۴۳۳ ۔ دراصل 'عرضہ' کی جگہ 'عرض' ہے ۔
	۴۸	کلیات غالب : ۴۹۴ ۔ 'ہیں' کی جگہ 'ہی' چاہیے ۔
	۴۹	کلیات غالب : ۴۸۳
۱۶۵	۵۰	Posraurant ۔ وہ جگہ جہاں کھانا یا ہلکا ناشتہ مہیّا کیا جاتا ہے ۔
	۵۱	دیوان نظیری : ۶۰ ۔ مصرع اول ہے : یکے بگورِ عزیزانِ شہر سیرے کن
	۵۲	دیوان حافظ : ۵۷
	۵۳	گلستاں (باب دوم) کا شعر ہے (کلیاتِ سعدی : ۶۲)
۱۶۶	۵۴	کلیاتِ بیدل ، ۱ : ۴۰۷ ۔ مطبوعہ دیوان میں پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں 'شبستاں' کی جگہ 'خمستاں' ملتا ہے ۔ اور دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں 'کز' کی جگہ 'اگر' ۔
	۵۵	دیوان غالب : ۲۳۷
۱۶۷	۵۶	کلیاتِ سعدی : ۳۵۰ ۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیات میں 'چہ داند' کی جگہ 'نداند' ملتا ہے ۔
	۵۷	آصف خاں جعفر بیگ امراے مغلیہ میں سے تھے، ان کا شعر ہے
	۵۸	غالب کا مصرع ہے (دیوان غالب : ۴۲) ۔ پورا شعر ہے : تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسد! سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا
	۵۹	دیوان ذوق (مرتبۂ آزاد) : ۲۱۶ ۔ پہلا مصرع ہے : نگہ کا وار تھا دل پر، پھڑکنے جان لگی

	۶۰	دیوان غالب : ۱۳۹ ۔ اگرچہ بیشتر اشاعتوں میں یہ شعر اسی طرح لکھا ملتا ہے ، لیکن صحیح مصرع اولیٰ میں 'سرہے' کی جگہ 'ہے سر' ہے۔
	۶۱	کلیات بیدل ، ۱ : ۹۴ ۔ مصرعے میں 'اگر دستے' کی جگہ 'کہ دستے گر' چاہیے۔ مصرع اولیٰ ہے :

بہ بیبا ملیم وقت است، اگر شورِ جنوں گرید

	۶۲	دیوان کلیم کاشانی : ۲۴۷ ۔ پہلے مصرعے میں "حدیثِ شوق" کی جگہ 'بیانِ عشق' چاہیے۔

خط ۱۶

۱۶۹	۱	دیوان حافظ : ۲۲۸ - ۲۲۹ ۔ یہاں مطبوعہ متن سے کچھ اختلاف ہے ، مثلاً پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'بزن' کی جگہ 'بدہ' ہے ۔ آخری شعر کا پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا :

ساقی! بہ بے نیازیِ رنداں کہ مے بدہ

۱۷۰	۲	طبعِ ثالث میں 'سے' نہیں تھا؛ طبع اول سے اضافہ کیا گیا۔
	۳	عبدالرحیم خانخاناں کے قصیدۂ مدحیہ کا مصرع ہے (کلیات عرفی : ۲۰۰) پورا شعر ہے :

زبسکہ لعل فشاندم بنزدِ اہل قیاس
یکے است نسبتِ شیرازی و بدخشانی

	۴	فیضی ۔ اصلی نام ابوالفیض تھا۔ پہلے تخلص فیضی تھا، آخر میں فیاضی کر لیا تھا ۔ ۹۵۴ھ/ ۱۵۴۷ - ۱۵۴۸ء میں پیدا ہوئے ۔ قران کی تفسیر عربی میں 'سواطع الالہام' کے نام سے صنعتِ غیر منقوطہ میں لکھی ۔ خمسۂ نظامی کا جواب لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ ہو سکا اور موت کا بلاوا آگیا۔ دیوان (طباشیر الصبح) چھپ چکا ہے۔ ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ/ ۵ اکتوبر ۱۵۹۵ء کو آگرے میں وفات پائی (آئین اکبری : ۲۴۳ - ۲۶۵ ؛ منتخب التواریخ ، ۳ : ۲۹۹ - ۳۱۰ ؛ مآثر الکرام ، ۱ : ۱۹۸ - ۲۰۰)
	۵	میرزا فرصت شیرازی کے حالات کے لیے دیکھیے ، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی : ۲۳۲ - ۲۳۵

۶ — مصرع حسن سجزی دہلوی مرحوم کا ہے (دیوان حسن سجزی : ۲۸۴)؛ صحیح 'خرسندم' کی جگہ 'خشنودم' ہے۔ پہلا مصرع ہے :

اے سرو بتو شادم، شکلت بفلاں ماند

۷ — یعنی گھر کا مالک زیادہ جانتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔

۱۷۱

۸ — 'محی نگر' اس لیے کہ اورنگ زیب عالم گیر کا اصلی نام 'محمد محی الدین' تھا۔

۹ — ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو۔

۱۰ — دیوان بابا فغانی : ۷۹

۱۷۲

۱۱ — غالب کے مطلع کا مصرع ثانی ہے (کلیات غالب : ۳۹۳) مطلع ہے :

یار مور عہد شبابم بکنار آمد و رفت
ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت

۱۲ — دیوان حافظ : ۳۲۶۔ مطبوعہ نسخے میں 'خلق' کی جگہ 'ہردم' ہے۔

۱۳ — دیوان غالب : ۱۵۳۔ مصرع ثانی میں صحیح غالباً 'تری' کی جگہ 'ترا' ہے

۱۴ — Heater : بجلی کا پانی یا کمرے کو گرم کرنے کا آلہ۔

۱۷۳

۱۵ — کلیاتِ عرفی شیرازی : ۳۸۶

۱۶ — دیوان نظیری نیشاپوری : ۳۰۷

۱۷ — متن میں یہاں 'واقعہ' چھپا تھا، طبعِ اول سے اصلاح کی گئی۔

۱۸ — کلیات عرفی : ۲۹۵۔ صحیح مصرع اولیٰ میں اقلیم بجائے 'جیحون' ہے۔

۱۷۴

۱۹ — متنبیؔ کا شعر ہے (دیوان ابی الطیب المتنبیؔ : ۱۱۶) دیوان میں عقاب لُبنان اور وھو الشتاء ہے۔

۲۰ — یہ سفر اگست ۱۹۰۸ء کے بعد پیش آیا تھا۔ اسی مہینے مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین مرحوم کا انتقال ہوا، اور وہ اس کے بعد سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ ان کا دوسرا سفرِ عراق تھا۔ پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۰۵ء کے شروع میں گئے تھے۔ مولانا مرحوم کے سفرِ عراق سے متعلق شبہہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے

پہلے دبے لفظوں میں (معارف، ۵۷، ۶ : ۴۰۳) اور پھر برملا عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے 'افسانہ' قرار دیا (معارف، ۶۶ : ۴۰۴/۶ - ۴۰۴/۷)۔ ان کی تقلید میں کچھ اور اصحاب نے بھی لمبے لمبے مقالے لکھے۔ لیکن ان سب شبہات کی تردید فرانس کے مشہور صوفی مستشرق موسیو لوئی ماسینیوں (Louis Massignon) کے اُس مضمون سے ہو جاتی ہے، جو پروفیسر ہمایوں کبیر کی مرتبّہ تذکاری کتاب مولانا ابوالکلام آزاد میں شامل ہے (ص ۲۷ - ۲۹)۔ اس میں انھوں نے ۱۹۰۸ء میں مولانا آزاد سے بغداد میں اپنی ملاقات، صحبت اور شیخ آلوسی سے استفادے کا ذکر کیا ہے۔

میں خود اپریل ۱۹۶۱ء میں موسیو ماسینیوں سے پیرس میں ملا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے دوبارہ میرے دریافت کرنے پر اس کی تصدیق کی۔

	۲۱	'ستی' میں یاے تو ظاہر ہے کہ فاعلیت کی ہے 'ست' دراصل تحریف ہے 'سیّدہ' کی؛ گویا صحیح لفظ ہوگا 'سیّدتی'۔
	۲۲	سہوِ کاتب سے 'یہ' کا 'طبعِ ثالث' میں نہیں ملتا؛ طبعِ اول سے اضافہ کیا گیا۔
۱۷۵	۲۳	سَرایچی یعنی سرائے کا مالک۔
۱۷۶	۲۴	Short : وہ پاجامہ جس میں پوری ٹانگیں نہیں ہوتیں؛ اسے عام طور پر 'نکّر' کہتے ہیں۔
	۲۵	بوستان کا شعر ہے (کلیات سعدی : ۱۷۴)
	۲۶	یہ حدیث صحیح مسلم (کتاب البر والصلۃ والآداب ۱۲۸) نیز (کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واھلہا ۴۸۰) میں ہے۔ اس کا آخری حصہ اور کئی مجموعوں میں بھی ملتا ہے مثلاً بخاری (کتاب الصلح : ۸، کتاب الجہاد : ۱۳ وغیرہ)؛ ترمذی (کتاب صفۃ الجہنم : ۱۳؛ کتاب المناقب : ۵۴)؛ نسائی (کتاب القسامۃ : ۱۷، ۱۸)؛ ابوداؤد (کتاب الدیات : ۲۸)؛ ابن ماجہ (کتاب الدیات : ۱۶؛ کتاب الزھد : ۱۴)؛ مسند حنبل (۳ : ۱۲۸، ۱۴۵ وغیرہ؛ ۴ : ۳۰۶، ۵ : ۴۰۷)

صفحہ	حاشیہ	
	۲۷	کلیات غالب : ۴۲۳
۱۷۷	۲۸	القرآن : ق، ۵۰ : ۳۰
	۲۹	دیوان نظیری : ۲۳۹
	۳۰	دیوان بابا فغانی : ۳۲۔ دیوان میں 'می خری' کی جگہ 'می دہی' چھپا ہے۔ لیکن یہ محل 'می خری' ہی کا ہے۔ الّا یہ کہ مصرع یوں ہو : اے کہ می گویی : چرا جانے بجاے می دہی دوسرے مصرع میں بھی 'ما' کی جگہ 'من' ملتا ہے۔
	۳۱	یہ لفظ صحیح 'خونابہ' ہے؛ اسے 'خونتابہ' لکھنا درست نہیں؛ اسی لیے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے
	۳۲	دیوان حافظ : ۱۵۴

خط ۱۷

صفحہ	حاشیہ	
۱۷۹	۱	طبع اول میں یہاں 'الیغو' کی جگہ 'ایجو' تھا (بیشتر عرب ممالک میں 'ج' کا تلفظ 'گ' کی طرح ہے؛ پس یہ پڑھا 'ایگو' ہی جائیگا)
۱۸۰	۲	معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کشف المحجوب (ص ۳۸۲) میں ملتا ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ جنیدؒ اسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے۔ (وفیات الاعیان، ۱ : ۳۲۴) کشف المحجوب میں 'نقلت' کی جگہ 'إذا قلت' ہے، اور وفیات الاعیان میں 'إن قلت'۔
	۳	المعرّی کا شعر ہے (شروح سقط الزند، ۲ : ۵۱۹)
	۴	دیوان ابی فراس الحمدانی : ۱۵۷
	۵	دیوان ابن سناء الملک : ۱۶۵۔ دیوان میں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'علی الرغم' کی جگہ 'علی الکرہ' ہے، اور دوسرے شعر کے مصرع اوّل میں 'انسی' کی جگہ 'إن أدری'۔
۱۸۱	۶	فردوسی کے شاہنامہ کا شعر ہے۔

۷ یہ اشعار مثنوی نل دمن میں کسی جگہ مسلسل نہیں، مختلف جگہ سے جمع کر دیے گئے ہیں۔ سارے دس شعروں کے لیے دیکھیے: داستانِ نل و دمن، صفحات: ۴۱، ۴۲، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۱، ۱۷۲۔ مطبوعہ مثنوی (ص ۱۷۲) میں چھٹے شعر کے مصرعِ ثانی میں 'حرف' کی جگہ 'برف' ملتا ہے؛ یہ بہتر ہے۔

۸ روحِ انیس: ۱۴۴۔ اصلی متن میں 'مضامینِ نو کا' ہے، اگرچہ بعض جگہ 'کے' بھی چھپا ملتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں یہ شعر اور اس سے پہلے کا نثری جملہ نہیں ملتا۔

۱۸۲

۹ کلیاتِ بیدل ۴ (عنصر سوم): ۲۳۲۔ مصرعِ اولیٰ ہے:

تو گر خود را نہ بینی، نیست عالم غیرِ دیدارش

مطبوعہ مصرعِ ثانی میں 'محروم' کی جگہ 'محرومی' ہے

۱۰ کلیاتِ بیدل، ۱: ۹۳

۱۸۴

۱۱ عبدالرزاق فیاض کا شعر ہے (کلمات الشعرا، ۸۸)
بعض نسخوں میں مصرعِ اولیٰ کی دوسری روایت 'دردِ اشتیاق' کی بجائے 'جوشِ اشتیاق' ہے۔

۱۲ دیوان ابی الطیب المتنبی: ۳۶۱

۱۳ ملک الشعرا فیضی کا شعر ہے، (شعر العجم، ۳: ۶۶؛ کلیاتِ فیضی: ۲۱۵)

۱۸۵

۱۴ سینٹ آگسٹائن (St. Aurelius Augustine) ۳۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اپنے زمانے کی عام فضا کی طرح ان کی اخلاقی حالت بھی کچھ قابلِ فخر نہیں تھی؛ لیکن ۳۴ سال کی عمر میں عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ان کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ۴۳ برس اور زندہ رہے اور انھوں نے متعدد فلسفیانہ اور دینی کتابیں لکھیں، جو عیسائی حلقوں میں بہت شہرت یافتہ ہیں؛ لیکن ان کی کتاب اعترافات (Confessions) نفسیاتی پہلو سے عجیب و غریب تحریر ہے۔ ۴۳۰ء میں انتقال ہوا۔

۱۵ روسو (Jean Jacques Rousseau) فرانسیسی فلسفی، ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوئے۔ ان کا فرانسیسی انقلاب کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ معاہدۂ عمرانی

(Social Contract) ان کی مشہور کتاب ہے؛ اس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور متعدد کتابیں ہیں، جن میں ایک خود نوشت سوانح عمری (Confessions) بھی ہے۔ ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو انتقال ہوا۔

۱۶ اسٹرنڈ برگ (August John Strindberg) سویڈن کے سب سے بڑے ڈراما نگار، ناول نویس اور سویڈی جدید ادب کے سرخیل اور رہنما۔ ۲۲ جنوری ۱۸۴۹ء کو اسٹوک ہالم میں پیدا ہوئے۔ انھیں 'سویڈن کا شکسپیر' کہا جاتا ہے اپنے ناولوں کی وجہ سے ان کی بہت مخالفت ہوئی جس کے باعث انھیں مجبوراً کئی سال جلا وطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ دماغ میں بھی کچھ فتور تھا اور اس کے دورے تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد ساری عمر پڑتے رہے۔ اگرچہ ان کے بیشتر ڈراموں اور ناولوں میں آپ بیتی کا نمایاں حصہ ہے، لیکن ان کے ناول ائیسم (Einsam) کا غالب حصہ ان کے اپنے حالات پر مشتمل ہے۔ خود نوشت سوانح عمری بھی چاکر کا پوت (The Son of a Servant) کے عنوان سے لکھی تھی۔ ۱۴ مئی ۱۹۱۲ء کو سٹوک ہالم ہی میں سرطان کے مرض سے انتقال ہوا۔

۱۷ ٹالسٹائی (Leo Nikolayevich Tolstoy) مشہور مصنّف، ناول نگار، فلسفی، ایک کھاتے پیتے روسی گھرانے میں ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی سہل نگاری اور آرام پسندی کے باعث وہ تعلیم ختم نہیں کر سکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے خاندانی زمینداری کی دیکھ بھال کا مشغلہ اختیار کیا؛ لیکن چونکہ اس کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اب انھوں نے موسکو میں امیرانہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا شروع کی۔ چار پانچ برس میں اس سے بھی بددل ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں فوج میں نام لکھوا لیا، لیکن چھ برس بعد ۱۸۵۷ء میں اس سے بھی مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے ۱۸۴۷ء میں اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا؛ اسی دوران میں وہ افسانے بھی لکھنے گئے۔ ان کے سب سے اہم اور شہرہ آفاق دو ناول ہیں: جنگ اور امن (War and Peace) اور انا کارینینا Anna Karenina

حواشی

جو بجا طور پر عالمی ادب کا حصہ اور شاہکار تسلیم کر لیے گئے ہیں۔
۱۸۷۶ء کے قریب انھوں نے روحانی بے چینی محسوس کی اور عیسائیت سے اپنے اختلاف اور عدم تسکین کا اظہار کیا۔ متّی کی انجیل کے ان الفاظ: لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ (۵ : ۳۹) نے ان کی زندگی کا رخ پھیر دیا۔ انھوں نے اپنی عدم تشدّد کی تعلیم کی بنیاد اسی پر رکھی۔ آہستہ آہستہ وہ عیسائیت کی رسمی شکل سے بہت دور ہو گئے۔ اب انھوں نے گوشت، شراب، مُسکرات، تنباکو وغیرہ کے خلاف پرچار شروع کر دیا۔ کلیسیا نے بھی ان سرگرمیوں سے جل کر ۱۹۰۱ء میں انھیں اپنے حلقے سے خارج کر دیا۔ ان کی زندگی کے آخری چند برس اپنے اہلِ خاندان سے شدید اختلاف کی وجہ سے بہت ذہنی پریشانی میں گذرے۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں ان کا اپنے گاؤں یسنا پولیانا (Yasna Polyana) میں انتقال ہوا۔ مہاتما گاندھی نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان پر ٹالسٹائی کی تحریروں اور فلسفے کا بہت اثر پڑا تھا۔ ٹالسٹائی کی کتاب اعترافات (Confessions) ۱۸۷۹ء میں لکھی گئی تھی۔ تین برس بعد ۱۸۸۲ء میں انھوں نے اس پر نظرثانی کی اور ۱۸۸۴ء میں یہ پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۱۸ اناطول فرانس۔ یہ ان کا قلمی نام تھا؛ اصلی نام ژاک اناطول تھیبو (Jacques Anatole Thibaut) تھا۔ ۱۶ اپریل ۱۸۴۴ء کو پیرس میں پیدا ہوئے۔ یہ گویا کتابوں میں پیدا ہوئے کیونکہ ان کے والد کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ انھوں نے روزِ اوّل سے اپنے اردگرد کتابیں ہی دیکھیں اور اس طرح مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ افسانہ، ناول، تاریخ، نقد، انشائیہ، شعر — غرض ہر صنفِ ادب سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں ادب کا عالمی نوبل انعام پایا۔ وہ اپنے زمانے ہی میں علم و ادب کے میدان میں سند تسلیم کر لیے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں والٹیر کے بعد ان کے برابر کا کوئی صاحبِ کمال مصنف پیدا نہیں ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں وہ فرانسیسی اکاڈمی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۳ (یا ۱۲) اکتوبر ۱۹۲۴ء

کو انتقال ہوا، تو ان کا جنازہ قومی سطح پر اٹھایا گیا؛ یہ اعزاز وکٹر ہیوگو کے بعد پہلی مرتبہ انھیں کو نصیب ہوا۔

۱۹ آندرے ژید۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے حاشیہ ۳۷، خط (۹) (ص ۳۱۷)

۲۰ غزالی۔ ابو حامد محمد بن محمد الطوسی ۔ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں طوس کے مضافات کے ایک دیہات غزالہ میں پیدا ہوئے۔ امام الحرمین جوینی (ف ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء) کے شاگردوں میں تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد چندے نظام الملک طوسی (ف ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) وزیر ملک شاہ سلجوقی (ف ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کے دربار سے وابستہ رہے، اور پھر انھیں کی وساطت سے ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں نظامیہ، بغداد میں مدرّسی کا عہدہ پایا، جب کہ ان کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔ یہاں وہ تین برس تک رہے اور اس کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خانہ بدوش درویش بن گئے۔ یہ حالت کم و بیش ۴۹۹ھ/۱۱۰۵ء تک رہی۔ اس کے بعد انھوں نے نظامیہ، نیشاپور میں مدرّسی قبول کر لی۔ لیکن جلد ہی اس سے جی اُچاٹ ہو گیا اور اس سے دست بردار ہو کر اپنے وطن طُوس چلے آئے۔ یہیں ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ/ ۱۹ دسمبر ۱۱۱۱ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ متعدّد قیمتی تصنیفات ان سے یادگار ہیں۔ جن کی تعداد ۹۹ تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں احیاء العلوم الدین، سب سے زیادہ مشہور اور ضخیم ہے۔ اسلام میں ان کے سے وسیع العلم اور صاحبِ فکر و نظر بہت کم اصحاب پیدا ہوئے ہیں۔

۲۱ ابن خلدُون: اس کنیت سے دو بھائی مشہور ہیں، لیکن یہاں صاحبِ مقدمہ ولی الدین ابو زید عبدالرحمٰن بن محمد مراد ہیں۔ یہ ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء تونس میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد فاس چلے گئے تھے۔ جہاں قاضی مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد ممالکِ عربیہ کی سیاحت کرتے رہے۔ اسی دوران میں سلطان مصر برقوق نے انھیں (۸۰۱ھ/۱۳۶۹ء میں) مصر کا قاضی بنا دیا۔ تیمور لنگ کے حملۂ شام میں یہ بھی مصری فوجوں کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے وسیع علم اور گوناگوں تجربات کا نچوڑ اپنی تاریخ کے مشہور مقدّمے میں شامل کر دیا ہے، اسی کتاب کے آخر میں

اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں قاہرہ میں انتقال ہوا۔

۲۲ بابر۔ ظہیر الدین محمد نام تھا۔ یوم الجمعہ ۶ محرم ۸۸۸ھ/۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو فرغانہ میں پیدا ہوئے اور پیر کے دن ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو آگرے میں انتقال کیا۔ پہلے آرام باغ، آگرہ میں امانتہً دفن ہوئے؛ اس کے بعد لاش کابل گئی اور وہاں باغِ بابر میں دفن ہوئے۔ اب مقبرے کی حالت کچھ اچھی نہیں۔ ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے بانی بابر ہی تھے۔ ان کی خود نوشت سوانحعمری توزکِ بابری مشہور و معروف کتاب ہے۔

۲۳ جہانگیر۔ نورالدین محمد جہانگیر۔ اکبر اعظم کے سب سے بڑے بیٹے ۴ ذی القعدہ ۹۱۳ھ/ ۶ مارچ ۱۵۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ اکبر کی وفات پر ۱۶۰۵ء میں تخت پر بیٹھے اور ۲۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر سے واپس آتے ہوئے راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ لاہور کے قریب شاہدرہ میں مدفن ہے۔ ان کی کتاب توزکِ جہانگیری شائع شدہ موجود ہے۔

۲۴ ملّا عبدالقادر بدایونی۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کی نسل میں ملوک شاہ کے بیٹے، ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ/۲۱ اگست ۱۵۴۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ متعدد علمائے عصر سے تعلیم پائی، جن میں ملّا مبارک ناگوری (والدِ فیضی و ابوالفضل) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ شروع میں حسین خان حاکمِ بدایوں کی ملازمت میں رہے، اور بالآخر ۹۸۱ھ/۱۵۷۴ء میں جلال خان قورچی کی سفارش پر اکبر کے دربار میں پہنچے۔ یہاں تالیف و ترجمہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ رامائن، مہابھارت، اتھرو وید اور متعدد اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، قادری تخلص تھا۔ ان کی سب سے مشہور اور مفید کتاب منتخب التواریخ (۳ جلد) ہے، جو تاریخِ بدایونی بھی کہلاتی ہے۔ اس میں اسلامی عہد کے ہندوستان کے حالات ابتدا سے لے کر اکبر کے زمانے تک قلم بند کیے ہیں۔ اسی میں جستہ جستہ اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں انتقال ہوا۔ بدایوں کے باہر جانبِ شرق عطاپور گانو میں مدفن ہے۔ (تذکرۃ الواصلین: ۲۰۷ - ۲۲۰؛ دربارِ اکبری: ۴۷۲ - ۵۲۱؛

مآثرالکرام، ۱ : ۳۹ - ۴۰ ؛ خزانۂ عامرہ : ۲۲۳-۲۲۴)

۱۸۷ ۲۵ یہ لفظ متن میں نہیں ہے، لیکن سیاق وسباق اس کا مقتضی ہے، اس لیے اضافہ کیا گیا ہے۔

۲۶ پہلے ایڈیشن میں یہاں بھی ایجو تھا۔

۲۷ فارابی یعنی ابونصر محمد بن محمد بن ترخان الفارابی۔ تقریباً ۸۷۰ء میں فاراب میں پیدا ہوئے۔ نسل کے ترک تھے۔ خراسان اور بغداد میں عمر کا طویل زمانہ بسر کیا؛ اس کے بعد سیف الدولہ بن حمدان حلبی کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ فلاسفۂ اسلام میں ان کا شمار ہوتا ہے اور معلمِ ثانی کے لقب سے مشہور ہیں۔ عربی کے علاوہ یونانی اور بعض دوسری زبانیں بھی جانتے تھے۔ فلسفے کے موضوع پر بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ دمشق میں ۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔ (اعلام، ۷ : ۲۴۲) مزید حالات، وفیات الاعیان، ۲ : ۷۶ ؛ تاریخ حکماء الاسلام : ۳۰ ؛ البدایہ والنہایہ، ۱۱ : ۲۲۴ ؛ اخبار الحکما : ۱۸۲ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۸۸ ۲۸ ابن رشد۔ ابوالولید محمد بن نصر بن محمد بن رُشد ۱۱۲۶ء میں قرطبہ (اسپین) میں پیدا ہوئے۔ سلاطین الموحدین کے دربار سے وابستہ تھے۔ فلسفی، ہیئت دان، طبیب، فقیہ کی حیثیت سے بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انھیں کے مصنفات کے تراجم سے یہ علوم یورپ میں رائج ہوئے۔ ارسطو کی کتاب الحیوان کی شرح لکھی تھی۔ پہلے اشبیلیہ میں اور اس کے بعد قرطبہ میں قاضی رہے۔ قرطبہ ہی میں ۱۱۹۸ء میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

۲۹ طبع اول میں یہاں بھی 'ایجو' ہی تھا۔

خط ۱۸

۱۸۹ ۱ غالب کا مصرع ہے (دیوان غالب : ۴۵)۔ پورا شعر ہے :

تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں ۔۔۔ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

حواشی

۲ — یہ شعر بھی غالب ہی کا ہے (کلیاتِ غالب (فارسی) : ۴۹۱)

۳ — سیّد محمود۔ کانگریس کے پُرانے اور مشہور لیڈر؛ ۱۸۸۹ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم علی گڑھ، لندن اور کیمبرج میں پائی، چندے جرمنی میں بھی رہے۔ مدتوں بہار میں وکالت کی۔ اس کے بعد راجیہ سبھا کے رُکن رہے۔ چند کتابیں بھی انگریزی میں لکھی تھیں۔ طویل علالت کے بعد ولنگڈن اسپتال، نئی دلّی میں ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال کیا اور دلّی دروازہ، دلّی کے باہر مشہور قبرستان مہندیان، میں سپردِ خاک ہوئے۔

۴ — ابوالفیض فیضی کا مصرع ہے (شعرالعجم، ۳ : ۶۹؛ کلیاتِ فیضی : ۳۳۶) شعر ہے :

خاک بیزانِ رہِ فقر بجاے نروند   گویی، این طائفہ اینجا گہرے یافتہ اند

۵ — اس کا پہلا مصرع ہے : شربنا و اهرقنا علی الارض فضلة

یہ شعر متعدد کتابوں میں ملتا ہے مثلاً فیہ ما فیہ : ۷۰؛ مکاتیبِ سنائی : ۴؛ جمهرة الامثال، ۲ : ۱۶۶؛ احیاء علوم الدین، ۴ : ۱۷ وغیرہ۔ لیکن شاعر کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔

۶ — دیوان حافظ : ۲۲۲

۱۹۰ — ۷ — امیر مینائی کا مصرع ہے (مراۃ الغیب : ۱۹۱) ٹھیک پورا شعر یوں ہے :

کہاں تک آیینے میں دیکھ بھال ادھر دیکھو
کہ اک نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں

۸ — دیوانِ غالب : ۲۱۸۔ دوسرے مصرعے میں 'کھنچتا' کی جگہ صحیح 'کھچتا' ہے۔

۹ — نظیری کا مصرع ہے (دیوان نظیری : ۳۲۴) پورا شعر ہے :

بمحشر ہر کس وکارے و ہر بارے و بازارے
من و آہوے صحرائی کہ دایم می رمید از من

۱۹۱ — ۱۰ — میر تقی میر کا مصرع ہے (کلیاتِ میر، دیوان اول ۲۰۲) پورا شعر ہے :

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے　　کہ میاں! خوش رہو، ہم دعا کر چلے

صفحہ	حاشیہ	متن
	۱۱	حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۳۱۳) مصرعِ اولیٰ ہے: صوفی! پیالہ پیما، ساقی! قرابہ پُر کن
	۱۲	دیوان غالب: ۲۴۲۔ پورا شعر ہے: ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے
	۱۳	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ: ۳۲۷) لیکن 'عام' کی جگہ 'عشق' چاہیے۔ پہلا مصرع ہے: شہریست پُر ظریفاں و ز ہر طرف نگارے
۱۹۲	۱۴	دیوان حافظ: ۲۸۴۔ پہلا مصرع ہے: در حقِ من لبت ایں لطف کہ می فرماید
	۱۵	دیوان نظیری: ۱۴۸۔ مصرع اولیٰ ہے: ز مہرِ بلہوس گردِ دلت عاشق نمی گردد
	۱۶	کلیاتِ صائب: ۵۰۳
۱۹۳	۱۷	مولانا شبلی نعمانی کی مثنوی صبحِ امید کا شعر ہے؛ دیکھیے کلیاتِ شبلی (اردو): ۷
	۱۸	سودا کا مصرع ہے (کلیاتِ سودا، ۱: ۲۰۷) مصرع اولیٰ ہے: گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
	۱۹	کلیاتِ مومن، ۲: ۶۳۔ مصرع اول صحیح یوں ہے: محتسب! آپ کے آنے سے ہوئے دَیر خراب
	۲۰	دیکھیے اوپر حاشیہ (۱۰) متعلقہ صفحہ ۱۹۱۔ صحیح مصرع 'کہ میاں! خوش رہو، ہم صدا کر چلے'، ہے۔
۱۹۴	۲۱	غالب کا مصرع ہے، جس کا فعل موقع کی مناسبت سے حال کی جگہ ماضی کر دیا گیا ہے (دیوان غالب: ۲۳۶) پورا شعر ہے: آمدِ بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج　　اُڑتی سی اک خبر ہے، زبانی طیور کی

	۲۲	سلمان ساوجی کا مصرع ہے (دیوان: ۱)۔ مصرع الٹ گیا ہے۔ پورا شعر ہے: بہارِ عالمِ حسنت دل وجاں تازہ می دارد برنگ اصحابِ صورت را، بہ بُو اربابِ معنیٰ را
	۲۳	ناسخ کا مصرع ہے (دیوان ناسخ دوم: ۱۷۱) لیکن صحیح 'دل کے' کی جگہ 'میرے' ہے۔ پورا شعر ہے: بھول کر، او چاند کے ٹکڑے! اِدھر آجا کبھی میرے ویرانے میں بھی ہوجائے دم بھر چاندنی
	۲۴	دیوان حافظ: ۱۰۱ متن میں سہوِ کتابت سے 'کند' کا لفظ ساقط ہوگیا تھا؛ پہلے ایڈیشن میں ٹھیک چھپا تھا۔
	۲۵	دیوان حافظ: ۳۲۸۔ اب اس شعر میں اتنی تبدیلی ہوگئی ہے کہ اسے مولانا کا اپنا ہی کہنا چاہیے۔ حافظ کا شعر یوں تھا: جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانے دگر ست تو تمنّا زِ گلِ کوزہ گراں میداری
۱۹۵	۲۶	دیوان حافظ: ۱۴۴
	۲۷	سہوِ کتابت سے ایک 'تین' ساقط ہوگیا تھا؛ طبعِ اول سے اضافہ کیا گیا۔
	۲۸	کلیاتِ غالب: ۴۹۲
	۲۹	Mess: اصلی معنی تو غالباً 'خوراک' کے تھے، لیکن اب اس جگہ کے لیے بھی کہتے ہیں، جہاں فوجی یا جہازی لوگ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔
۱۹۶	۳۰	یہ گویا مولانا مرحوم کا اپنا شعر ہے۔
	۳۱	آصف علی دلّی کے مشہور وکیل اور کانگریسی لیڈر؛ یہ بھی اس زمانے میں کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ اور اسی لیے نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ نظم و نثر دونوں لکھتے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ "ارمغانِ آصف" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک کتاب "پرچھائیاں"

بھی چھپ چکی ہے۔ کچھ مسوّدات ہنوز غیر مطبوعہ پڑے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے سفیر ہو کر سوئٹزرلینڈ بھیجے گئے تھے؛ بعمر ۶۴ سال ۲ اپریل ۱۹۵۳ء کو بعارضۂ قلب وہیں برن میں انتقال ہوا۔ لاش دلّی آئی اور بستی نظام الدین (ویسٹ) میں سپردِ خاک ہوئی۔

۳۲ — مولانا مرحوم یہ لفظ ہمیشہ 'ڈ' سے یعنی ڈسمبر لکھتے تھے؛ چنانچہ طبع اول میں ڈسمبر ہی چھپا تھا۔ طبع ثالث (یعنی متن) میں دسمبر (دال کے ساتھ) چھپا ہے؛ یہ غالباً کاتب کا تصرف ہے، اسی لیے یہاں 'ڈ' سے لکھا جا رہا ہے۔ اور سب جگہ بھی 'ڈسمبر' بنا دیا گیا ہے۔

۳۳ — دیوانِ حافظ: ۱۵۴-۱۵۵

۱۹۷ — ۳۴ — نورالدین ترخان کا شعر ہے (روزِ روشن: ۱۳۰) تذکرے کی روایت کے مطابق مصرعِ اولیٰ میں 'وصلش' کی جگہ 'وصلت' اور مصرعِ ثانی میں 'شکستہ' کی جگہ 'کشیدہ' ہونا چاہیے۔

۳۵ — کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوانِ کلیم: ۱۴۵)

۳۶ — کلیاتِ آتش: ۲۹۹

۱۹۸ — ۳۷ — دیوانِ غالب: ۵۰۔ پہلا مصرع ہے:

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے۔

۳۸ — اکبر الہٰ آبادی کا مصرع ہے (کلیات، ۳: ۳۵۲) پورا شعر ہے:

بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی
گذر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

۳۹ — صائب تبریزی کا مصرع ہے (کلیات: ۷۱) پورا شعر ہے:

دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد
کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا

۱۹۹ — ۴۰ — میر رضی دانش مشہدی کا شعر ہے (شعر العجم ۲: ۱۶۸)

	۴۱	حضرت امیر خسرو کا شعر ہے (ایضاً)
	۴۲	یہ مصرع خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے (دیوان حالی : ۱۱۰؛ کلیاتِ نظمِ حالی، ۱:۱۵۴) مطلع ہے :
		اہلِ معنی کو، ہے لازم سخن آرائی بھی بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی
		مرحوم نے موقع کی مناسبت سے فعل کو ماضی کر لیا ہے۔
۲۰۰	۴۳	ظہوری ترشیزی کا شعر ہے (دیوان ملّا نورالدین ظہوری : ۱۱۳) دیوان میں پوری غزل 'ماندست' چھپی ہے (بغیر ہائے ہوز)
	۴۴	کلیم کاشانی کا شعر ہے، دیکھیے، دیوان کلیم : ۲۶۸
	۴۵	دیکھیے، سروآزاد : ۱۴۷
۲۰۱	۴۶	دیوان کلیم : ۱۴۴۔ مطبوعہ دیوان میں 'روپس' کی جگہ 'روِشں' ملتا ہے۔ دونوں ٹھیک ہو سکتے ہیں۔
	۴۷	سب اشاعتوں میں یہاں لفظ 'پیار' ملتا ہے؛ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ سیاق سے ظاہر ہے کہ ٹھیک 'پیالہ' ہوگا۔
	۴۸	دیوان غالب : ۱۶۰۔ مصرع اولیٰ ہے : مےِ عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے
۲۰۲	۴۹	ایضاً : ۱۶۲۔ پہلا مصرع ہے : ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پہ مرنا
	۵۰	طبع اول میں 'سرخ مرچ' تھا؛ بعد کو 'سرخ' حذف کر دیا۔
	۵۱	یہ ضرب المثل مصرع میرزا عبدالقادر بیدل کا ہے (کلیات، ۱ : ۲۷۵)۔ پورا شعر ہے : عنقا سروبرگیم، مپرس از فقرا ہیچ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

صفحہ	حاشیہ	
۲۰۲	۵۲	دیوان حافظ : ۱۶۶۔ صحیح 'بار' کی جگہ 'بارہ' ہے۔
	۵۳	دیوان حافظ : ۱۲۴۔ مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی میں 'زبلبل' کے بجائے 'بہ بلبل' ہے؛ اور 'کے' کی جگہ 'کہ' ؛ اور یہی درست ہے
	۵۴	دیوان حافظ : ۱۱۰
۲۰۴	۵۵	ایضاً : ۱۱۲۔ دوسرے مصرع میں 'درآں' کی جگہ ٹھیک 'برآں' ہے۔
	۵۶	ایضاً : ۳۳۸
	۵۷	ایضاً : ۱۲۷
	۵۸	یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ جہانگیر نے اپنی توزک میں کوئل سے متعلق بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں (توزک جہانگیری : ۲۲۶)
۲۰۵	۵۹	دیوان حافظ : ۲۱۸۔ البتہ کچھ خفیف لفظی تغیر ہوگیا ہے۔ پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں 'بشاخ' کی بجائے 'زشاخ' صحیح ہے۔ دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں 'تحقیق' کی جگہ 'توحید' ہونا چاہیے۔
۲۰۶	۶۰	ایضاً : ۱۴۶۔ مطبوعہ نسخے میں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں 'نائے و نوش' کی جگہ 'ناز و نوش' ملتا ہے؛ یہ سہو کتابت ہوگا۔
	۶۱	متن میں سہو کتابت سے 'یہ' چھپا تھا، طبعِ اول سے تصحیح کی گئی۔
	۶۲	دیوان حافظ : ۲۳۶
۲۰۷	۶۳	فیضی کا شعر ہے، دیکھیے شعر العجم، ۳ : ۳۹ (بعض جگہ دوسرے مصرعے میں 'بخطۂ' کی جگہ 'بعرصۂ' بھی ملتا ہے) پہلے مصرع میں 'می کشد' کی جگہ ٹھیک 'می کند' ہے۔
۲۰۸	۶۴	ان میں سے تیسرا اور چوتھا شعر کامل مبرد (ص ۵۰۴) اور کتاب الحیوان (۳ : ۲۰۱) میں نصیب بن رباح سے اور الشریشی کی شرح مقامات (۱ : ۱۴) میں عدی بن الرقاع کی طرف منسوب ہیں۔ گمانِ غالب ہے کہ چاروں شعر عدی بن الرقاع کے ہیں۔

—— :: ——

۲۰۹

۱ امیر مینائیؔ کا شعر ہے (صنم خانۂ عشق : ۲۲۴)

۲ یہ فردوسی طوسی کا مصرع ہے ؛ شاہنامے میں داستانِ سہراب کا مطلع ہے :

کنوں رزمِ سہراب و رستم شنو
دگر ہا شنیدستی ، ایں ہم شنو

۳ بالی گنج کا ذکر اس لیے کیا کہ اس علاقے میں، مولانا مرحوم کا سکونتی مکان تھا؛ دسمبر ۱۹۷۱ء، بالی گنج، سرکلر روڈ، کلکتہ ' پتا تھا۔

۴ دیوان غالب : ۱۷۷

۲۱۰

۵ Table = میز

۶ Jug = آفتابہ

۷ ارشمیدس۔ سرقوس (صقلیہ) کا رہنے والا مشہور ریاضی دان، اس کی ایجادات شہرۂ آفاق ہیں۔ اس نے شیشے کی ایک ایسی مشین ایجاد کی تھی جس سے اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتی تھی۔ سونے میں کھوٹ معلوم کرنے کا طریقہ بھی اس نے بتایا۔ اس کا یہ قول بہت معروف ہے کہ "مجھے کھڑا ہونے کی جگہ مل جائے، تو میں زمین کو ہلا کے رکھ دوں"۔ اس کی موت ۲۱۲ ق، م میں رومنوں کے سرقوس پر حملے کے دوران میں ہوئی۔

۲۱۱

۸ اس مصرع سے متعلق مشہور ہے کہ یہ فردوسی کے شاہنامے کا ہے، لیکن ولور (Vellur) ایڈیشن میں لکھا ہے کہ یہ شعر ہی سرے سے الحاقی ہے۔ اس کے لفظ ہیں : ایں بیت بدونِ شک الحاقی است (۲ : ۶۸۲) پہلے مصرع کی روایت میں بھی اختلاف ہے۔ ویلور کے حواشی میں ہے : چو فردا برآید بلند آفتاب۔ دہخدا کے ہاں ہے : بخویم برایں کینہ آرام و خواب (امثال و حکم ۴ : ۱۷۵۱) عام طور پر پیش مصرع یوں ملتا ہے : وگرنہ بکامِ من آید جواب (تذکرۃ الشعرا دولت شاہ سمرقندی : ۶۱ ؛

صفحہ	نمبر	
		چہار مقالہ : ۷۵)
	۹	دیوان حافظ : ۱۹۳
	۱۰	شاہنامہ ، ۶۸۰۱ ۔ ردیف کنیم چاہیے ۔
۲۱۲	۱۱	شاہنامے کے اس مقام کا شعر ہے، جب سکندر قیدافہٗ اندلس کے دربار میں جاتا ہے ۔
۲۱۳	۱۲	یہ شعر غلط طور پر میر کے نام سے مشہور ہو گیا ہے اور پہلے مصرع کے کچھ لفظ بھی بدل گئے ہیں ۔ یہ شعر دراصل نواب محمد یار خاں امیر کا ہے (طبقات الشعراء شوق) اور پہلا مصرع یوں ہے ۔ شکست و فتح میاں ! اتفاق ہے، لیکن
	۱۳	اصلی متن میں سہوِ کتابت کے نتیجے میں یہاں 'سارہ' چھپا ہے ۔ پہلے ایڈیشن میں ٹھیک 'سارا' ہی ہے ۔
	۱۴	طبع اول میں چھپا تھا : حادثہ پیش ہی نہیں آیا ۔
	۱۵	معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کا شعر ہے، لیکن اس کا پہلا مصرع ہے 'خمیر مایۂ دکان شیشہ گر سنگست' (بہترین اشعار: ۹۰۸)
	۱۶	سعدی شیرازی کا مصرع ہے (کلیاتِ سعدی : ۳۷۳) پورا شعر ہے : بخشم رفتۂ ، مارا کہ می برد پیغام بیا کہ ما سپر انداختیم، اگر جنگ است
۲۱۴	۱۷	خواجہ فریدالدین عطارؒ کا مصرع ہے؛ دیکھیے : منطق الطیر : ۹۴ ۔ پورا شعر ہے : خرقہ را زُنّار کردہ است و کند عشق ازیں بسیار کردہ است و کند بعض جگہ 'خرقہ با زنار' بھی ملتا ہے؛ 'خرقہ را زنار' بہتر ہے ۔
۲۱۵	۱۸	کلیاتِ عرفی (اضافات) : ۲۹ ۔ مطبوعہ نسخے میں 'قادم' کی جگہ 'کشایم' ملتا ہے ۔
	۱۹	دیوان نظیری : ۳۹ ۔ بعض نسخوں میں 'حور و جنت' کی جگہ 'حورِ جنت' اور مصرع ثانی کے آخری ٹکڑے کی جگہ 'در شور آورد دیوانہ را' ملتا ہے ۔

۲۰ — دیوانِ وحشی بافقی : ۳۶

۲۱۶

۲۱ — دیوان نظیری : ۶۶

۲۲ — دیوان ملّا نورالدین ظہوری : ۶۸

۲۳ — شرف جہاں قزوینی کا شعر ہے (خزانۂ عامرہ : ۲۶ ؛ نیز شعر العجم ۲ : ۱۸) دونوں جگہ مصرعِ ثانی میں 'ما' کی جگہ 'من' ہے؛ اور یہی ٹھیک ہے۔

۲۱۷

۲۴ — میرزا عبدالقادر بیدل کا شعر ہے (کلیات بیدل، ۱ : ۱۲)

۲۵ — کلیات غالب : ۳۶۳

۲۶ — خواجہ حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ، ۱۴۴) مصرعِ اولیٰ ہے :

شراب و عیش نہاں چیست، کارِ بے بنیاد

۲۷ — پورا شعر ہے :

تا سر ندہم، پا نکشم از سرِ کویش
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

معلوم نہیں کس کا شعر ہے۔

۲۱۸

۲۸ — سید علی محمد شاد عظیم آبادی کا شعر ہے (میخانۂ الہام : ۲۷۷؛ کلیات شاد، ۲ : ۱۸۴) مصرعِ ثانی کی ایک روایت یہ بھی ہے : جو خود بڑھ کر

۲۹ — داغ دہلوی کا مصرع ہے (آفتابِ داغ : ۴۴)۔ مطلع ہے :

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

۲۱۹

۳۰ — متن میں نام 'عالیہ' چھپا ہے؛ ٹھیک 'عُلَیّہ' ہے، اس لیے اصلاح کر دی گئی۔ یہ شعر عُلَیّہ کے نام سے الاغانی (۱۰ : ۱۷۶) میں ملتا ہے۔

۳۱ — متنبّی کا شعر ہے (دیوان ابی الطیب المتنبّی : ۳۶۱)

۲۲۰

۳۲ — شیخ شیرازی کا شعر ہے (کلیاتِ سعدی : ۶۱۴)

۳۳ — متن میں 'میرے بغل' چھپا تھا، طبعِ اول میں بھی اسی طرح تھا۔ یہ یقیناً سہوِ کتابت ہے'

		کیونکہ 'بغل' بالاتفاق مؤنث ہے، اس لیے متن میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ مثلاً اسیر کا شعر ہے: لحد میں سوئے حسینوں کی لے کے تصویریں پری وشوں سے نہ خالی بغل زمیں میں رہی
	۳۴	دیوان وحشی بافقی : ۲۵
	۳۵	دیوان نظیری نیشاپوری : ۲۶۔ صحیح مصرع اول میں 'وفا' کی جگہ 'ادب' ہے۔

خط ۲۰

۲۲۲	۱	منطق الطّیر، حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ کی مشہور کتاب ہے، جس میں پرندوں کی زبان سے حکمت و الٰہیات کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔
۲۲۳	۲	کلیاتِ مومن، ۱ : ۳۸۳۔ مصرع اول صحیح یوں ہے: جولاں سے ہے اس کو قصدِ پامال
	۳	دیکھیے، منتخب التواریخ، ۳ : ۱۸۰
	۴	کلیاتِ سودا، دیوان اول : ۱۰۲
	۵	گلستاں (باب اوّل) کا شعر ہے (کلیاتِ سعدی : ۲۵) مطبوعہ نسخے میں 'نازت' کی جگہ 'بارت' ہے؛ اور غالباً یہی درست بھی ہوگا۔
۲۲۴	۶	دیوان وحشی بافقی : ۵۸۔ مصرع ثانی میں صحیح 'نہ شد' کی جگہ 'نہ بود' ہے۔
	۷	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ : ۲۸)؛ پورا شعر ہے۔ بزیرِ دلقِ ملمّع کمندہا دارند درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں
۲۲۵	۸	انگریزی مس (Miss) اور فرانسیسی ماڈموازیل (Mademoiselle)، کے ایک ہی معنی ہیں یعنی دوشیزہ۔
	۹	مادام (Madame) فرانسیسی)، میڈم (Madam) (انگریزی)، میم (اردو)

		= شادی شدہ عورت ۔ خاتون
	۱۰	عرفی کا مصرع ہے (کلیات عرفی : ۲۸۹)۔ پہلا مصرع ہے : گو ادب چشم مرا باز مپوش از رُخِ دوست
	۱۱	دیوان وحشی بافقی : ۲۷
۲۲۶	۱۲	زکی ہمدانی کا شعر ہے، دیکھیے خریطۂ جواہر : ۱۱۲
	۱۳	حسن سجزی دہلوی کا مصرع ہے (دیوان حسن سجزی دہلوی : ۲۵۲) پورا شعر ہے : از حسن ایں چہ سوالست کہ معشوقِ تو کیست؟ ایں سخن را چہ جوابست، تو ہم میدانی !
	۱۴	کلیات صائب میں یہ شعر نہیں ملا۔ البتہ خریطۂ جواہر : ۱۳۸؛ شمعِ انجمن : ۳۷۳ میں یہ فصیحی ہروی سے منسوب ہے۔ مولانا مرحوم کو سہو ہوا۔ شمعِ انجمن میں مصرعِ اول میں 'زدم' کی جگہ 'زدیم' ہے۔
	۱۵	کلیات غالب : ۳۷۲
۲۲۷	۱۶	طبع اول : دہنے
	۱۷	دیوان قاآنی : ۳۲۲
	۱۸	گلستاں کے دیباچے کا مصرع ہے (کلیاتِ سعدی : ۲) پورا قطعہ ہے : اے مرغِ سحر! عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد ایں مدعیاں در طلبش بیخبرانند کانرا کہ خبر شد، خبرے باز نیامد
	۱۹	اقبال کا شعر ہے (زبورِ عجم : ۱۰۱)۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے اقبال سے درخواست کی تھی کہ مرقّع (وصل کا ماہانہ رسالہ) کے سرِ ورق پر چھاپنے کے لیے کوئی شعر عنایت فرمائیے۔ اس پر اقبال نے انھیں یہ شعر لکھ بھیجا تھا؛ چنانچہ تین برس تک یہ مرقّع کے سرِ لوح چھپتا رہا۔
۲۲۸	۲۰	ظہوری ترشیزی کا شعر ہے (دیوان : ۴۶)
	۲۱	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ : ۱۱۲) پہلا مصرع ہے :

رسم عاشق کشی و شیوۂ شہر آشوبی

۲۲ — قرآن، سورۃ النسآء ۴ : ۴۳ (اگر تمھیں وضو کے لیے پانی میسر نہ آئے) تو پاک مٹی ہی سے یہ قصد کرو۔

۲۳ — غالب کا مصرع ہے (دیوان غالب : ۱۲۹) پہلا مصرع ہے :

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

۲۴ — استاد ذوق کا مصرع ہے (دیوان ذوق (مرتبۂ آزاد): ۲۲۹) مطلع ہے :

زباں پیدا کروں جوں آسیا، سینہ میں پیکاں سے

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

۲۲۹ | ۲۵ — یہ عنوان ہے گلستاں کے باب ہفتم کی آخری حکایت کا (کلیاتِ سعدی : ۱۱۷)

۲۶ — پورا قطعہ کلیات سعدی (۱۲۱) میں موجود ہے :

او در من و من در و فتادہ — خلق از پے ما دوان و خنداں

انگشتِ تعجبِ جہانے — از گفت و شنیدِ ما بدنداں

۲۷ — بتغیر الفاظ داغ کا مصرع ہے (یادگار داغ : ۱۱۲) پورا شعر ہے :

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

دل کو تھاما، ان کا دامن تھام کے

۲۸ — آصفی ہروی کا مصرع ہے (امثال و حکم : ۲ : ۸۶۸) پورا شعر ہے :

نہ بخت دُردِ مے و محتسب ز دیر گذشت

رسیدہ بود بلائے، و لے بخیر گذشت

۲۳۰ | ۲۹ — دیوان نظیری : ۲۹۳

۲۳۲ | ۳۰ — دیوان کلیم : ۲۴۱

۳۱ — دیوان حافظ : ۲۴۱

۳۲ — علی قلی بیگ انیسی شاملو کا شعر ہے (شمع انجمن : ۲۶)

۲۳۳ | ۳۳ — دیوان حافظ : ۲۷

خط ۲۱

۲۳۴	۱	شریف تبریزی کا شعر ہے (شمع انجمن : ۲۱۶) مولانا نے حسبِ ضرورت دونوں مصرعوں میں تصرّف کرلیا ہے؛ تذکرے میں شعر یوں ہے : آنچہ دل را بیم آں می سوخت دردِ ہجر بود آخر از ناسازیِ جاناں باآں ہم ساختم خریطۂ جواہر میں شاعر کا تخلص شریفی لکھا ہے (ص ۱۱۸) اور مصرع ثانی میں 'جاناں' کی جگہ 'گردوں' ہی ہے، جو مولانا کی روایت ہے ۔
	۲	کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان : ۱۰) ٹھیک شعر یوں ہے : دماغ بر فلک و دل بزیرِ پاے بتاں زمن چہ می طلبی، دل کجا، دماغ کجا!
۲۳۵	۳	فیضی کا مصرع ہے (شعر العجم، ۳ : ۷۰)۔ پورا شعر ہے : کس نمی گویدم از منزلِ اوّل خبرے صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است بعض جگہ مصرعِ اوّل میں 'اوّل' کی جگہ 'آخر' بھی چھپا ملتا ہے ۔
	۴	مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بیگم کا اسمِ گرامی ۔
۲۳۶	۵	صبری اصفہانی کا مصرع ہے (بہترین اشعار : ۲۹۴) پورا شعر ہے : از ما مپرس حالِ دلِ ما کہ یک زماں خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم
۲۳۹	۶	شیخ علی حزیں کا شعر ہے (کلیات حزیں : ۳۴۰) کلیات میں مصرع ثانی میں 'پشمینہ' کی جگہ 'صد پارہ' ہے ؛ اور یہی درست ہے کیونکہ قافیہ 'نظارہ' 'خارہ' وغیرہ ہے ۔
۲۴۰	۷	پورا شعر پہلے گذر چکا ہے (ص ۴۳) :

نہ داغِ تازہ می کارد، نہ زخمِ کہنہ می خارد
مدہ یارب! دلے کیں صورت بیجاں نمی خواہم

۲۴۱	۸	یہ اوس بن حجر کے اس مرثیے کا مصرع ہے جو اُس نے فُضالہ بن کلدہ کی موت پر لکھا تھا: (دیوان اوس بن حجر: رقم ۲۰؛ نیز الحماسۃ البصریہ، ۱: ۲۵۴)۔ ٹھیک شعر یوں ہے:

ایتہا النفس اجملی جزعا
إن ما تحذرین قد وقعا

	۹	'غبارِ خاطر' کی تمام اشاعتوں میں یہاں 'چھبّیس' چھپا ملتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہاں 'چھتیس' چاہیے۔ چنانچہ متن میں درستی کردی گئی ہے۔ یہ یقیناً پہلے کاتب کی غلطی تھی، جو بعد کی اشاعتوں میں نقل ہوتی رہی۔
	۱۰	فیضی کا شعر ہے (شعر العجم، ۳: ۶۹)
	۱۱	متمم بن نویرہ کے حالات کے لیے دیکھیے: الاغانی، ۱۴: ۶۳؛ الشعر والشعراء: ۲۹۶؛ الاصابہ: ۷۶۹۰، ۱۱۷۷۔
۲۴۲	۱۲	یہ شعر ان کتابوں میں ملتے ہیں: الحماسۃ البصریۃ ۱: ۲۱۰؛ الحماسۃ للبحتری: ۲۸۵؛ الحماسۃ لأبی تمام ۲: ۱۴۸؛ العقد الفرید، ۲: ۱۷۱؛ نہایۃ الأرب ۵: ۱۷۷، اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ التبریزی نے لکھا ہے کہ یہ قطعہ متمم بن نویرہ کا نہیں، بلکہ ابن جذل الطعان کا ہے۔
	۱۳	کلیات سودا، دیوان اول: ۱۲۱

خط ۲۱

۲۴۳	۱	دیوان حافظ: ۱۱۱۔ اصلی نسخے میں 'قاصدے' کی جگہ 'محرمے' ہے۔
	۲	یہ حکیم محمد سمیع ذرّہ لکھنوی عرف میرزا بچھو خلف محمد شفیع اکبر آبادی کی رباعی ہے، جو لکھنؤ میں شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم اور شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔

(سفینۂ ہندی : ۷۹ ۔ ۸۰ ؛ شمعِ انجمن : ۱۶۰ ۔ ۱۶۱) اس رباعی کا انتساب سرمد یا کسی اور کی طرف درست نہیں۔ روزِ روشن (ص ۲۱۱) میں یہ رباعی محمد اکبر خاں دانا دہلوی کے نام سے درج ہے؛ یہ بھی غلط ہے۔

یہاں متن 'سفینۂ ہندی' کے مطابق ہے؛ شمعِ انجمن میں پہلے مصرعے میں 'گرما' اور دوسرے میں 'سرما' ہے؛ اور تیسرے مصرع میں 'تمام سرد و گرم' کی جگہ 'ہزار گرم و سرد' ہے۔

	۳	Warder = قید خانے کا داروغہ
۲۴۴	۴	کلیم کاشانی کا شعر ہے۔ (دیوان کلیم : ۲۶۸)
	۵	یہ بھی کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان : ۱۲۵)
	۶	دیوان غالب : ۱۷۰
۲۴۵	۷	حاجی محمد جان قدسی کا شعر ہے (دیکھیے، کلمات الشعرا : ۹۲)
	۸	پورا شعر ہے : نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہے کس کا !
	۹	طبع اول : سر سے پا تک
۲۴۶	۱۰	کلیات عرفی : ۳۷۷
	۱۱	میر غالب علی خان سیّد کا شعر ہے (دیکھیے، گلشن بیخار : ۱۰۶)
	۱۲	ملّا نور محمد انور لاہوری کا شعر ہے (میخانہ : ۵۶۳ ؛ روزِ روشن : ۸۰) پہلے مصرع میں تفاوت ہے؛ صحیح یوں ہے : دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش ست۔
۲۴۷	۱۳	قرآن، سورۃ الرعد ۱۳ : ۱۷

خط ۲۳

۲۴۸	۱	ابو العلاء المعرّی کا قطعہ ہے (دیکھیے، شروح سقط الزند : ۲ : ۱ : ۳۵۰)

	۲	مصحفی کا مصرع ہے (جواہر سخن (۲) : ۶۴۱) پورا شعر ٹھیک یوں ہے : سراغِ قافلۂ اشک لیجیے کیونکر نکل گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے اس سلسلے میں دیکھیے خط (۲) حاشیہ (۱)
	۳	دیوان کلیم : ۱۴۰۔ پہلے شعر کا مصرعِ ثانی یوں ہے : گویم کلیم! با تو کہ آنہم چساں گذشت دوسرے شعر میں زین وآں' کی جگہ' از جہاں' ہے۔
	۴	سورۃ النازعات ۷۹ : ۴۶
	۵	غزالی مشہدی کا شعر ہے (منتخب التواریخ، ۳ : ۱۷۱؛ نیز طبقاتِ اکبری، ۲ : ۴۸۴؛ آئینِ اکبری (ص ۱۹۶) میں مصرع یوں ہے : شورے شدہ، از خوابِ عدم چشم کشودیم بدایونی نے مصرع اولیٰ میں' چشم' کی جگہ' دیدہ' لکھا ہے، اور یہی بہتر ہے۔
	۶	کلیات بیدل (۱) : ۶۱۰

خط ۲۴

۲۵۱	۱	دیوان حافظ : ۲۰۷
	۲	دیوان غالب : ۸۰
۲۵۲	۳	منڈل سون سے فیلکس منڈل سون مراد ہیں، مشہور جرمن نغمہ نگار اور موسیقار ہیں؛ ۳ فروری ۱۸۰۹ء کو جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں پیدا ہوئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ مشہور یہودی فلسفی اور یہودیت کے مفسّر اور شارحِ پنج اسفارِ موسیٰ اور زبور کے مترجم موسیٰ منڈل سون کے پوتے تھے، جنھیں وفات (۴ جنوری ۱۷۸۶ء) پر 'جرمنی کا سقراط' کہا گیا تھا۔ فیلکس اپنے زمانے کے مشہور ترین نغمہ نگاروں میں سے تھے۔ انھوں نے بارہ برس کی عمر میں اپنا پہلا نغمہ لکھا اور وفات پر تقریباً دو ہزار

نغمے اپنی یادگار چھوڑے ۔ ۴ نومبر ۱۸۴۷ء کو جرمنی کے شہر لائپزگ میں انتقال ہوا۔

۴ | دیوانِ حافظ : ۱۰۲

۵ | ایضاً : ۱۱۰

۶ | مولانا شبلی نعمانی کا شعر ہے (کلیات : ۹۸) ٹھیک یوں ہے :

یا جگر کاویِ آں نشترِ مژگاں کم شد
یا کہ خود زخمِ مرا لذتِ آزار نماند

۷ | مشہور عالمگیری امیر؛ اصلی نام فقیر اللہ ہی تھا، سیف خاں لقب تھا۔ سنسکرت کی فنِ موسیقی کی مشہور کتاب "مانک سوہل" کا ترجمہ "راگ درپن" کے نام سے کیا اور اس پر اپنی طرف سے اضافے کیے۔ (مآثر الامرا، ۲ : ۴۷۹)

۲۵۳ | ۸ | آصف جاہ سے میر قمر الدین نظام الملک آصف جاہ اول بانیِ سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد (دکن) مراد ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ملتا ہے۔ سب سے پہلے ان کے دادا میر عابد خان بعہدِ شاہجہان ہندوستان آئے؛ ان کا انتقال ۱۰۹۸ھ میں ہوا تھا۔ ان کے بیٹے میر شہاب الدین نے بہت عروج پایا؛ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار منصب اور غازی الدین خان فیروز جنگ خطاب عطا ہوا۔ آصف جاہ ۱۴ ربیع الثانی ۱۰۸۲ھ/ ۱۱ اگست ۱۶۷۱ء کو پیدا ہوئے اور ۴ جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ/ ۲۱ مئی ۱۷۴۸ء کو برہان پور میں انتقال ہوا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے 'متوجہ بہشت' سے تاریخ نکالی۔ طبع موزوں تھی، شعر کہتے تھے اور آصف تخلص کرتے تھے۔ (سروِ آزاد : ۱۷۳۔۱۸۴)؛ انگریزی میں ان کے حالات میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف کردہ مفصّل کتاب The First Nizam (نظامِ اول) ہے۔ اس کے آخر میں کتابیات کے تحت تمام اہم مآخذ کا ذکر ملتا ہے۔

۹ | ناصر جنگ شہید کا اصلی نام میر احمد خان تھا۔ یہ نظامِ اول کے دوسرے بیٹے تھے؛

نظام الدولہ ناصر جنگ خطاب تھا۔ صاحبِ علم وفضل، عاملِ زہد و ورع، رعایا پرور اور دادگستر تھے۔ شعر میں بہت خوش فکر تھے؛ آفتاب تخلص تھا۔ میر غلام علی آزاد انھیں کے مصاحب تھے۔ کرناٹک کے افغانوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ/ ۵ دسمبر ۱۷۵۰ء کو رہ گرائے عالمِ فانی ہوئے۔ 'آفتاب رفت' تاریخ ہوئی۔ (سروِ آزاد : ۱۸۴-۱۹۶)

۱۰ ڈینی سن راس۔ پورا نام ایڈورڈ ڈینی سن راس تھا؛ ۱۹۱۸ء میں سر کا خطاب ملا، تو سر ایڈورڈ ڈینی سن ہو گئے۔ ۶ جنوری ۱۸۷۱ء کو انگلستان کے شہر سٹیپنی میں پیدا ہوئے۔ طالب علم تو معمولی قسم کے رہے، لیکن انھیں زبانوں سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ معلوم نہیں مشرق ومغرب کی کتنی زبانیں جانتے تھے اور ان میں بات چیت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی عمر میں سفر بھی بہت ملکوں کا کیا۔
وہ لندن یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے تھے کہ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن والیسرائے کی سفارش پر مدرسۂ عالیہ، کلکتہ کے پرنسپل ہو کر یہاں آ گئے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۱۱ء تک فائز رہے، اسی دوران میں چندے مرکزی حکومتِ ہند کے دفتر خانے کے مہتمم اور محکمۂ تعلیم کے نائب سکتر بھی رہے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ برٹش میوزیم، لندن میں ان مخطوطات کو مرتب کرنے پر مقرر ہوئے جو سر آرل اسٹین (ف ۱۹۴۳ء) وسطی ایشیا سے دریافت کر کے لائے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمی جنگ چھڑی، تو راس استانبول کے برطانوی سفارت خانے میں تجارتی مشیر مقرر کیے گئے تھے۔ مختصر علالت کے بعد یہیں ۲۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی خود نوشت سوانحعمری Both Ends of the Candle ان کی وفات کے بعد ۱۹۴۳ء میں لندن سے شائع ہوئی۔
راس کے متعدد علمی کارنامے شائع ہو چکے ہیں۔ مکی کی تاریخِ گجرات (ظفر الوالہ) انھیں نے ۲۵ برس کی طویل مدت میں تیار کر کے تین جلدوں میں شائع کی تھی۔ بابر اور بیرم خاں خانخاناں کے دیوان بھی شائع کیے تھے۔ اور بھی کئی کتابیں

		اور مقالے ان سے یادگار ہیں۔
۲۵۴	۱۱	دیوانِ غالب : ۱۵۹۔ پہلا مصرع ہے : سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
	۱۲	دیوانِ ذوق (مرتّبۂ آزاد) : ۱۸۷۔ دیران کے نسخے میں بھی اسی طرح ہے (ص ۱۰۹)
۲۵۵	۱۳	دیوانِ حافظ : ۶۲۔ متن میں 'زحاجب' چھپا ہے، جو ظاہرا کاتب کا سہو تھا؛ اس لیے اس کی اصلاح کردی گئی ہے۔
	۱۴	پیر چنگی کی حکایت مثنویِ مولانا روم کے دفترِ اول میں ہے (ص ۵۰ تا ۵۶)
	۱۵	مثنوی (دفترِ اول) : ۵۶۔ مثنوی میں پہلا مصرع یوں چھپا ملتا ہے : پیسرِ چنگی کے بود خاصِ خدا
	۱۶	ہدایہ اسلامی فقہ میں اور مشکوٰۃ حدیث میں مشہور کتابیں ہیں۔
۲۵۶	۱۷	دیوانِ حافظ : ۱۵۶
	۱۸	دیکھیے: ص ۲۳۹، حاشیہ ۶
۲۵۷	۱۹	کلیاتِ میر (دیوانِ اوّل) : ۴۹۔ پہلا مصرع ہے : دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
	۲۰	سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی کا مصرع ہے (کلامِ شاد : ۱۲۹) پورا شعر ہے : کہیں نہ جائیں گے تا حشر تیرے کوچے سے کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پابند ترے مصرعِ اولیٰ کی دوسری روایت یہ ہے : کہیں نہ جائینگے اُٹھ کر بجز دیارِ عدم : (کلیاتِ شاد، ۲ : ۲۱۴)
	۲۱	متن میں یہ لفظ 'بھنورے' لکھا تھا۔
	۲۲	کلیاتِ نظیر اکبرآبادی : ۲۷۰
	۲۳	دیوانِ غالب : ۴۵
۲۵۸	۲۴	کلیاتِ عرفی : ۳۸۶

	۲۵	دیوان نظیری: ۲۰۷۔ دراصل 'نوشتہ اند' کی جگہ 'نوشتہ ایم'، اور 'بیاض' کی جگہ 'علاج' ہے۔
	۲۶	میرزا محمد ہادی رُسوا لکھنوی کا شعر ہے، (جن کا تخلص پہلے مرزا تھا)۔ دیکھیے امراؤ جان ادا: ۳۸۲
	۲۷	جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے (خط (۷)، حاشیہ ۱۰) 'پہر' مذکر ہے، اس لیے یہ فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا: 'جب رات کا پچھلا پہر شروع ہونے کو ہوتا، تو ... الخ
	۲۸	دیوان حافظ: ۲۲۳
۲۵۹	۲۹	کلیات غالب: ۲۳۹
	۳۰	دیوان نظیری: ۱۰۱۔ پہلے مصرع میں 'ز خود' کی جگہ 'بخود' چاہیے۔
۲۶۰	۳۱	امیر حسن علا سجزی کا مصرع ہے (دیوان حسن سجزی دہلوی: ۲۵۲)۔ شعر ہے: از حسن ایں چہ سوالست کہ معشوقِ تو کیست؟ ایں سخن را چہ جوابست، تو ہم میدانی!
	۳۲	میرزا محمد ہادی لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ والد کا ان کی کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ اس کے بعد ذاتی جد و جہد سے پڑھنے لگے۔ اور بالآخر 'بی اے' کی سند حاصل کر لی۔ عربی، فارسی، انگریزی زبانیں بھی سیکھ لیں اور متعدد دیگر علوم میں بھی مہارت پیدا کر لی؛ نیز امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی؛ غرض عجیب و غریب ذہن پایا تھا۔ اب کسبِ معاش کے لیے باقاعدگی سے ریڈ کرسچین کالج میں اور شبینہ درجوں کے لیے ازابیلا تھابرن کالج میں بھی پڑھانے لگے۔ اسی زمانے میں دارالترجمہ حیدر آباد سے بلاوا آیا، تو مترجم ہو کے وہاں چلے گئے۔ امراؤ جان آدا انھیں کا ناول ہے، ایک اور ناول شریف زادہ بھی لکھا تھا۔ شعر بھی کہتے تھے، تخلص مرزا تھا؛ پھر ناولوں میں پردے کے طور پر رُسوا بھی لکھنے لگے۔ مرثیے میں مرزا دبیر اور ان کے صاحبزادے اوج سے مشورہ رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔

	۳۳	کلیات میر (دیوان دوم) : ۲۲۷
	۳۴	حافظ کا مصرع ہے (دیوان حافظ : ۲۳۵)۔ یہاں کچھ اختلافِ لفظی ہے۔ ٹھیک شعر یوں ہے :

رموزِ عشق و سرمستی زمن بشنو، نہ از واعظ
کہ با جام و قدح ہر شب قریں باماہ و پرویم

	۳۵	دیوان حافظ : ۶۴
۲۶۱	۳۶	معارف النغمات : راجہ محمد نواب علی خان تعلقدار اکبرپور کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں چھپ چکی ہے (ممتاز المطابع، لکھنؤ) موصوف ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور سرپرست تھے۔ میرس کالج آف میوزک، قیصر باغ، لکھنؤ جو اب بھاتکنڈے یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے، اس کی تشکیل میں بھی ان کا بہت ہاتھ تھا؛ اس کام میں رائے راجیشوربلی نے انھیں بہت مدد دی تھی۔
	۳۷	کتاب الاغانی، ابوالفرج علی بن الحسین بن محمد الاموی الاصفہانی (ف ۳۵۶ھ) کی تالیف ہے جو گانوں اور اس سے متعلق مختلف روایات اور قصص پر مشتمل ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے بہتر دارالکتب المصریہ، قاہرہ کا ہے۔ العقد الفرید۔ احمد بن محمد بن عبداللہ الاندلسی (ف ۳۲۸ھ) کی مشہور تصنیف مختلف النوع نوادر و اخبارِ اسلاف پر مشتمل ہے۔
	۳۸	یہاں بھی 'رات کے پچھلے پہر میں' چاہیے۔
	۳۹	اس سے مراد غالباً ابوبکر محمد بن العباس الخوارزمی ہیں، جو مشہور مؤرخ بن محمد ابن جریر الطبری کے بھانجے تھے۔ یہ خراسان میں ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، اور بعد کو حلب میں مقیم ہو گئے۔ یہیں ۳۸۳ھ/ ۹۹۳ء میں انتقال ہوا۔ ان کی کتاب رسائل خوارزمی مشہور ہے۔
	۴۰	ملا علی بن محمد سلطان معروف بہ علی قاری، ہرات میں پیدا ہوئے۔ فقہ و حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔ شرح

		فقہ اکبر اور حزبِ اعظم ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ شوال ۱۰۱۴ھ/جنوری ۱۶۰۶ء میں انتقال ہوا۔ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ (اعلام ۵: ۱۶۶) مزید حالات کے لیے دیکھیے: خلاصۃ الاثر ۳: ۱۸۵؛ الفوائد البہیۃ ۶ : ۸ ؛ البدر الطالع ۱: ۴۴۵
۲۶۲	۴۱	ہارون الرشید، خاندانِ عباسیہ کے پانچویں خلیفہ۔ اپنے بڑے بھائی ہادی کی وفات پر ۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۲۳ برس کی حکومت کے بعد طوس میں ۱۹۳ھ/۸۰۹ء میں انتقال ہوا، اس وقت صرف ۴۵ سال کی عمر تھی؛ طوس ہی میں دفن ہوئے۔
	۴۲	اسحاق بن ابراہیم بن میمون التیمی الموصلی المعروف بابن الندیم، فارسی الاصل، تین عباسی خلفا ـــــ ہارون، مامون اور واثق ـــــ کے ندیمِ خاص اور ماہرِ موسیقی۔ اس کے علاوہ لغت، تاریخ، کلام وغیرہ میں بھی کامل دستگاہ تھی۔ کتاب النغم والایقاع، اغانی معبد وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ آخری عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ ۲۳۵ھ/ ۸۴۹ء میں بعمر ۸۰ سال انتقال ہوا۔ (الفہرست ۱ : ۱۴۰؛ وفیات الاعیان ۱ : ۶۵؛ الاغانی ۵ : ۲۶۸؛ الاعلام ۱ : ۱۱۳)
	۴۳	ابراہیم بن محمد المہدی ۱۶۲ھ/ جولائی ۷۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم وفنون میں درجۂ کمال حاصل تھا، خاص طور پر موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے اسحاق موصلی کے ساتھ معرکے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ رمضان ۲۲۴ھ/جولائی ۸۳۹ء میں انتقال ہوا۔
	۴۴	دیوان حافظ : ۱۴۴
	۴۵	حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ : ۳۳۹) پورا شعر ہے: ساقی! بہوش باش کہ غم در کمینِ ماست مطرب! نگاہ دار ہمیں رہ کہ می زنی

۴۶ احمد سلامہ حجازی ۱۸۵۲ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مصر کے مشہور ساحلی قصبے رشید میں کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ احمد مشکل سے تین برس کے ہونگے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ مقامی مکتب میں معمولی تعلیم پائی اور گھر کے حالات سے مجبور ہوکر کمسنی ہی میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ آواز اچھی تھی۔ قرآن خوانوں کی منڈلیوں (منشدین فی الاذکار) کے ساتھ لوگوں کے گھروں میں جانے آنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نائی کی دکان پر بھی ملازمت کرلی۔ اسی زمانے میں (سلامیہ) بجانے کی مشق کی اور اس میں فی الجملہ مہارت پیدا کرلی۔ اب حالات ایسے ہوگئے تھے کہ نائی کی نوکری کرنے کی ضرورت نہ رہی اور وہ اپنی خوش الحانی کے باعث اسکندریہ کی دو مشہور مسجدوں (الاباصیری اور ابوالعباس) میں اذان کہنے پر مقرر ہوگئے۔

یہاں وہ ۱۸۸۳ء تک رہے، یعنی جس سال انگریزی جنگی بیڑے نے مصر پر حملہ کیا ہے۔ اس سال وہ رشید چلے گئے، اور یہاں انھوں نے ایک منڈلی (تخت) کی تشکیل کی۔ چند سال بعد وہ مستقل طور پر اسکندریہ منتقل ہوگئے اور یہاں بڑے پیمانے پر ایک ناٹک منڈلی بنالی۔

اب تک وہ صرف عامی زبان (دارجہ) میں شعر کہتے تھے اور اس میں بھی مزاولت نعتِ رسول اور گیتوں سے تھی۔ تھیٹر کی طرف رُخ کیا، تو یہاں بھی بڑی کامیابی حاصل کی۔ متعدد اوپرا عربی میں ترجمہ کیے، جن میں وردی کے عایدہ اور گونو کے رومیو وجولیٹ نے خاص شہرت حاصل کی۔ وہ مصر میں اسٹیج گانوں کے بانیوں میں شمار ہوتے اور عام طور پر 'الزعیم الغناء المسرحی' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں قاہرہ میں انتقال ہوا۔

(کتاب تاریخ اعلام الموسیقی الشرقیہ)

۴۷ پہلی تینوں اشاعتوں میں نام 'طاہرہ' چھپا ہے، لیکن درست 'طائرہ' ہے، جیساکہ خود مولانا نے مہر کے نام ایک خط میں لکھا ہے (نقش آزاد: ۲۱۰)۔ لیکن 'طائرہ' بھی

صحیح نام نہیں؛ یہ غالباً فرضی نام ہے، اصلی کچھ اور ہوگا۔ افسوس کہ کوشش کے باوجود اس کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۲۶۳ | ۴۸ | دیوانِ غالب : ۱۲۶

۴۹ | ام کلثوم کا اصلی نام فاطمہ تھا اور ان کے والد کا ابراہیم؛ وہ ۱۸۹۸ء میں مصر کے شہر سنبلاّوین کے قریب ایک معمولی قریے (طماوی الزہیرہ) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم مکتبی تھی۔ آغاز میں انھوں نے قرب و جوار کے دیہات اور شہروں میں اپنی خوش آوازی کا مظاہرہ کیا اور شہرت حاصل کی۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں قاہرہ آئیں اور رفتہ رفتہ نہ صرف مصر کی، بلکہ تمام عرب ممالک کی بہترین خوش گلو مغنّیہ تسلیم کر لی گئیں۔ حکومت مصر کی طرف سے انھیں تمغہ (نوط الکمال) ملا تھا۔ ۳ فروری ۱۹۷۵ء کو قاہرہ میں انتقال ہوا۔

شادی شدہ تھیں؛ ان کے شوہر جلدی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر حسن سعید الحفناوی تھے۔ بدقسمتی سے اولاد سے محروم رہیں۔ (سیدۃ النساء العربی ام کلثوم)

۵۰ | انقرہ — دارالخلافہ ترکیا۔

۵۱ | طرابلس (Tripoli) دو ہیں — ایک شام (سوریا) میں، یہ طرابلس الشرق کہلاتا ہے؛ دوسرا لیبیا میں، یہ طرابلس الغرب کہلاتا ہے؛ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

۵۲ | یہاں بھی متن میں عالیہ ہی تھا جس کی جگہ ٹھیک نام عُلَیّہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ شعر الاغانی (۱۰ : ۱۷۶) میں اُس سے منسوب ہے۔

۲۶۴ | ۵۳ | غنی کشمیری کا مصرع ہے۔ (دیوانِ غنی : ۱۹۷) مصرع اولیٰ ہے :

جلوۂ حسنِ تو آورد مرا بر سرِ فکر

۵۴ | بشار بن برد کا مصرع ہے (دیوان بشار بن برد : ۲۲۳) پہلا مصرع ہے :

یَا قَوْمِ اُذْنِی لِبَعْضِ الْحَیِّ عَاشِقَۃٌ

۵۵ | دیوان حافظ : ۳۲۷۔ صحیح 'عام' کی جگہ 'عشق' ہے۔ پہلا مصرع ہے :

شہریست پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے

	۵۶	پورا نام ولقب، شمس الدین محمد ہے۔ تاریخ ولادت کا تعین نہیں ہوسکا۔ ۷۲۰ھ اور ۷۳۰ھ کے درمیان شیراز میں پیدا ہوئے۔ متعدد علوم میں استادانہ دستگاہ حاصل تھی۔ شیخ ابو اسحٰق کے زمانے میں ۷۴۳ھ سے لے کر ۷۵۴ھ تک شاعرِ دربار رہے۔ ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء میں انتقال ہوا، شیراز ہی میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔
	۵۷	خیام یعنی حکیم ابوالفتح عمر بن ابراہیم، فارسی کے مشہور ترین شاعروں اور رباعی گویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق و مغرب دونوں جگہ اُن کی سی شہرت بہت کم لوگوں کو ملی ہے۔ عام طور پر انھیں بطور شاعر تسلیم کیا گیا ہے، لیکن کئی دوسرے علوم مثلاً ریاضی، ہیئت، نجوم، طب وغیرہ میں بھی یدِطولیٰ حاصل تھا، چنانچہ رصد خانۂ ملک شاہی کی تعمیر میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ ۵۱۷ھ/ ۱۱۲۴ء میں وفات اور نیشاپور کے باہر دفن ہوئے۔
	۵۸	شیلے۔ پورا نام پرسی بشی شیلی (Percy Bysshe Shelley) مشہور انگریزی شاعر، بلکہ انگریزی میں غزلیہ شاعری کے امام ۴ اگست ۱۷۹۲ء کو پیدا ہوئے، اور ۸ جولائی ۱۸۲۲ء کو اٹلی کے شہر ویرجیو کے قریب سمندر میں ڈوب جانے سے انتقال ہوا۔ نظم و نثر دونوں میں کلام موجود ہے۔ جس میں قدم قدم پر باغی اور مصلح کی روح جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام کے اہم موضوع انسان دوستی اور بالآخر محبت اور سچائی کے ذریعے انسان کی کامرانی ہیں۔
۲۶۵	۵۹	ورڈز ورتھ۔ پورا نام ولیم ورڈز ورتھ (William Wordsworth) تھا۔ ۷ اپریل ۱۷۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ کولرج کے ساتھ انگریزی میں رومانی تحریک کے قافلہ سالار ہیں۔ انگریزی شاعری میں ان کا بہت بلند مقام ہے اور سانیٹ میں وہ ملٹن کے ہم پلّہ خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ نظم میں وہ زبان استعمال کرنا چاہیے، جو کوئی عام آدمی جوش یا جذبے کے زیرِ اثر استعمال کرتا ہے۔

سودے کے انتقال کے بعد ۱۸۴۳ء میں وہ انگلستان کے ملک الشعرا مقرر ہوئے۔ ۲۳ اپریل ۱۸۵۰ء کو انتقال ہوا۔

۶۰ دیوان نظیری : ۳۶۸۔ دوسرا مصرع دراصل یوں ہے :
کہ یک ہنگامہ آرائی ست و یک کشور تماشائی

۶۱ البیرونی یعنی ابوریحان محمد بن احمد، خوارزم کے شہر کاث میں ۹۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ محمود غزنوی کے ساتھ ہندستان آئے۔ یہاں سنسکرت سیکھی اور ہندوؤں کے علوم و فنون پر عبور حاصل کیا، جنھیں انھوں نے اپنی کتاب الہند میں مدوّن کیا۔ متعدد علوم مثلاً اقلیدس، ہیئت، تاریخ، ادب وغیرہ میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ اتنی جامعیت کے بہت کم عالم پیدا ہوئے ہیں۔ ۴۳۰ھ/ ۱۰۳۹ء میں انتقال ہوا۔

۶۲ سخاؤ (Eduard Sachau)۔ ۲۰ جولائی ۱۸۴۵ء کو جرمنی میں پیدا ہوئے۔ متعدد مشرقی زبانیں جانتے تھے۔ مدتوں وی آنا (آسٹریا) اور برلن (جرمنی) کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۰ء کو برلن میں رحلت کی۔

۶۳ محمود غزنوی بن سلطان سبکتگین، ۱۵ دسمبر ۹۷۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ/ ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو ۳۱ سال کی حکومت کے بعد وفات پائی۔ اولوالعزم فاتح اور قدر دانِ علم تھے۔ ہندستان پر ان کے حملے مشہور ہیں۔

۶۴ سلطان محمود کی وفات پر ان کا چھوٹا بیٹا محمد ان کا جانشین ہوا تھا، لیکن پانچ ماہ بعد اس کے دوسرے بھائی مسعود نے اسے تخت سے اتار کر خود اس پر قبضہ کرلیا (۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء)۔ طغرل بیگ سلجوقی نے رمضان ۴۲۹ھ/ جون ۱۰۳۵ء میں اسے شکست دی۔ مسعود نے اس کے بعد لاہور کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا، لیکن یہاں بھی پاؤں نہ جم سکے۔ فوج نے بغاوت کردی اور اسے قید کرکے اس کے بھائی محمد کو دوبارہ تخت پر بٹھادیا۔ قید ہی میں ۴۳۲ھ/ ۱۰۴۱ء میں قتل کردیا گیا۔

۲۶۶ ۶۵ ہومر (Homerus)، یونان قدیم کا شہرۂ آفاق شاعر۔ اس کی جائے ولادت

یا زمانے کا یقینی علم نہیں، لیکن غالباً وہ حضرت مسیح علیہ السّلام سے نوسو برس پہلے گذرا ہے۔ ایلیڈ اور اوڈیسی اس کی مشہور نظمیں ہیں۔

۶۶ سوفوکلیس (Sophocles)، یونان کا مشہور شاعر اور المیہ ڈرامانگار۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۲۰ ڈرامے لکھے تھے۔ ان میں سے صرف سات اب دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کا ۹۱ سال کی عمر میں ۴۰۶ قبل مسیح انتقال ہوا۔

۶۷ ارسطو (Aristoteles) یونان کا زندۂ جاوید فلسفی ۳۸۴ ق م میں پیدا، اور ۳۲۲ ق م میں فوت ہوا۔

۶۸ افلاطون (Plato) سقراط کا شاگردِ رشید اور ارسطو کا استاد، یونان کا مایۂ ناز فلسفی۔ یونان کے شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔ ۸۱ برس کی عمر تھی جب تقریباً ۳۴۸ قبل مسیح اس کا انتقال ہوا۔ اس کی متعدد کتابیں ملتی ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب مکالمات کی شکل میں ہیں۔ جمہوریت اس کی مشہور کتاب ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

۶۹ ابن رُشد ۔ ان کے لیے دیکھیے حاشیہ ۲۵ خط ۱۷

۷۰ Comedy : طربیہ ۔ وہ ناٹک جس کا خاتمہ بخیر ہو۔

۷۱ Tragedy : المیہ ۔ وہ ناٹک جس کا خاتمہ افسوس ناک اور الم انگیز ہو۔

۷۲ ابن قدامہ ۔ ابوالفرج قدامہ بن جعفر قدامہ بن زیاد البغدادی، عباسی خلیفہ المکتفی باللہ کے معاصر، مشہور ادیب اور نقاد۔ نقد الشعر ان کی معروف تصنیف ہے۔ اور کتابیں بھی ہیں۔ ان کی کتاب الخراج ابھی پچھلے دنوں ہالینڈ میں چھپی ہے۔ ۳۲۷ھ/۹۴۸ء میں بغداد میں وفات پائی۔ (معجم الادبا، ۶ : ۲۰۳ ؛ الفہرست : ۱۳۰ ؛ النجوم الزاہرہ ۳ : ۲۹۷ ؛ المنتظم، ۶ : ۳۶۳ ؛ الاعلام، ۶ : ۳۱)

۷۳ اسکوریال (Escorial) اسپین میں دارالخلافہ میڈرڈ کے شمال مغرب میں ایک گانو؛ یہاں ایک بہت بڑا اور خوبصورت راہب خانہ ہے۔ اسپین کے شاہی خاندان کا قبرستان بھی یہیں ہے۔ اسی راہب خانے میں ایک کتاب خانہ ہے، جسے اسپین کے

		بادشاہ فلپ ثانی (۱۵۵۶-۱۵۹۸ء) نے قائم کیا تھا۔ اس میں چار ہزار خطی نسخے ہیں جن میں بہت سے مصوّر ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد عربی کے نادر مخطوطات کی ہے۔ تقریباً چار ہزار ہی قدیم مطبوعہ کتابیں بھی ہیں۔
۲۶۷	۷۴	ڈاکٹر منصور سے منصور فہمی پاشا مراد ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الحقوق الاہلیۃ قاہرہ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد سوربون (پیرس) سے ۱۹۱۳ء میں پی ایچ ڈی کی سند لی۔ واپسی پر قاہرہ یونیورسٹی میں (جو اس وقت 'مصری یونیورسٹی' کہلاتی تھی) فلسفے اور اخلاقیات کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔
	۷۵	ڈاکٹر طٰہٰ حسین، مصر کے صوبہ المنیا کے ایک گاؤں مغاغہ میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم ختم کرکے انھوں نے بھی ۱۹۲۵ء میں سوربون سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور واپسی پر ادبیات کے استاد مقرر ہوئے۔ اپنی عمر میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ وہ کسی زمانے میں مصر کے وزیر تعلیم تھے۔ پھر مجمع اللغۃ العربیہ کے صدر رہے، جو عربی زبان کی سب سے بڑی اکادیمی ہے۔ کم عمری میں چیچک سے آنکھوں کی بصارت ضائع ہوگئی تھی۔ مختلف موضوعات پر کوئی ۶۰ کتابیں شائع کیں۔ ان میں سے بعض دنیا کی اور زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ اتوار ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو قاہرہ (مصر) میں رحلت کی۔ (متن میں نام 'طاہا حسین' لکھا تھا۔ اسے 'طٰہٰ حسین' کر دیا گیا ہے۔ جس طرح وہ خود لکھتے ہیں)
	۷۶	لیکن علما کی بہت بڑی جماعت نقد النثر کو ابن قدامہ کی تصنیف تسلیم نہیں کرتی۔ نیز یہاں مولانا آزاد مرحوم سے سہو ہوا ہے۔ نقد النثر کو ڈاکٹر منصور اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے شائع نہیں کیا، بلکہ طٰہٰ حسین کے ساتھ پروفیسر عبدالحمید العبادی نے مل کر یہ کام کیا تھا۔
	۷۷	ابوعثمان عمر بن بحر بن محبوب مشہور بہ جاحظ ۱۶۳ھ/ ۷۷۹-۷۸۰ء میں بصرے میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۵۵ھ/ ۸۶۹ء میں انتقال کیا۔ عربی ادب کے شہرۂ آفاق ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں کتاب الحیوان بہت مشہور ہے۔ (الاعلام ۵: ۲۳۹) مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ارشاد الاریب ۶: ۵۶؛

وفیات الاعیان، ۱: ۳۸۸؛ آداب اللغۃ ۲ : ۱۶۷؛ لسان المیزان ۴: ۳۵۵؛ تاریخ بغداد، ۱۲ : ۲۱۲ -

۷۸ شریف گرگانی کا مصرع ہے (شعر العجم، ۱: ۲۷) پہلا مصرع ہے :

ثنا ے رودکی ماندست و مدحش

۷۹ ابونصر فارابی - دیکھیے خط (۱۷) حاشیہ (۲۷)

۸۰ اخوان الصفا۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری (نویں اور دسویں عیسوی) میں ایران کے بعض علما نے فلسفۂ یونان کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے مطابق کرنے کا بیڑا اٹھایا؛ لیکن عملاً انھوں نے کام اس کے الٹ کیا، یعنی وہ اسلامی تعلیمات کو کھینچ تان کر یونانی فلسفے کے مطابق دکھانے لگے۔ یہی گروہ اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہوا۔ دراصل یہ اصحاب کسی خاص مذہب کے پیرو اور اس کے اصولوں کے پابند نہیں تھے؛ بلکہ وہ تمام مذاہب کو حق اور ان کی کتابوں کو سچّا مانتے تھے۔ ان کے لکھے ہوے ۵۲ 'رسائل اخوان الصفا' چار حصوں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں : (۱) ریاضیات، (۲) طبیعیات و جسمانیات، (۳) عقلیات و نفسیات، (۴) الٰہیات و معتقدات۔ دنیا کی اور زبانوں کے علاوہ ان کا اردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ یہ ۱۸۱۲ء میں کلکتہ میں چھپے تھے۔

۲۶۸ ۸۱ امیر خسرو دہلوی : ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں ضلع ایٹہ کے قصبہ پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ہندستان نے ان سے بڑا فارسی کا شاعر پیدا نہیں کیا۔ انھوں نے نظامی کے تتبع میں خمسہ لکھا اور اس کا حق ادا کردیا۔ ان کے علاوہ پانچ دیوان، متعدد مثنویاں اور نثری کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے محبوب مرید تھے۔ مرشد کی وفات کے چھ ماہ بعد ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں انتقال ہوا اور انھیں کے پائیں میں دفن ہوئے۔

	۸۲	قرآن السعدین ۱۸۲۰۔ مطبوعہ نسخے میں مصرعِ ثانی یوں ہے : کردہ با آہنگِ عراق اتفاق
	۸۳	خلجی خاندان کا بانی جلال الدین فیروز شاہ تھا۔ یہ خاندان ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء سے لے کر ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء تک حکمراں رہا۔
	۸۴	تغلق خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق تھا۔ ان کا زمانہ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء سے لے کر ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تک ہے۔
	۸۵	جونپور شرقی کی ابتدا خواجہ جہان کے ہاتھوں ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں پڑی اور ۸۸۱ھ/۱۴۷۷ء میں اس کا خاتمہ ہوا، جب کہ حکومتِ دہلی نے اس پر قبضہ جما لیا۔
۲۶۹	۸۶	بہمنی خاندان کا بانی علاء الدین حسن بہمن شاہ تھا جس کے نام پر یہ بہمنی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان کا دور دورہ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء سے ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء تک رہا۔
	۸۷	بہمنی سلطنت کے زوال پر جو پانچ خاندان برسرِ اقتدار آئے، ان میں سے ایک نظام شاہی تھا؛ اس کا بانی ملک احمد تھا، جس نے ۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء تک حکومت کی۔ اس خاندان کا دار الخلافہ احمد نگر تھا؛ اس کا خاتمہ ۱۶۳۳ء میں ہوا
	۸۸	دوسرا بیجاپور کا عادل شاہی خاندان تھا، اس کا بانی یوسف عادل خاں تھا۔ یہ خاندان ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب کے ہاتھوں ختم ہوا۔
	۸۹	ابراہیم عادل شاہ اپنے خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا اور ابراہیم ثانی کہلاتا ہے۔ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء سے ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء تک تخت نشین رہا۔ اس کی کتاب 'نورس' موسیقی سے اس کے شغف اور اس میں مہارت کی شاہد عادل ہے ؛ بلکہ اس نے دھرپد کا نام نورس رکھ دیا تھا۔ بختر خاں کلاونت جو خیال اور دھرپد کا ماہرِ کامل کہا جاتا ہے۔ اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔ (توزک جہانگیری : ۱۳۲)
	۹۰	سہ نثر میں کی پہلی نثر میں جو دراصل کتاب نورس کا دیباچہ ہے، لکھتا ہے :

		از شاہِ دکن جہاں نشاط آباد ست خاکِ غم از آبِ نغمہ اش برباد است
		ارباب ترانۂ کہنہ شاگرد انند آں کس کہ از و نو شدہ طرز اوستاد ست
	۹۱	باز بہادر، اصلی نام بایزید، سلطنت مالوہ کا آخری بادشاہ، جس پر اس ملک کی آزادی کا بعہدِ اکبری خاتمہ ہوا۔ یہ ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے مانڈو کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔ شروع میں اکبری فوجوں کا مقابلہ کیا، لیکن بالآخر ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء میں ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ اکبر نے دو ہزاری منصب دیا۔ روپ متی اس کی محبوبہ تھی، جس کی مدح میں اس نے گیت لکھے ہیں۔ (اس سلسلے میں دیکھیے: مآثر الامرا، ۱: ۳۸۹)
	۹۲	ان کے نام آئین اکبری، ص ۲۰۹ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔
	۹۳	ملکہ الزبتھ اوّل، انگلستان کی مشہور حکمران؛ ان کی زندگی کے اہم سنین یوں ہیں: ولادت ۷ ستمبر ۱۵۳۳ء؛ تخت نشینی ۱۷ نومبر ۱۵۵۸ء؛ وفات ۲۴ مارچ ۱۶۰۳ء
۲۷۰	۹۴	دیکھیے توزکِ جہانگیری: ۱۱۱
	۹۵	محمد قاسم فرشتہ (صاحبِ تاریخِ فرشتہ) کے والد کا نام غلام علی ہندو شاہ تھا۔ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ مرتضیٰ نظام شاہ اول (۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء ــــ ۹۹۵ھ/۱۵۸۶ء) کے عہد میں دکن آیا۔ فرشتہ نے احمد نگر کی سکونت ترک کر کے عادل شاہیوں سے رشتہ جوڑا اور ابراہیم عادل شاہ (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء ــــ ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء) کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اس نے اپنی مشہور تاریخ اسی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ چنانچہ اس کا ایک نام تاریخِ ابراہیمی بھی ہے۔ ۱۶۱۴ء تک یقیناً زندہ تھا۔ (تاریخ فرشتہ، ۲: ۵۶۷) وفات کا سال متعین نہ ہو سکا۔
	۹۶	ملّا علاء الملک تونی مخاطب بفاضل خان۔ ایران میں پیدا ہوئے اور عہدِ شاہجہانی میں ہندستان آئے۔ علوم طبیعی و ریاضی میں یکتائے روزگار تھے، اور نجوم اور ہیئت میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ۲۷ ذی قعدہ ۱۰۷۳ھ/۲۴ جون ۱۶۶۳ء

کو بعمر حوالیِ ۷۰ سال انتقال ہوا۔ اس سے صرف ۱۷ روز قبل عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے تھے (مآثر الامرا، ۳ : ۵۲۴-۵۳۰)

۲۷۱ | ۹۷ | اس کے لیے دیکھیے، منتخب التواریخ، ۲ : ۲۶۵

۹۸ | ملّا عبدالقادر بدایونی کے حالات کے لیے دیکھیے: خط (۱۷) حاشیہ (۲۴)

۹۹ | بدایونی نے منتخب التواریخ (۳ : ۳۰۳-۳۰۴) میں وہ خط نقل کیا ہے، جو فیضی نے ان کی سفارش میں اکبر کو لکھا تھا، اور جس میں اُن کے من جملہ اور کمالات کے بیّن میں مہارت کا بھی ذکر ہے۔

۱۰۰ | علامی سعداللہ خان چنیوٹ (پنجاب۔ پاکستان) کے رہنے والے بنو تمیم قریشی تھے۔ صاحبِ کمال ایسے تھے کہ شاہجہان کے وزیرِ اعلیٰ اور معتمدِ خاص رہے ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب جلیلہ پایا۔ ۲۲ جمادی الثانی ۱۰۶۶ھ/۹ مارچ ۱۶۵۶ء کو انتقال ہوا (مآثر الامرا، ۲ : ۴۴۸؛ نزہۃ الخواطر، ۵ : ۱۵۵-۱۵۶)

۱۰۱ | مفتی عبدالسلام لاہوری، فاضلِ عصر، متعدد علوم میں مہارتِ کاملہ تھی۔ تمام عمر درس و تدریس میں گذری، تصنیف سے رغبت نہیں رکھی۔ صرف تفسیر بیضاوی پر ان کا حاشیہ ملتا ہے۔ ایک عالم نے ان سے فیض پایا۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷-۱۶۲۸ء میں انتقال ہوا۔ (مآثر الکرام ۱ : ۲۳۶؛ نزہۃ الخواطر ۵ : ۲۲۳-۲۲۴)

۱۰۲ | شیخ معالی خان، قاضی عبدالوہاب کے چھوٹے بیٹے عبدالحق کے فرزندِ ارجمند تھے۔ بقولِ صاحبِ مآثر الامرا "خوگرِ شراب و شیفتۂ راگ بود، و خود نیز بے حجابانہ می خواند، و بشکار شوقِ کمال داشت"۔ مدتوں ملکاپور (برار) کی فوجداری ان کے پاس رہی۔ (مآثر الامرا، ۱ : ۲۴۰)

۱۰۳ | ملا محمد طاہر پٹنی، مشہور عالمِ عہدِ اکبری، پٹن (گجرات) کے رہنے والے اور قوم کے بوہرہ تھے۔ حرمین شریفین گئے اور وہاں سے واپسی پر مہدویہ اور تشیّع کی تردید میں سعیِ بلیغ کرتے رہے۔ "مجمع البحار" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ۹۸۶ھ/

۱۵۷۸ - ۱۵۷۹ء میں قتل ہوئے - پٹن میں مدفن ہے (مآثر الامرا، ۱: ۲۲۵ - ۲۲۶ ؛ مآثر الکرام، ۱ : ۱۹۴ - ۱۹۶ ؛ نزہتہ الخواطر، ۵ : ۲۹۸ - ۳۰۱)

۱۰۴ شیخ عبدالوہاب انھیں ملّا طاہر کے پوتے، فقہ و اصول میں مہارتِ تامّہ کے مالک تھے - شاہجہان کے عہد میں مفتیِ پٹن رہے اور اورنگ زیب کے دور میں قاضیِ عسکر کے عہدے پر فائز ہوگئے - انھوں نے بہت مال و دولت جمع کی تھی، جسے ان کے بیٹے نے ترکے میں قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اسے کسبِ حلال نہیں سمجھتے تھے - قاضی عبدالوہاب کا ۱۸ رمضان ۱۰۸۶ھ / ۲۶ نومبر ۱۶۷۵ء کو دلّی میں انتقال ہوا (مآثر الامرا، ۱ : ۲۳۶ - ۲۳۷؛ نزہتہ الخواطر ۵ : ۲۶۷ - ۲۶۸)

۱۰۵ ملا شفیعائی یزدی - عہدِ شاہجہانی و عالمگیری کے سربرآوردہ امرا میں سے تھے، دانشمند خان خطاب تھا - آخری زمانے میں پنج ہزاری منصب اور میر بخشی مملکت کا عہدۂ جلیلہ ان کے پاس تھا - ۱۳ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ / ۲۱ جولائی ۱۶۷۰ء کو انتقال ہوا - ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے ان کا طولانی مباحثہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے واوِ عاطفہ سے متعلق ہوا تھا - علامی سعد اللہ خان وزیرِ اعظم حَکَم مقرر ہوئے تھے؛ ان کے خیال میں فریقین برابر رہے تھے - حکماے فرنگ کی ہم مشربی، کا الزام صاحبِ مآثر الامرا کے نزدیک "نظر بر فضل و کمالش استبعاد دارد" (مآثر الامرا، ۲ : ۲۰ - ۳۲)

۱۰۶ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی - ان کے والد کا نام شمس الدین ہے۔ انھوں نے شیخ کمال الدین کشمیری سے تعلیم پائی اور پھر خود ایسی استعداد پیدا کی کہ بقولِ صاحبِ مآثر الکرام " الحق در جمیع فنونِ درسی مثلِ او از زمینِ ہند بر نخاست " شاہجہان نے انھیں دو مرتبہ چاندی سے تلوایا، ہر مرتبہ چھ ہزار روپیہ ہوا اور یہ بھی انھیں انعام میں دے دیا - متعدد مشہور تصانیف پر حواشی لکھے، جو عرب و عجم میں رائج ہیں - ۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ / ۲۵ دسمبر ۱۶۵۶ء کو سیالکوٹ میں

رحلت کی؛ اور وہیں دفن ہوئے ۔ یہاں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی رح کو سب سے پہلے مجدّد الف ثانی اُنھیں نے کہا تھا۔
(مآثر الکرام، ۱ : ۲۰۴-۲۰۵ ؛ نزہتہ الخواطر، ۵ : ۲۱۰-۲۱۱)

۱۰۷ حکیم برنیر فرنساوی سے مشہور ڈاکٹر فرنسوا برنیے (Francois Bernier) مراد ہیں (فرانسیسی نام کا تلفظ برنیے ہوگا؛ آخری R تلفظ میں نہیں آئےگا) ۔ اورنگ زیب کے زمانے میں مصر و شام کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے واردِ ہندستان ہوئے ۔ یہاں دربارِ شاہی میں رسوخ حاصل کر کے طبیبِ خاص مقرر ہو گئے ۔ واپس وطن پہنچ کر اپنا مشہور سفرنامہ مرتّب کیا ۔ اس کے علاوہ ان کی بعض اور کتابیں بھی ملتی ہیں، جن میں گسندی (Gassendi) کے فلسفے کی تنقید زیادہ اہم ہے ۔ پیرس میں ۲۲ ستمبر ۱۶۸۸ء کو انتقال کیا۔

۱۰۸ علاء الدین الحسینی اودھی کے نام سے مشہور ہیں۔ سید شریف احمد بغدادی کی نسل سے تھے اور خراسان مسقط الرّاس تھا؛ وہیں سے ہندستان آئے۔ شیخ عبدالسّلام (ولد سعدالدین بجنوری) کے مرید تھے۔ "ایقاع والنغم" میں مہارت تھی ۔ ان کی موت افسوسناک حالات میں ہوئی ۔ گھر میں چور گھس آئے؛ حالانکہ ۹۰ سال کی عمر تھی، لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود گرز اٹھا کر مقابلے پر کھڑے ہو گئے اور دو کو مار گرایا ۔ اسی معرکے میں ایک چور کے تیر کا نشانہ ہوئے؛ یہ ۹۹۸ھ/۱۵۸۹-۱۵۹۰ء کا حادثہ ہے ۔ ترجیع بند ما مقیمان انھیں کے نتائجِ فکر سے ہے ۔ (منتخب التواریخ ، ۳ : ۶۱-۶۳ ؛ روزِ روشن: ۴۶۴-۴۶۵ ؛ نزہتہ الخواطر ، ۴ : ۲۳۲)

۱۰۹ روزِ روشن (ص ۴۶۵) میں اس غزل کے متعدد شعر ہیں ۔ مطلع میں "گلِ رعنا" کی جگہ "گلِ خنداں" دیا ہے ۔ نگارستانِ سخن (ص ۶۷) میں دوسرا شعر سہوِ کتابت سے غلط لکھا گیا ہے ۔ (نیز اخبار الاخیار : ۲۳۲)

۱۱۰ شیخ جمالی دہلوی ، قوم کے کنبوہ تھے ۔ اصلی نام جلال خان اور تخلص جلالی تھا؛

اپنے پیر شیخ سماء الدین (ف ۹۰۱ھ) کے اشارے پر انھیں جمال خان اور جمالی میں تبدیل کر لیا (مفتاح التواریخ : ۱۵۰) لیکن خود شیخ جمالی نے اپنی کتاب سیر العارفین میں اپنا نام حامد بن فضل اللہ لکھا ہے (ص ۱-۲) اور یہی ٹھیک ہوگا۔ شعر خوب کہتے تھے۔ بابر اور ہمایوں کی مدح میں قصیدے بھی کہے ہیں۔ نعت میں یہ مشہور شعر انہی کا ہے :

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتوِ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمے

۱۰ ذی القعدہ ۹۴۲ھ / یکم مئی ۱۵۳۶ء کو گجرات میں فوت ہوئے ؛ لاش دِلّی آئی اور قطب صاحب میں اپنے والد کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔ (اخبار الاخیار : ۲۲۷ - ۲۲۹ ؛ تذکرۂ علمائے ہند : ۴۳ ؛ خزانۂ عامرہ : ۱۷۷ - ۱۷۹)

۱۱۱ یہاں سیر الاولیا چھپا تھا، لیکن کتاب کا ٹھیک نام سیر العارفین ہے، نہ کہ سیر الاولیا اس لیے متن میں درستی کر دی گئی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے (مطبع رضوی، دہلی بماہِ ربیع الآخر ۱۳۱۱ ہجری)

۱۱۲ شیخ گدائی، بڑے بیٹے تھے شیخ جمالی کے، ان کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ یہ ہمایوں کے مصاحبِ خاص تھے، اسی لیے شیر شاہ سوری کے زمانے میں گجرات کی طرف چلے گئے اور پھر وہیں سے حج کو روانہ ہو گئے۔ اکبر کے زمانے میں واپس آئے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر دوبارہ حجاز کی راہ لی۔ راستے میں دشمنوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ جان تو بچ گئی، لیکن مدتوں روپوش رہے۔ بالآخر دہلی واپس آ گئے اور یہیں ۹۷۶ھ / ۱۵۶۸ - ۱۵۶۹ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ (منتخب التواریخ، ۲ : ۱۱۹ ؛ ایضاً، ۳ : ۷۶ - ۷۷ ؛ اخبار الاخیار : ۲۲۹ - ۲۳۰)

۱۱۳ میرزا مظہر جانجاناں، اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر، ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ / ۸ جنوری ۱۷۸۱ء کو انتقال ہوا۔ دلّی میں محلّہ چتلی قبر کے اندرون درگاہ شاہ ابوالخیر میں مزار ہے۔ لیکن کسی تذکرے میں ان کی موسیقی میں مہارت کا ذکر نہیں ملا۔ غالباً

مولانا مرحوم کو خواجہ میر درد کے نام کی یکجائی کی وجہ سے سہو ہوا، جن کی موسیقی میں غیر معمولی مزاولت معلوم ہے۔ شاعری اور تصوف دو وجہِ اشتراک و مماثلت موجود ہی تھیں، ذہن نے موسیقی کا غیر ارادی طور پر بلا وجہ اضافہ کر دیا۔

۱۱۴ خواجہ میر درد، مشہور شاعر، یوم جمعہ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کو رہگرائے عالم فانی ہوئے۔ ترکمان دروازے کے باہر نئی دلی میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔

۱۱۵ میر عبدالواحد بلگرامی صاحبِ کمالات و فضائلِ گوناگوں تھے۔ موسیقی کے علاوہ تصنیف و تالیف و شعر سے بھی شغف تھا؛ شاہدی تخلص کرتے تھے۔ نزہۃ الارواح پر حاشیہ لکھا۔ اصطلاحاتِ صوفیہ میں کئی رسالے لکھے؛ سبع سنابل انھیں میں سے ہے۔ سلوک میں تربیت شیخ حسین (سکندرہ) سے حاصل کی تھی۔ ۳ رمضان ۱۰۱۷ھ/ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء کو بلگرام میں رحلت کی۔ (منتخب التواریخ، ۳ : ۶۵-۶۶؛ مآثر الکرام، ۱ : ۲۵-۳۳؛ تذکرہ علماے ہند ۱۳۶؛ نزہۃ الخواطر، ۵ : ۲۶۳-۲۶۴)

۱۱۶ منتخب التواریخ، ۳ : ۶۵

۱۱۷ بیرم خان خانخاناں، ہمایوں اور اکبر کے عہد کے مشہور امیر تھے۔ بروزِ جمعہ ۱۴ جمادی الاول ۹۶۸ھ/ ۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء کو پٹن میں قتل ہوئے (حالات کے لیے دیکھیے: منتخب التواریخ، ۳ : ۱۹۰-۱۹۲)

۱۱۸ عبدالرحیم خانخاناں، ان کے حالات کے لیے دیکھیے : خط (۵) حاشیہ (۳۵)

۱۱۹ مآثر رحیمی، ۳ : ۱۶۸۹-۱۶۹۸۔ یہاں اِن موسیقی دانوں کے حالات و کوائف دیے ہیں : آقا محمد نامی؛ مولانا اصولی؛ استاد میرزا علی قبچکی۔ ان کے علا محمد مومن فنِ طنبورہ کے ماہر، اور حافظ نذر خوشخوان اور حافظ شیرہ سادہ خوان، طہماسپ قلی نغمہ سراے ترکی، حافظ تاج شیرازی، علی بیگ مصنّف اصفہانی کا ذکر بھی موسیقی کے ماہرین کے ذیل میں آیا ہے۔

۲۷۳ ۱۲۰ مآثر الامرا (۳ : ۶۷۵) کے صحیح لفظ یہ ہیں : بسیار شیفتۂ صید و شکار بود و ہم دلدادۂ راگ و نغمہ خوانندہ و سازندہ (کہ نزدِ او فراہم آمدہ بودند) در ہیچ سرکارے دراں

وقت نبود۔

۱۲۱ ٹھیک الفاظ یوں ہیں: "زین خان بحبت وراگ شیفتہ بود۔ اکثر ساز ہا خودمی نواخت و شعر ہم می گفت" (مآثرالامرا، ۲ : ۳۶۹)

۱۲۲ مآثرالامرا، ۳ : ۴۹۲ "گویند شکار دوست بود، وبنغمہ وسرود شیفتگی داشت؛ سازندہ ونوازندۂ بسیار فراہم آوردہ بود"

۱۲۳ مردِ صاحب کمال بود، بترکی وفارسی شعر می گفت۔ دیوانے مرتّب دارد مشتمل بر قصائد و غزلیات، غزنوی تخلص می کرد۔ و در موسیقی نیز مہارت داشت۔ گویند ہیچ گاہ مجلسِ اُو خالی از فضلا وشعرا نبودہ؛ پیوستہ بسخنانِ رنگین ونغماتِ دل نشین، حلاوت بخش وطرب افزائے اہلِ ذوق بود" (مآثرالامرا، ۳ : ۲۱۵) نیز منتخب التواریخ، ۳ : ۲۸۷-۲۸۸

۱۲۴ مرزا غازی بیگ بسیار مستعد وبصحبتِ اہلِ سخن مشغوف بود۔ خود ہم شعر می گفت و وقاری تخلص می نمود۔ گویند، در قندھار شاعرے بود بایں تخلص؛ میرزا بیکہزار روپیہ وخلعت واسپ از و ایں تخلص خرید کرد، بمناسبتِ تخلصِ پدر خود (کہ حلیمی بود)... میرزا در نغمہ پردازی وطنبورہ نوازی بے نظیر بود۔ ہمہ ساز را خوب می نواخت" (مآثرالامرا، ۳ : ۳۴۷)

۱۲۵ مآثرالامرا، ۳ : ۳۴۷

۱۲۶ "و در فنِ موسیقی مہارتِ تمام داشت و با دوامِ انہماک در کارہائے دنیوی مولّع وشیفتۂ راگ ورنگ بود۔ پری چہرگانِ خوش آواز ومغنّیاتِ عشوہ ساز در خانہ داشت" (مآثرالامرا، ۱ : ۷۹۰)

۱۲۷ سرس بائی۔ اس کا نام مختلف طور پر لکھا گیا ہے۔ منتخب اللباب (۲ : ۱۵۵-۱۵۶) میں سرسن بائی ہے؛ سرکار نے (اورنگ زیب، ۲ : ۹۸ میں) سرتی بائی لکھا ہے۔ سرسن بظاہر غلط ہے؛ دوسرے دونوں ہوسکتے ہیں۔ سرس گجراتی (اور پنجابی) میں اعلیٰ اور خوبصورت کو کہتے ہیں۔

	۱۲۸	شہزادۂ مراد بخش شاہجہان کے بعد تخت نشینی کے جھگڑوں کا شکار ہوا۔ جنوری ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب نے اسے گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو اس پر علی نقی کے قتل کا مقدمہ قائم ہوا اور ۴ دسمبر ۱۶۶۱ء کو قاضیوں کے فتوے پر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا "اے وائے بہر بہانہ کشتند" تاریخ ہوئی۔ (منتخب اللباب جلد دوم)
	۱۲۹	با آں کہ عمر میرزا (عیسیٰ خاں ترخان) از صد متجاوز بود، امّا قویٰ از درجۂ طبیعی سقوط نیافتہ۔ باہم جوانانہ داشت و بسیار عیش دوست و شیفتۂ مسکرات و دلدادۂ راگ و رنگ بود، و در نغمہ خوانی و ساز نوازی خالی از کمال نبود۔ (مآثر الامرا، ۲: ۴۸۸)
	۱۳۰	مان متی عرف جگت گوسائیں موٹا راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی۔ اس کی جہانگیر سے ۱۵۸۶ء میں شادی ہوئی تھی؛ ۸ اپریل ۱۶۱۹ء کو انتقال ہوا۔ (توزک جہانگیری)
۲۷۴	۱۳۱	لال خان نہ صرف تان سین کا جانشین، بلکہ اس کا داماد بھی تھا۔ "گُن سمُندر" (بحر صفات) اس کا لقب یا خطاب تھا۔ دھرپد کا ماہر تھا (بادشاہ نامہ ۱ (۲): ۵۶)
	۱۳۲	نظام الملک آصف جاہ کے لیے دیکھیے اوپر حاشیہ (۸) خط (۲۴)
	۱۳۳	ناصر جنگ شہید کے لیے دیکھیے حاشیہ (۹) خط (۲۴)
	۱۳۴	شیخ سلیم چشتی، اکبر بادشاہ کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ جہانگیر کا نام سلیم تبرکاً انھیں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بعمر ۹۵ سال سلخ رمضان ۹۷۹ھ/۱۵ فروری ۱۵۷۲ء کو انتقال ہوا۔ (منتخب التواریخ، ۲: ۱۳۶) (مفصّل حالات کے لیے دیکھیے ایضاً، ۳: ۱۱-۱۵؛ نزہۃ الخواطر، ۴: ۱۲۶-۱۲۷)
	۱۳۵	احوال او از نوادر حالات است۔ صلاح و اتقاے او بمرتبۂ بود کہ غالباً در مدّت العمر بمسکر و منہیٰ ارتکاب ننمود، و با وصف آں جمیع طوائف رقاصیۂ تمام صوبۂ بنگالہ را (از لولی و ہورکنی و کنچنی و ڈومنی) ہشتاد ہزار روپیہ در ماہہ نوکر کردہ، سالے نہ لک و شصت ہزار روپیہ بآنہا می رسانید" (مآثر الامرا، ۱: ۱۱۹)
	۱۳۶	ایضاً

	۱۳۷	ایضاً
۲۷۵	۱۳۸	”در فنِ راگ و نغمہ بسیار ماہر بود۔ رسالہ مسمّیٰ براگ درپن (کہ بیشتر ترجمۂ مانک سہل کہ نائکانِ سابق نوشتہ اند) نمودہ، با فوائدِ دیگر در تقسیم و قواعد آں تالیف کردہ“۔ (مآثر الامرا، ۲ : ۴۸۴)۔ حالات کے لیے دیکھیے، سروِ آزاد : ۱۲۹-۱۳۰
	۱۳۹	ناصر علی سرہندی (ف ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۷ء) کے قصیدے کی بیتِ اسم ہے : گفتگوے طوطی از آیینہ می خیزد، علی ! گر نباشد سیف خاں، او را نفس در کار نیست
	۱۴۰	یہ زین آبادی کا پورا واقعہ مآثر الامرا (۱ : ۷۹۰-۷۹۲) میں دیکھا جا سکتا ہے۔
	۱۴۱	محتشم کاشانی کا شعر ہے (دیوان : ۳۲۳) مصرعِ اوّل میں 'دامے' کی بجاے 'راہے' ہے۔
۲۷۶	۱۴۲	اکبر الٰہ آبادی کا مصرع ہے (کلیات، ۳ : ۵۲)۔ پورا شعر ہے : بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی گذر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی
	۱۴۳	دیوان حافظ : ۳۷۵۔ مطبوعہ دیوان میں مصرع اولیٰ اس طرح ہے : بالا بلند عشوہ گر نقش بازِ من
	۱۴۴	مآثر الامرا، ۱ : ۷۹۰۔ یہاں اصلی عبارت سے کچھ تفاوت ہے۔ ٹھیک متن یوں ہے : بکمال ابرام و سماجت 'او' را از خالہ 'مکرمہ' خود 'گرفتہ'۔ باآں ہمہ زُہد و ورعِ 'خشک و تفقہِ بحت'، شیفتہ و دلدادۂ اُو شد۔ 'پیالۂ' شراب بدستِ خود پُر کردہ 'باُو' می داد۔ گویند روزے 'اُو' ہم قدحِ بادہ [پُر کردہ] بدستِ شہزادہ داد و تکلیف [شُرب] نمود۔ یعنی واوین کے درمیان کے الفاظ یہاں بدل گئے ہیں یا حذف ہو گئے ہیں؛ اور خطوط وحدانی کے اندر کے الفاظ سرے سے اصلی متن میں ہیں ہی نہیں۔

۲۷۷	۱۴۵	کلیاتِ عرفی : ۳۴۴۔ دراصل مصرعِ اوّل میں 'توئی' کی بجائے 'گماں' ہے۔
	۱۴۶	امیرخسرو کا شعر ہے۔ ردیف 'باقیست' کی جگہ 'باشد' ہے۔ (دیوان کامل امیرخسرو دہلوی : ۱۸۵) پورا شعر ہے : مَے حاجت نیست مستیم را درچشمِ تو تا خمار باشد
	۱۴۷	حضرت امیرخسرو کا شعر ہے۔ دیکھیے، شعرالعجم، ۲ : ۱۵۶
	۱۴۸	سورۂ یوسف ۱۲ : ۲۴ (اور یقیناً اس عورت نے اس کا قصد کیا، اور اس نے اس عورت کا قصد کیا)
	۱۴۹	حضرت امیرخسرو کا شعر ہے (دیوان کامل امیرخسرو دہلوی : ۲۷۴) دیوان میں مصرعِ اولیٰ میں 'عشقش' کی جگہ 'عشقت' اور 'مدہوشی' کی جگہ 'بیہوشی' ملتا ہے۔
	۱۵۰	مآثرالامرا کے اصلی الفاظ ہیں "غرض امتحانِ محبّت بود، نہ تلخ کامیِ شما"۔
	۱۵۱	شفائیؔ کا شعر ہے (شعرالعجم، ۳ : ۱۰۷) شعرالعجم کے متن میں دوسرے مصرع میں 'آزار' کی جگہ 'بیداد' ہے اور یہ ہر لحاظ سے بہتر ہے۔
	۱۵۲	تمام ایڈیشنوں میں یہاں 'کے' ملتا ہے، لیکن یہ غالباً کاتب کی مہربانی ہے ؛ 'فرد' بمعنی فہرست، حساب وغیرہ مؤنث ہے۔
	۱۵۳	داراشکوہ، شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا ۱۹ صفر ۱۰۲۴ھ/ ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو پیدا ہوا۔ ویدانت اور ہندی فلسفے اور تصوّف سے بہت شغف تھا۔ اس کی متعدد کتابیں ملتی ہیں۔ جن میں سے سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، مکالماتِ بابالال، مجمع البحرین، سرّ اکبر زیادہ مشہور ہیں۔ وہ شاہجہان کے بعد جانشینی کے جھگڑے کا شکار رہا۔ اورنگ زیب نے اس کے خلاف علماء سے فتویٰ لیا، اور ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ/ ۱۰ ستمبر ۱۶۵۹ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ (داراشکوہ، انگریزی)

۲۷۸ | ۱۵۴ | مآثرالامرا، ۱ : ۷۹۱ میں جہاں یہ الفاظ ملتے ہیں، وہاں 'ایں' کی جگہ 'آں' ہے۔

۱۵۵ | کلیات فیضی : ۱۸۰

۱۵۶ | بکتاش بیگ اصفہانی کا شعر ہے (روزِ روشن : ۱۰۱) دونوں مصرعے مقدم و مؤخر ہوگئے ہیں۔

۲۷۹ | ۱۵۷ | یہ واقعہ خود عاقل خان کے حالات میں صاحبِ مآثرالامرا نے لکھا ہے (۲: ۸۲۳)

۱۵۸ | دیکھیے : مآثرالامرا، ۱ : ۷۹۰

زین آبادی، کا اصلی نام ہیرا بائی تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اورنگ زیب نے اسے اپنے خالو سے لینا چاہا، تو خان زمان نے کہا کہ اورنگ زیب اپنی حرم چتر بائی میرے حوالے کردے، میں ہیرا بائی اسے دیے دیتا ہوں؛ چنانچہ یہ تبادلہ ہوگیا۔ (احکامِ عالمگیری : ۷-۸)

۱۵۹ | اس واقعے کا ذکر اطالوی سیّاح منوچی نے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب اورنگ زیب نے گانے بجانے کی ممانعت کردی تو

"ایک جمعہ کے دن، جب اورنگ زیب مسجد کو جا رہا تھا، دلّی کے تقریباً ایک ہزار موسیقار جمع ہوئے۔ وہ بیس جنازے اٹھائے تھے، جنھیں خوب سجایا گیا تھا اور وہ ان کے ساتھ اونچے اونچے نوحہ خوانی کرتے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جب دُور سے مجمع دیکھا، اور اُن کا رونا دھونا سُنا، تو تعجب کیا اور دریافت کروایا کہ اس جزع فزع کا کیا باعث ہے۔ اس پر اُن لوگوں نے اور بھی زور شور سے رونا شروع کردیا کہ شاید بادشاہ کو کچھ رحم آجائے۔ پوچھنے پر موسیقاروں نے روتے بسُورتے جواب دیا کہ حضرت ظلِّ الٰہی نے موسیقی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے، ہم اُسے دفن کرنے جا رہے ہیں۔ جب حضرت بادشاہ سلامت نے یہ سنا تو نہایت سکون سے جواب دیا کہ ہاں، اس کی مغفرت کی دعا کرو؛ اور دیکھو، اسے خوب گہرا دفن کرنا۔ اس کے باوجود اُمرا،

چوری چھپے گانا سنتے تھے؛ اور یہ پابندی صرف بڑے شہروں تک محدود رہ گئی تھی۔" (سٹوریا ڈو موگر، ۲ : ۶ ؛ نیز منتخب اللباب، ۲ : ۲۱۲-۲۱۳ ؛ مآثر عالمگیری : ۸۱ - ۸۵؛ عالمگیر نامہ، ۳۵۴، ۳۹۱)

۱۶۰ پیوریٹن = یعنی "خالص پسند"۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے انگلستان کی اصلاحی تحریک ۔ دراصل عیسائیت کے پروٹسٹنٹ فرقے کا زیادہ بارسوخ اور پُرجوش طبقہ اس کا بانی اور روح رواں تھا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ملکہ الزبتھ کے عہد میں عیسائی مذہب کی جتنی اصلاح ہوئی، یہ کافی نہیں تھی؛ اسے مکمل کرنا چاہیے ۔ یہ گروہ دین و دنیا کے ہر شعبے میں انجیل اور عیسائیت کی تعلیم کے مطابق اصلاح اور تجدید کا حامی تھا ۔

۱۶۱ محمد فرخ سیر، اورنگ زیب کے بیٹے معظم شاہ عالم اول (بہادر شاہ اول) کا پوتا، خاندان مغلیہ کا پندرھواں بادشاہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۳ء سے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تک تخت پر متمکن رہا ۔

۱۶۲ محمد شاہ، فرخ سیر کا بھائی ۔ اسی خاندان کا اٹھارواں بادشاہ، اپنی عیش پسندی کے باعث رنگیلا کہلاتا ہے ۔ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء سے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء تک حکمران رہا۔ نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) اسی کے عہد میں ہوا تھا۔

۱۶۳ میر عبدالجلیل الحسنی الواسطی بلگرامی، فاضلِ اجل اور عالمِ شہیر، ۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ/ ۲ جون ۱۶۶۱ء کو سید احمد حسین واسطی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ تفسیر، حدیث، تاریخ، لغت، ادب، شعر ان تمام علوم میں مہارت کاملہ حاصل تھی ۔ عربی، فارسی، ترکی، ہندی چار زبانیں جانتے تھے۔ متعدد تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۷۲۵ء کو دلّی میں انتقال کیا ۔ لاش بلگرام گئی اور وہیں دفن ہوئے۔ (خزانۂ عامرہ : ۳۵۲ - ۳۶۱ ؛ مآثر الکرام، ۱ : ۲۵۷ - ۲۷۷؛ سبحۃ المرجان: ۷۹ - ۸۴ ؛ حدائق الحنفیہ : ۴۳۷ ؛ تذکرۂ بےنظیر : ۹۰ - ۹۵ ؛ نزہۃ الخواطر، ۶ : ۱۲۹ - ۱۴۰ ؛ تذکرۂ علمائے ہند : ۱۰۸ - ۱۰۹) مقبول احمد صمدنی نے حیاتِ جلیل

کے نام سے ان کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے۔

۱۶۴ — ان کی اس مثنوی کا اچھا طویل اقتباس اُن کے نواسے سید غلام علی آزاد نے اپنے تذکرے خزانۂ عامرہ (ص ۳۵۵ - ۳۵۹) میں دیا ہے؛ یہ صرف لباس کی صفت سے متعلق ہے۔ اسی سے اور تکلّفات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۸۰ — ۱۶۵ — آنند رام مخلص کے لیے دیکھیے، حاشیہ (۴)، دیباچہ۔

۱۶۶ — تورات میں حضرت داؤد سے متعلق یہ روایت نہیں ملی۔

۱۶۷ — عرفی کا مصرع ہے (کلیاتِ عرفی : ۲۱۶) مصرع اولیٰ ہے :

نوا را تلخ تر می زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی

۲۸۱ — ۱۶۸ — والہ داغستانی، علی قلی خان نام، حضرت عبّاسؓ (عمّ رسول کریم صلعم) کی اولاد سے صفر ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ نادر شاہی کے ڈر سے ہندُستان چلے آئے اور یہاں بتدریج ہفت ہزاری منصب تک پہنچے۔ ان کا اپنی بنتِ عم خدیجہ سلطان سے معاشقہ اور اس کا حسرتناک انجام سب تذکروں میں بیان ہوا ہے۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء میں دلّی میں فوت ہوئے۔ "ریاض الشعرا" تذکرہ انھیں کی تالیف ہے۔ (خزانۂ عامرہ : ۴۴۶ - ۴۵۰؛ نزہتہ الخواطر، ۶ : ۱۸۸)

۱۶۹ — قزلباش خان امید۔ اصلی نام میرزا محمد رضا تھا۔ طاہر وحید کے شاگرد تھے۔ جوانی میں بعہدِ عالمگیری ہمدان سے ہندُستان آئے۔ شاہ عالم اول کے دربار سے قزلباش خان خطاب ملا۔ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں دلّی میں انتقال ہوا۔ "جان داد قزلباش خان" تاریخ ہے (سروِ آزاد : ۲۰۹ - ۲۱۰)

۱۷۰ — میر معزّ فطرت موسوی۔ ان کا پورا نام میرزا معزّ الدّین محمد تھا۔ امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد میں، ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ - ۱۶۴۱ء قُم میں پیدا ہوئے۔ عالمگیر کے زمانے میں ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ - ۱۶۷۲ء میں واردِ ہند ہوئے۔ یہاں بہت عروج پایا۔ شاہ نواز خان صفوی کی صاحبزادی ان کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ پہلے عظیم آباد کے دیوان مقرر ہوئے۔ وہاں سے واپس آئے تو موسوی خان کے خطاب اور دیوانی تن

کے عہدے سے سرافراز ہوئے، اور اگلے ہی برس مجموع ملک دکن کے دیوان مقرر ہو گئے۔ دکن ہی میں ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹-۱۶۹۰ء میں رحلت کی۔ پہلے تخلص فطرت تھا، اسے بدل کر موسوی کر لیا۔ خان کا خطاب ملا، تو اسے موسوی پر اضافہ کیا اور اسی لیے موسوی خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ (سروِ آزاد: ۱۲۶-۱۲۷)

۱۷۱ مؤتمن الدولہ اسحٰق خان شوستری۔ ان کے والد شوستر سے ہندستان آئے تھے؛ خود یہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی نظم و نثر میں صاحبِ استعداد تھے۔ ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹-۱۷۴۰ء میں انتقال کیا۔ (خزانۂ عامرہ: ۱۲۲-۱۲۳)

۱۷۲ متن میں قاضی محمد خان چھپا تھا، یہ سہو ہے؛ ان کا ٹھیک نام قاضی محمد صادق خان اور تخلص اختر تھا۔ ہوگلی کے سربرآوردہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ متعدد علوم میں دستگاہ تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غازی الدین حیدر شاہِ اودھ نے انھیں خطاب ملک الشعرا عطا کیا تھا۔ ان کی متعدد تصانیف ملتی ہیں۔ ایک ضخیم تذکرۂ شعرا بھی 'آفتاب عالمتاب' کے نام سے لکھا تھا۔ نواب محمد صدیق حسن خان کے زمانۂ اقتدار میں جو تذکرے بھوپال سے شائع ہوئے، ان میں سے بیشتر اسی پر مبنی تھے۔ لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔ (شمع انجمن: ۶۳؛ روزِ روشن: ۳۷-۳۸)

۱۷۳ اس سلسلے میں میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرے سروِ آزاد (ص ۲۰۹) میں لکھتے ہیں:

"... خوش خلق، رنگین صحبت بود و موسیقیِ ہندی، با وصفِ ولایت زا بودن خوب می دانست و می گفت۔"

۱۷۴ شیخ علی حزیں۔ شیخ محمد علی اصفہانی، ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ/ ۶ جنوری ۱۶۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب شیخ زاہد گیلانی (مرشدِ شیخ صفی الدین اردبیلی) تک پہنچتا ہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ دیگر علوم میں بھی دستگاہِ کامل تھی، بلکہ شاعری ان کے لیے باعثِ فخر نہیں تھی۔ دَورِ نادرشاہی

میں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور منزل بمنزل دلّی آئے۔ یہاں انھوں نے اہلِ ہند کی ہجو کہی جس پر لوگ بہت برافروختہ ہوگئے۔ اس پر یہ آگرے اور پھر وہاں سے نقلِ مکان کر کے بنارس پہنچے۔ پہلے ارادہ بنگال جانے کا تھا، لیکن پٹنے سے بنارس واپس آگئے۔ یہیں ۱۱ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ/۱۷ اگست ۱۷۶۶ء کو انتقال ہوا۔ اپنی تعمیر کروائی ہوئی قبر واقع فاطمان میں دفن ہوئے۔ (خزانۂ عامرہ: ۱۹۳-۲۰۰؛ نزہتہ الخواطر، ۶: ۳۲۳-۳۲۵)

۱۷۵ تفضّل حسین خان علّامہ، سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ فاضلِ زمانہ تھے۔ عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی اور یونانی اور لاطینی بھی جانتے تھے۔ لکھنؤ میں بہت عروج پایا۔ نواب آصف الدولہ کے وکیل اور نواب سعادت علی خان کے اتالیق تھے۔ آصف الدولہ کے وکیل کی حیثیت سے کلکتہ میں مقیم رہے۔ کلکتہ ہی سے لکھنؤ واپس آرہے تھے کہ راستے میں مرشد آباد کے قریب ۱۵ شوال ۱۲۱۵ھ/یکم مارچ ۱۸۰۱ء کو انتقال ہوا۔ اب ان کے صرف علم ریاضی میں دو تین رسالے ملتے ہیں۔ (مفتاح التواریخ: ۳۷۱؛ نزہتہ الخواطر، ۷: ۱۰۹-۱۱۱؛ تذکرۂ علمائے ہند: ۳۶-۳۷؛ تاریخ اودھ، ۳: ۳۴۵-۳۴۹)

۱۷۶ شوستری سے سید عبداللطیف خان شوستری مراد ہیں۔ یہ دولتِ آصفیہ کے دیوان میر عالم (ف ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) کے چچیرے بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام سیّد ابی طالب تھا (جن کے بھائی سیّد رضی میر عالم کے والد تھے)۔ وہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۷۲ھ/۳ اگست ۱۷۵۹ء کو شوستر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایران و عراق کے علما سے پائی اور مختلف علوم میں استادانہ دستگاہ پیدا کی۔ شوال ۱۲۰۲ھ/جولائی ۱۷۸۸ء میں بصرہ سے بذریعہ جہاز روانہ ہوکر محرم ۱۲۰۳ھ/اکتوبر ۱۷۸۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ میر عالم ان سے پہلے ہندستان آچکے تھے اور حیدر آباد میں آصف جاہ ثانی نظام علی خان کے دربار میں انھیں بہت عروج حاصل ہوا تھا۔ اسی زمانے میں وہ نظام کے سفیر بن کر لارڈ کارنوالس کے پاس

کلکتہ آئے۔ یہیں ان کی ملاقات شوستری سے ہوئی اور انھوں نے اِنھیں اپنی جگہ حیدرآباد کا سفیر مقرر کروا دیا۔ کلکتہ سے واپسی پر میر عالمؔ کا ستارہ زوال میں آگیا۔ شوستری بھی بالآخر حیدرآباد آئے اور جب ریاست کے ابتر حالات دیکھے تو یہاں سے روانہ ہوکر پونہ میں مقیم ہوگئے۔ جب میر عالم بعہدِ سکندرجاہ دوبارہ منصبِ دیوانی پر فائز ہوئے، تو انھوں نے شوستری کو بھی حیدرآباد بلالیا۔ (ماخوذ از تحفۃ العالم)

ان کے اس کے بعد کے حالات دستیاب نہیں ہوسکے۔

۱۷۷ تحفۃ العالم۔ شوستری نے وسط جمادی الاول ۱۲۱۶ھ/ستمبر ۱۸۰۱ء میں مکمّل کی، جب وہ ہنوز حیدرآباد میں تھے۔ جب وہ دوسری مرتبہ یہاں آئے، تو اس کا تتمہ ذیل التحفہ کے عنوان سے قلم بند کیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں دارالطبع سرکارِ عالی حیدرآباد میں چھپی تھی؛ دوسری مرتبہ مطبع شوکت الاسلام، حیدرآباد میں چھپی۔

۱۷۸ دیکھیے، تحفۃ العالم: ۳۳۲ (طبع اول)؛ ص ۲۸۸ (طبع ثانی) شوستری کے الفاظ ہیں:

"نمازِ عشائین ادا [کرد] و بکنجے یکہ و تنہا کہ بجز کتب چیزے دیگر نزدیکِ اُو نبود، بمطالعہ و خوض در مسائلِ دقیقہ مشغول می شد تا طلوعِ صبحِ صادق؛ نمازِ صبح را کردے و بخوابگاہ رفتے و دو کس خوانندۂ خوش آواز نوکر داشت۔ ایشاں آمدہ باسہ تار و چہار تار برامشگری و زمزمہ مشغول می شدند، تا بخواب می رفت۔"

۱۷۹ بحرالعلوم سے مراد مولوی عبدالعلی ہیں، جو درسِ نظامیہ کے بانی ملّا نظام الدّین بن ملّا قطب الدّین سہالوی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ظاہر ہے کہ علم میں اپنے نامور خاندان کے فخر تھے۔ لکھنؤ میں ایک سال تعزیہ نکلنے پر کچھ فساد ہوگیا، تو شیعی حکومتِ وقت نے انھیں خارج البلد کر دیا۔ یہ حافظ رحمت خاں رئیسِ بریلی کے

پاس چلے گئے اور اُن کی زندگی بھر وہیں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد نواب فیض اللہ خان والیِ رامپور نے بلا لیا لیکن مشاہرے کی کمی کے باعث یہاں ان کا دل نہ لگا، اور یہ منشی صدرالدین کے بلاوے پر بوہار چلے گئے۔ یہاں بہت فراغت حاصل تھی لیکن منشی صدرالدین سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ جب ان حالات کی اطلاع نواب والاجاہ محمد علی کو ملی تو انھوں نے بڑے اعزاز و اکرام سے انھیں کرناٹک بلوایا۔ یہاں بہت آرام و آسایش سے بسر ہوئی۔ 'بحرالعلوم' خطاب بھی نواب والاجاہ ہی نے دیا تھا۔ ۸۳ برس کی عمر تھی، جب ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/ ۱۳ اگست ۱۸۱۰ء کو مدراس ہی میں انتقال ہوا۔ وہیں مسجدِ والاجاہی میں مزار ہے۔ (تذکرہ علمائے فرنگی محل: ۱۲۷-۱۴۱؛ تذکرہ علمائے ہند: ۱۲۲-۱۲۳؛ حدائق الحنفیہ: ۴۶۷؛ نزہتہ الخواطر، ۷: ۲۸۲-۲۸۷؛ مقالاتِ شبلی، ۳: ۱۱۶-۱۲۵)

۱۸۰ بحرالعلوم ملّا عبدالعلی کے حالات متعدد تذکروں میں ملتے ہیں، کہیں مجمل، کہیں مفصّل؛ لیکن کسی جگہ ان کے فنِ موسیقی میں رسوخ کا خاص طور پر ذکر دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ البتہ ٹھیک ہے کہ درسِ نظامی میں ریاضی پر خاص توجہ تھی؛ اور موسیقی بھی اسی کی شاخ ہے۔ شاید اس طرح سے بحرالعلوم نے موسیقی میں بھی کچھ درک حاصل کر لیا ہو۔

۱۸۱ اکبر، خاندانِ مغلیہ کا گلِ سرسبد، امرکوٹ کے مقام پر یکشنبہ ۵ رجب ۹۴۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو پیدا ہوا۔ اپنے والد ہمایوں کی وفات کے بعد بعمر ۱۴ سال بروزِ جمعہ ۲ ربیع الاول ۹۶۳ھ/ ۱۵ جنوری ۱۵۵۶ء کو تخت پر بیٹھا اور ۶۵ سال کی عمر میں ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ/ ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو آگرے میں فوت ہوا؛ سکندرہ میں مدفون ہے۔

۲۸۳ ۱۸۲ صفدر جنگ والیِ اودھ، اصلی نام میرزا مقیم عرف منصور علی۔ برہان الملک سعادت خان کا داماد اور جانشین ہوا۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۷۵۸ء کو

پا پر گھاٹ کے مقام پر انتقال ہوا۔ لاش چندے امانتاً گلاب باڑی فیض آباد میں دفن رہی اور وہاں سے خاص مقبرۂ صفدر جنگ، (شاہِ مرداں) دلّی میں لاکر سپردِ خاک کی گئی۔ (تاریخ اودھ، جلد سوم)

۱۸۳ واجد علی شاہ، آخری شاہِ اودھ، ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ/ ۱۸ اگست ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوئے اور اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ / ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ ان کے زمانے میں نظام سلطنت بالکل درہم برہم ہوگیا۔ انگریز بہت پہلے سے اودھ میں اپنے قدم خوب مضبوط کر چکے تھے۔ آخر انھوں نے فروری ۱۸۵۶ء میں انھیں معزول کر کے کلکتے بھیج دیا؛ اور اودھ کا سلطنت انگلشیہ کے ساتھ الحاق ہوگیا۔ واجد علی شاہ کا پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا، لیکن چونکہ عملہ فعلہ بہت بڑا تھا اور عادات مُسرفانہ تھیں، یہ رقم ان کے خرچ کو کفایت نہیں کرتی تھی۔ منجملہ اور دلچسپیوں کے شاعری سے بھی بہت لگاؤ تھا؛ اختر تخلص تھا اور اسیر اور برق سے مشورہ کرتے تھے۔ کلکتے ہی میں ۳ محرم ۱۳۰۵ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو انتقال ہوا۔ امام باڑہ سبطین آباد آخری آرامگاہ ہے۔ (تاریخ اودھ، جلد پنجم)

۱۸۴ علی نقی۔ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے وقت امین الدولہ وزیر اعظم اودھ تھے۔ واجد علی شاہ نے چندے انتظار کیا اور اس کے بعد انھیں الگ کر کے علی نقی خان کو وزارتِ اعلیٰ کا منصب عطا کر دیا۔ حالات جس طرح کے تھے، ان میں کوئی شخص بھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر وہی ہوا، جو ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ علی نقی خان کی انگریزوں سے ساز باز تھی اور واجد علی شاہ کی معزولی میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی ایک بیٹی واجد علی شاہ سے بیاہی تھی۔ (تاریخ اودھ، جلد پنجم)

۱۸۵ قرآن، سورۃ الاعراف ۷ : ۳۱۔ یعنی دیکھو، خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں، کس نے حرام کی ہیں؟

	۱۸۶	مومن دہلوی کا شعر ہے، (کلیاتِ مومن، ۱ : ۷۹) البتہ صحیح پہلا مصرع یوں ہے: مومن! آ کیشِ محبت میں کہ ہے سب جائز
	۱۸۷	کلیات بیدل، ۴ (عنصر اول) : ۲۷۔ مطبوعہ کلیات کے مصرعِ اولیٰ میں 'یک حرف' کی جگہ 'یک نقطہ' ہے۔

۱ — فہرستِ اعلام

[صفحے کے ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے]

فہرستِ اعلام

فہرستِ اعلام

۲- فہرست بلاد و اماکن

فہرست بلاد و اماکن

فہرست بلاد واماکن

فہرست بلاد واماکن

۳۔ فہرست آیات قرآنی واردۂ متن

فہرستِ آیاتِ قرآنی

۴ - فہرست کتب و اردو متن

فہرستِ کتبِ متن

فہرستِ کتبِ متن

۵ - فہرست مآخذ حواشی

آتشکدۂ آذر : لطف علی بیگ آذر — تہران، ۱۳۳۷ شمسی

آثار الصنادید : سرسید احمد خان — دلی، ۱۹۶۵ء

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی : مرتبہ عبد الرزاق ملیح آبادی — دلی، اپریل ۱۹۵۸ء

آفتاب داغ : نواب مرزا خان داغ — لکھنؤ، ۱۹۲۳ء

آئین اکبری : ابوالفضل (مرتبہ (سر) سیّد احمد خان) — دہلی، ۱۲۷۴ء

اتحاف النبلا : نواب محمد صدیق حسن خان

احکام عالمگیری : حمید الدین خان (مرتبہ جادو ناتھ سرکار) — کلکتہ، ۱۹۱۲ء

احیاء العلوم الدین : امام محمد بن محمد الطوسی الغزالی — قاہرہ، ۱۹۳۹ء

اخبار الاخیار : شیخ عبد الحق محدّث دہلوی — دہلی، ۱۳۳۲ھ

اخبار العلماء باخبار الحکماء : للقفطی — قاہرہ : ۱۳۲۶ھ

اذکار الابرار المشہور بہ تذکرۃ الاقطاب : حافظ نور الدین احمد — کلکتہ، ۱۳۲۸ھ

ارشاد الادیب = معجم الادباء

الاعلام : خیر الدین الزرکلی (طبع دوم) — قاہرہ، ۱۹۵۴ء بعد

الاغانی : ابوالفرج الاصفہانی (طبع دار الکتب المصریہ) — قاہرہ، ۱۳۴۵ھ بعد

الاصابہ : ابن حجر العسقلانی — مصر، ۱۹۳۹ء

فہرست مآخذ حواشی

امثال و حِکَم : علی اکبر دہخدا — تہران، ۱۳۳۸ھ شمسی ببعد
اورنگ زیب (انگریزی) : سر جادو ناتھ سرکار — کلکتہ، ۱۹۲۴ء

بادشاہ نامہ : عبدالحمید لاہوری (مرتبہ کبیرالدین احمد و عبدالرحیم) — کلکتہ، ۱۸۶۶ء ببعد
البدایہ والنہایہ : ابن کثیر — قاہرہ، ۱۳۴۸ھ ببعد
البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع : للشوکانی — قاہرہ، ۱۳۶۶ھ
بزم ایران : سید محمد رضا طباطبائی — لکھنؤ، ۱۹۲۴ء
بہترین اشعار : ح پژمان — طہران، ۱۳۱۳ شمسی

تاریخ آداب اللغۃ العربیہ : لجرجی زیدان — قاہرہ، ۱۹۱۳ ببعد
تاریخ اودھ : محمد نجم الغنی مطبع نول کشور — لکھنؤ، ۱۹۱۹ ببعد
تاریخ بغداد : خطیب بغدادی — قاہرہ، ۱۳۴۹ھ ببعد
تاریخ فرشتہ : محمد قاسم فرشتہ — بمبئی، دسمبر ۱۸۳۲ء / رجب ۱۲۴۷ھ
تحفۃ العالم : سید عبداللطیف شوستری — حیدرآباد، ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء
تذکرۃ الشعراء : دولت شاہ سمرقندی (سلسلۂ اوقاف گب) — لائیڈن، ۱۳۰۵ھ
تذکرۃ الاولیا : شیخ فریدالدین عطّار (سلسلۂ اوقاف گب) — لائیڈن، ۱۹۰۵ء
تذکرۃ الواصلین : محمد رضی الدین فرشوری بسمل (دوسری بار) — بدایوں، ۱۹۴۵ء
تذکرۂ بینظیر : سید عبدالوہاب افتخار (مرتبہ سیّد منظور علی) — الہ آباد، ۱۹۴۰ء
تذکرۂ عزیزیہ : قاضی بشیرالدین احمد میرٹھی — میرٹھ، ۱۹۳۴ء
تذکرۂ علمائے فرنگی محل : مولوی محمد عنایت اللہ انصاری فرنگی محل — لکھنؤ، ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء
تذکرہ علمائے ہند : رحمان علی — لکھنؤ، ۱۹۱۴ء
ترجمان القرآن (۱) : مولانا ابوالکلام آزاد (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن) — نئی دلّی، ۱۹۸۰ء
التمثیل والمحاضرہ : ثعالبی — قاہرہ، ۱۹۶۱ء

فہرست مآخذ حواشی

توارات (کتاب مقدس) — انگلستان، ۱۹۵۸ء

توزکِ جہانگیری: نورالدین جہانگیر پادشاہ (مرتبہ (سر) سید احمد (خان) — علی گڈھ، ۱۸۶۴ء

جمھرۃ اشعارالعرب: تالیف ابوبکر محمد بن ابی الخطاب القرشی — قاہرہ، ۱۳۰۸ھ

جمھرۃ الامثال: ابو ہلال العسکری — بمبئی، ۱۳۰۶ھ

جواہر سخن (۲): مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب — الٰہ آباد، ۱۹۳۵ء

چہار مقالہ: نظامی عروضی سمرقندی (مرتبہ ڈاکٹر محمد معین) — تہران، ۱۳۲۵ شمسی

حبیب السیر: اخوندمیر — تہران، ۱۳۳۳ شمسی

حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جیلمی ثم لاہوری — نولکشور — لکھنؤ، ۱۸۸۶ء/۱۳۰۳ھ

حلیۃ الاولیا: ابونعیم اصفہانی — قاہرہ، ۱۹۳۲ء

الحماسۃ: لابی تمام — بون، ۱۸۲۸ ببعد

الحماسۃ: للبحتری (مرتبہ لوئیس شیخو) — بیروت، ۱۹۱۰ء

الحماسۃ البصریہ: لصدرالدین علی البصری (مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد) دائرۃ المعارف — حیدرآباد، ۱۹۶۴ء

حیات جلیل: مقبول احمد صمدنی — الٰہ آباد، ۱۹۲۹ء

خریطۂ جواہر: مرتبہ مظہر جانجانان — مطبع مصطفائی، کانپور، ۱۲۷۱ھ

خزانۂ عامرہ: سید غلام علی آزاد بلگرامی — (نولکشور) کانپور، ۱۸۷۱ء

خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی العشر: للمحبی — قاہرہ، ۱۲۸۴ھ

خمخانۂ جاوید (۱): لالہ سری رام — لاہور، ۱۹۰۸ء

فہرست ماخذ حواشی

داراشکوہ (انگریزی) : ک، ر، قانونگو — کلکتہ، ۱۹۵۲ء

داستان نل و دمن : ابو الفیض فیضی — تہران، ۱۳۲۵ شمسی

الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی — دہلی، ۱۸۹۹ء

دربار اکبری : مولانا محمد حسین آزاد — لکھنؤ

دیوان ابی الطیب المتنبی : تحقیق عبدالوہاب عزام — قاہرہ، ۱۳۶۳ھ

دیوان ابی فراس الحمدانی — بیروت، ۱۹۵۹ء

دیوان ابن سناء الملک : تحقیق افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق — حیدرآباد، ۱۹۵۸ء

دیوان ابی نواس : تحقیق احمد عبدالمجید الغزالی — قاہرہ، ۱۹۵۳ء

دیوان کامل : امیر خسرو دہلوی (سعید نفیسی) — تہران، ۱۳۴۳ شمسی

دیوان اوس بن حجر : تحقیق ڈاکٹر محمد یوسف نجم — بیروت، ۱۹۶۰ء

دیوان بابا فغانی شیرازی : فغانی شیرازی — تہران، ۱۳۱۶ شمسی

دیوان بشار بن برد : تحقیق بدر الدین العلوی — بیروت، ۱۹۶۵ء

دیوان بیدل . بیدل عظیم آبادی — نولکشور، کانپور، ۱۳۰۳ھ

دیوان کامل جامی : ملا نور الدین جامی (مرتبہ ہاشم رضی) — تہران، ۱۳۴۱ شمسی

دیوان حالی : شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی — دلی، ۱۹۵۰ء

دیوان حسن سجزی دہلوی : امیر حسن علاء سجزی — حیدرآباد، ۱۳۵۲ھ

دیوان حکیم سنائی : مرتبہ مظاہر مصفا — تہران، ۱۳۳۶ شمسی

دیوان خاقانی : مرتبہ محمد عباسی — تہران، ۱۳۳۶ شمسی

دیوان خاقانی (۲ حصے) — نولکشور لکھنؤ، ۱۸۹۲ء

دیوان درد : خواجہ میر درد (مجلس ترقی ادب) — لاہور، ۱۹۶۲ء

دیوان ذوق : شیخ محمد ابراہیم ذوق (مرتبہ آزاد) — لاہور، ۱۹۳۲ء/۱۳۵۱ھ

دیوان ذوق : شیخ محمد ابراہیم ذوق (مرتبہ ویران) — دلی، ۱۲۷۹ھ

دیوان سلمان ساوجی (با مقدمہ دکتر تقی تفضلی) — تہران، ۱۳۳۶ شمسی

فہرست ماٰخذ حواشی

دیوان سعدی شیرازی (بکوشش مظاہر مصفی) تہران، ۱۳۴۰ شمسی

دیوان غالب (اردو) میرزا اسداللہ خان غالب (مرتبہ مالک رام) دلّی، ۱۹۵۷ء

دیوان غنی: مُلاّ محمد طاہر غنی کشمیری (مرتبۂ علی جواد زیدی) دلّی ۱۹۶۴ء

دیوان غنیمت: ملاّ محمد اکرم غنیمت کنجاہی (بتصحیح غلام ربانی عزیز) لاہور، ۱۹۵۸ء/۱۳۳۷ شمسی

دیوان فروغی بسطامی: بکوشش حسین نخعی تہران، ۱۳۳۶ شمسی

دیوان فیضی: ابوالفیض فیضی دلّی، ۱۲۶۸ھ

دیوان فیضی فیاضی: ابوالفیض فیضی لاہور

دیوان قاآنی: میرزا حبیب (مرتبۂ محمد جعفر محجوب) تہران، ۱۳۳۶ شمسی

دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی تہران، ۱۳۳۹ شمسی

دیوان کلیم کاشانی: ابوطالب کلیم (بتصحیح ومقدمہ پرتو ضیائی) تہران، ۱۳۳۶ شمسی

دیوان ملاّ نورالدین ظہوری نولکشور، لکھنئو، ۱۸۹۷ء

دیوان ناسخ: امام بخش ناسخ نولکشور، کانپور، ۱۸۸۶ء

دیوان نظیری نیشاپوری: محمد حسین نظیری (مرتبۂ مظاہر مصفّا) تہران، ۱۳۴۰ شمسی

دیوان وحشی بافقی: مولانا کمال الدین (مرتبۂ حسین نخعی) تہران، ۱۳۳۹ شمسی

رباعیات عمر خیام: مرتبۂ دکتور فریدرخ روزن چاپخانہ کاویانی برلین، ۱۳۰۴ شمسی

الرسالہ: امام ابوالقاسم القشیری قاہرہ، ۱۲۸۴ھ

روحِ انیس: مرتبۂ سید مسعود حسن رضوی ادیب انڈین پریس، الہ آباد

روزِ روشن (تذکرہ): مولوی محمد مظفر حسین صبا بھوپال، ۱۲۹۷ھ

ریاض العارفین: رضا قلی خان ہدایت تہران، ۱۳۴۴ شمسی

زبورِ عجم: اقبال لاہور، ۱۹۵۸ء

سبحۃ المرجان: میر غلام علی آزاد بلگرامی (طبع میرزا محمد شیرازی ملک الکتاب) بمبئی، ۱۳۰۳ھ

فہرست مآخذ حواشی

سٹوریا ڈوموگر (انگریزی) : نکولاو منوچی — کلکتہ، ۱۹۶۶ء

سروآزاد : میر غلام علی آزاد بلگرامی (مرتبۂ عبداللہ خاں و مولوی عبدالحق) حیدرآباد، ۱۹۱۳ء

سفینۂ خوشگو : بندرابن خوشگو (مرتبۂ شاہ عطاءالرحمٰن عطا کاکوی) پٹنہ، ۱۹۵۹ء

سفینۂ ہندی : بھگوان داس ہندی (مرتبۂ شاہ عطاءالرحمٰن عطا کاکوی) پٹنہ، ۱۹۵۸ء

سمط اللآلی (ا) : عبدالعزیز المیمنی — قاہرہ، ۱۹۳۶ء

سہ نثر ظہوری : مُلا نورالدین ظہوری — مطبع نظامی کانپور، ۱۲۷۱ھ

سیّدۃ الغناء العربی : ام کلثوم — قاہرہ

السیرۃ لابن ہشام : ابن ہشام — قاہرہ، ۱۳۵۶ھ

شاہنامہ : فردوسی (مرتبۂ محمد دبیر سیاقی) — تہران، ۱۳۳۵ شمسی

شاہنامہ : فردوسی (مرتبۂ سعید نفیسی) — طہران، ۱۳۱۴ھ

شرح التعرف لمذہب التصوف از ابوابراہیم اسماعیل — نولکشور لکھنؤ، ۱۹۱۲ء

شرح مقامات الحریری : الشریشی — قاہرہ، ۱۳۱۴ھ

شرح نہج البلاغہ : ابن میثم بحرینی — تہران، ۱۲۷۴ھ

شرح نہج البلاغہ : ابن ابی الحدید — تہران، ۱۲۷۱ھ

شروح سقط الزند : ابوالعلاء المعری — قاہرہ، ۱۹۴۷ بعد

شعر العجم : شبلی نعمانی — اعظم گڈھ، ۱۹۴۰ء بعد

الشعر والشعرا : ابن قتیبہ (تحقیق استاد احمد محمد شاکر) — قاہرہ، ۱۹۵۰ء

شمع انجمن (تذکرہ) : نواب محمد صدیق حسن خان — بھوپال، ۱۲۹۳ء

صحیح بخاری : امام بخاری — مطابع الشعب، قاہرہ، ۱۳۷۸ھ

صنم خانۂ عشق : امیر مینائی — امیر المطابع، حیدرآباد، ۱۳۲۹ھ

ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی : حالی — دہلی، ۱۳۳۲ھ

فہرست مآخذ حواشی

طبقات اکبری : نظام الدین احمد (ببلیو تھکا انڈکا) کلکتہ، ۱۹۱۳ بعد

الطبقات الکبریٰ : الشعرانی قاہرہ، ۱۲۷۶ھ

عالمگیرنامہ : محمد کاظم (مرتبہ خادم حسین و عبدالحی) کلکتہ، ۱۸۶۸ء

عجائب الآثار فی التراجم والاخبار : عبدالرحمٰن الجبرتی قاہرہ، ۱۳۲۲ھ

العقد الفرید : ابن عبد ربہ (تحقیق احمد امین) قاہرہ، ۱۹۴۸ء بعد

الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ : عبدالحی لکھنوی قاہرہ، ۱۳۲۴ھ

الفہرست : ابن ندیم لائپزگ، ۱۸۷۱ء

فیہ ما فیہ : جلال الدین رومی (مرتبہ بدیع الزمان فروزان فر) تہران، ۱۳۳۰ شمسی

قرآن کریم (طبع دار الکتب المصریہ) قاہرہ، ۱۳۵۲ھ

قران السعدین : امیر خسرو علی گڑھ، ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء

قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب : ابوطالب المکی قاہرہ

الکامل : للمبرّد (تحقیق ڈاکٹر زکی مبارک) قاہرہ، ۱۹۳۶ بعد

کتاب الحیوان : للجاحظ (تحقیق عبدالسلام محمد ہارون) قاہرہ، ۱۹۳۸ بعد

کتاب تاریخ اعلام الموسیقی الشرقیہ : عبدالمنعم عرفہ مطبع عثانی، قاہرہ، ۱۹۴۷ء

کشف الظنون : حاجی خلیفہ استانبول، ۱۹۵۴ء

کشف المحجوب : الہجویری (مرتبہ پروفیسر نکلسن) لاہور، ۱۹۲۱ء-لندن، ۱۹۳۶ء

کلام انشا : انشاء اللہ خان انشا (مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع) الہ آباد، ۱۹۵۲ء

کلام شاد : سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی جامعہ ملّیہ علی گڑھ، ۱۳۴۱ء

کلمات الشعرا (تذکرہ) : محمد افضل سرخوش (تصحیح صادق علی دلاوری) لاہور، ۱۹۴۲ء

فہرستِ مآخذِ حواشی

کلیات اکبر الٰہ آبادی — کراچی، ۱۹۵۱ء بعد

کلیاتِ آتش : حیدر علی آتش — نولکشور لکھنؤ، ۱۹۲۹ء

کلیات بیدل (۱، ۲، ۴): میرزا عبد القادر بیدل — کابل ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۴ شمسی

کلیات ٹینی سن (انگریزی) : لارڈ ٹینی سن — لندن، ۱۹۶۳ء

کلیات جامی : مُلّا نور الدین جامی — نولکشور لکھنؤ

کلیات حزیں : شیخ محمد علی حزیں — نولکشور لکھنؤ، ۱۸۷۶ء

کلیات سعدی : سعدی شیرازی (مرتبۂ مظاہر مصفّا) — تہران، ۱۳۴۰ شمسی

کلیات سودا : مرزا محمد رفیع سودا (مرتبۂ عبد الباری آسی) — نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء

کلیات شاد (مرتبۂ کلیم الدین احمد) — پٹنہ، ۱۹۷۵ء

کلیات شبلی (اُردو) : شبلی نعمانی — دار المصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۴۰ء

کلیات شبلی (فارسی) : شبلی نعمانی — دار المصنفین اعظم گڈھ

کلیات صائب تبریزی : صائب تبریزی (مرتبۂ امیری فیروز کوہی) — تہران، ۱۳۳۶ شمسی

کلیات عرفی شیرازی : عرفی شیرازی (ترتیب غلام حسین جواہری) — ایران

کلیات فیضی (مرتبۂ اے۔ ڈی۔ ارشد) — لاہور، ۱۹۶۷ء

کلیات غالب : اسد اللہ خان غالب دہلوی — نولکشور لکھنؤ، ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء

کلیات مومن (۲ حصہ) : حکیم مومن خان مومن دہلوی (مجلس ترقی ادب) — لاہور، ۱۹۶۴ء

کلیات میر : میر تقی میر دہلوی (مرتبۂ عبد الباری آسی الدنی) — نولکشور لکھنؤ، ۱۹۴۰ء

کلیات ناظم : نواب محمد یوسف علی خان ناظم رامپوری — مطبع حسنی رامپور، ۱۲۷۸ھ

کلیات نظیر اکبر آبادی : ولی محمد نظیر اکبر آبادی — نولکشور لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

کلیات نعت مولوی محمد محسن — الناظر پریس، لکھنؤ، ۱۳۲۴ھ

کلیات یغمائے جندقی : میرزا ابو الحسن یغما جندقی — تہران، ۱۳۳۹ شمسی

گلزار داغ : نواب مرزا خاں داغ دہلوی — مطبع انوار محمدی، لکھنؤ، ۱۲۹۲ھ

فہرست مآخذ حواشی

گلستانِ سخن : مرزا قادر بخش صابر — نولکشور ۱۲۷۱ھ

گلستان مسرت : عبد الرحمن شاکر — دہلی ، ۱۲۶۷ھ

گلشن بیخار : نواب مصطفیٰ خان شیفتہ — نولکشور لکھنؤ ، ۱۹۱۰ء

لسان المیزان : ابن حجر العسقلانی — حیدر آباد ، ۱۳۳۱ھ

مآثر الامرا : شاہنواز خان صفوی (مرتبہ اشرف علی و عبد الرحیم) — کلکتہ ، ۱۸۸۸ - ۱۸۹۱ء

مآثر الکرام : میر غلام علی آزاد بلگرامی (مرتبہ عبد اللہ خان) — آگرہ ، ۱۹۱۰ء/ ۱۳۲۸ھ

مآثر رحیمی : ملّا عبد الباقی نہاوندی (مرتبہ ہدایت حسین) — کلکتہ ، ۱۹۳۰ - ۱۹۳۱ء

مآثر عالمگیری : محمد ساقی مستعد خان (مرتبہ آغا احمد علی) — کلکتہ ، ۱۸۷۱ء

مجموعۂ حالات عزیزی : ظہیر الدین سید احمد ولی اللّٰہی — دہلی ، ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء

محاضرات الادبار : راغب اصفہانی — بیروت ، ۱۹۶۱ء

مرأۃ الغیب : امیر مینائی — نولکشور کانپور ، ۱۸۹۲ء

معجم الادبار : یاقوت الحموی (سلسلۂ اوقاف گب) — قاہرہ ، ۱۹۰۹ بعد

معجم البلدان : یاقوت الحموی — بیروت ، ۱۹۵۵ بعد

معجم المؤلفین : عمر رضا کحالہ — دمشق ، ۱۹۶۰ء

مفتاح التواریخ : طامس ولیم بیل — نولکشور کانپور ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء

مقالات شبلی (۳) شبلی نعمانی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) — اعظم گڈھ ، ۱۹۵۵ء

مکاتیب سنائی : حکیم سنائی (مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد) از انتشارات دانشگاہ اسلامی ، علی گڈھ ، رامپور ، ۱۹۶۲ء

منتخب التواریخ (۳ حصے) : ملّا عبد القادر بدایونی
(مرتبہ مولوی احمد علی و کپتان ولیم ناسولیس) — کلکتہ ، ۱۸۶۵ بعد

منتخب اللباب : محمد ہاشم خافی خان (مرتبہ کبیر الدین احمد) — کلکتہ ، ۱۸۶۹ بعد

فہرست ماٰخذ حواشی

منتخب اللطائف (تذکرہ قلمی) : مولوی رحم علی خان — تالیف، ۱۲۲۶ھ

منطق الطیر: شیخ فریدالدین عطّار (مرتبہ دکتر محمد جواد) — تبریز، ۱۹۵۸ء

المنتظم فی تاریخ الملوک والامم : ابن الجوزی (دائرۃ المعارف) — حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ بعد

مولانا ابوالکلام آزاد (انگریزی) مرتبہ ہمایوں کبیر — ایشیا، بمبئی، ۱۹۵۹ء

میخانۂ الہام (مجموعۂ غزلیات شاد) : مرتبہ حمید عظیم آبادی — پٹنہ، ۱۹۳۸ء

النجوم الزاہرہ : ابن تغری بردی (دارالکتب المصریہ) — قاہرہ، ۱۹۲۹ء

نزہۃ الخواطر (۴ تا ۷) : مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی — حیدرآباد، ۱۹۵۵-۱۹۵۹ء

نظامِ اوّل (انگریزی): ڈاکٹر یوسف حسین خان — کلکتہ، ۱۹۶۳ء

نفحات الانس : ملّا نورالدین جامی — کلکتہ، ۱۸۵۸ء

نگارستان سخن : سید نورالحسن — بھوپال، ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۵ء

نہایۃ الارب : النویری — قاہرہ، ۱۹۲۳ بعد

وفیات الاعیان (۱) : ابن خلکان (مرتبہ محی الدین عبدالحمید) — قاہرہ، ۱۹۴۸ بعد

یادگار داغ : نواب مرزا خان داغ (مرتبہ احسن مارہروی) — لاہور، ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ

یدِ بیضا (تذکرہ قلمی) : میر غلام علی آزاد بلگرامی (ذخیرۂ احسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

رسائل وجرائد

دبدبۂ سکندری، رامپور جلد ۴۴ شمارہ ۲۹ — معارف اعظم گڑھ جلد ۵۷ شمارہ ۶؛ جلد ۶۶ شمارہ ۱ — ہماری زبان (ہفتہ وار) علی گڑھ، یکم جولائی ۱۹۶۶ء

متعدد انگریزی اور مشرقی شخصیتوں کے تراجم کے لیے انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا، امریکی مصنفین کی قاموس، انسائیکلوپیڈیا اسلام (طبع اول و دوم) وغیرہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، اگرچہ اختصار کی غرض سے ہر جگہ حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔